اردو کا کلاسیکی ادب
کلیاتِ آتش
جلد دوم
از
خواجہ حیدر علی آتش
مرتبہ
سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی
مجلسِ ترقیٔ ادب ۰ لاہور

کلیاتِ آتش جلد دوم

طبع اول : جون ۱۹۷۵ء

تعداد : ۱۱۰۰

ناشر : احمد ندیم قاسمی
ناظمِ مجلسِ ترقیٔ ادب ، لاہور

طابع : سید ظفرالحسن رضوی

مطبع : ظفر سنز پرنٹرز ، ۹ - کوپر روڈ ، لاہور

سرورق وغیرہ : مطبعِ عالیہ ، ۱۲۰ ٹمپل روڈ ، لاہور

قیمت : [illegible] روپے

بعونِ صناعِ مکین و مکان و بفضلِ خلاقِ زمین و زمان
۱۳۲
اردو کا کلاسیکی ادب
کلیاتِ آتش
مرتبہ
سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی
ناشر
مجلسِ ترقیِ ادب
۲۔ نرسنگھ داس گارڈن
کلب روڈ
لاہور

فہرست

نمبر شمار	غزل	صفحہ

نمبر شمار | غزل | صفحہ

ردیف ہائے ہوز

ردیف یائے تحتانی

نمبر شمار	غزل	صفحہ

نمبر شمار	غزل	صفحہ
۱۰۱	ظاہر ہوا ہمیں یہ تمھارے حجاب سے - - - -	۲۲۲
۱۰۲	کوئی اچھا نہیں ہوتا ہے بُری چالوں سے - - -	۲۲۴
۱۰۳	اتار، اتارنا ساقی جو شیشہ طاق سے ہے - - - -	۲۲۵
۱۰۴	خواہاں ترے ہر رنگ میں اے یار ہمیں تھے -	۲۲۶
۱۰۵	گنگ ایماے لبِ یار سے گویا ہووے - - -	۲۲۸
۱۰۶	سر کاٹ کے کر دیجیے قاتل کے حوالے - - - -	۲۲۹
۱۰۷	آبلے پاؤں کے کیا تو نے ہمارے توڑے - - -	۲۳۰
۱۰۸	پاتا ہوں مہر و مہ کو تہی عدل و داد سے - -	۲۳۱
۱۰۹	یہ کس رشکِ مسیحا کا مکاں ہے - - - - - -	۲۳۲
۱۱۰	آتشِ نالہ بلبل سے دھواں ہوتا ہے - - - - -	۲۳۴
۱۱۱	خدا محفوظ رکھے دل کو اس افعیِ کاکل سے -	۲۳۶
۱۱۲	بالاے بامِ خانہ وہ عالی جناب ہے - - - - - -	۲۳۷
۱۱۳	تنگ دنیا کی خرابی میں ہوں نازک خو سے - -	۲۳۹
۱۱۴	شہرۂ آفاق مجھ سا کون سا دیوانہ ہے - - - - -	۲۴۰
۱۱۵	سائل نجات کا ہوں خداے کریم سے - - - -	۲۴۲
۱۱۶	آج تک واقف نہیں کوئی ہمارے حال سے - -	۲۴۴
۱۱۷	خرامِ ناز میں شمشیرِ برّاں کی روانی ہے - - -	۲۴۵
۱۱۸	بہارِ باغ ایماے شرابِ ارغوانی ہے - - - -	۲۴۷
۱۱۹	کہاں تک آنکھوں میں سرخی شراب خواری سے	۲۴۸
۱۲۰	عاشقِ جانباز کی گردن پر احساں کیجیے - - -	۲۴۹
۱۲۱	پیری سے مرا نوعِ دگر حال ہوا ہے - - -	۲۵۱
۱۲۲	یہ کماں داری ہے دم تک عاشقِ دلگیر کے -	۲۵۲
۱۲۳	تیغِ ابرو نہیں دی جانے کی اے دل! خالی - - -	۲۵۳

نمبر شمار	غزل	صفحہ

نمبر شمار	غزل	صفحہ

عنوان	صفحہ

* * *

ردیف واؤ

۱

[1]فکر میں مضمونِ عالی کی جو دل آمادہ ہو
دست بستہ بام پر ہر سرو قد استادہ ہو
پھر بھی وقتِ فکر ہم باندھیں حنائے دستِ یار
لاکھ یہ مضمونِ رنگیں پیش پا اُفتادہ ہو
عشق پیدا کر کسی مستانہ آنکھوں کا دلا
خانۂ تاریک میں روشن چراغِ بادہ ہو
آستانِ دیر تک جاوے تو اے کعبہ نشیں!
پردۂ بابِ صنم خانہ ترا سجّادہ ہو
عشق ہونے میں نہیں ادنیٰ و اعلیٰ کی تمیز
خوبصورت ہو، گدا زادہ ہو یا شہزادہ ہو
آشنا چشمِ سخنداں سے رہے میرا کلام
منزلِ مقصود کی ہر سطرِ دیواں جادہ ہو
سبز پیراہن میں رنگِ سرخ یوں ہے یار کا
جیسے مینائے زمرّد گوں میں گلگوں بادہ ہو
حسن کے آغاز کا انجام ہو یارب بخیر
نقشِ حب کا خطِّ نورس سے وہ روئے سادہ ہو

---

۱ - کلیات (دیوان اول) طبع علی بخش ص ۱۳۳ ، نول کشور قدیم ص ۲۳ ، جدید ص ۱۹۴ -

خشت رکھ کر زیرِ سر سونا ہے خاکِ گور پر
صاحبِ مسند ہو تو ، یا صاحبِ سجّادہ ہو

خار پیدا ہوں نہ جس جا ، گل شگفتہ ہوں وہیں
آسماں اُس کو بنادوں ، جو زمیں افتادہ ہو

فرشِ سبزہ پر لبِ جُو مجھ کو پینی ہے شراب
خیمۂ ابرِ سیہ ، اے آسماں ! استادہ ہو

بے ادب وادی میں اپنے پاؤں رکھ سکتے نہیں
خارِ رہ نقشِ قلم ہو ، مارِ رہزن جادہ ہو

چھین کر شمشیر قاتل سے رگڑتا ہوں گلو
جان سے اپنی نہ تنگ اتنا کوئی دل دادہ ہو

روسیہ دشمن عبث کرتا ہے میری پیروی
بندۂ زنگی بناوٹ سے نہ صاحب‌زادہ ہو

پاؤں رکھتا ہے جو آتش کوچۂ جلّاد میں
زندگی سے ہاتھ دھو کر مرگ کا آمادہ ہو

۲

[1]برنگِ آئنہ یاں رہ نہیں عشقِ مجازی کو
صفائے قلب نے حاصل کیا ہے پاک بازی کو

ہماری خاک کو اے شہ سوارو عرش دکھلایا
خدا ہمّت زیادہ دے تمھاری ترک تازی کو

مآلِ کار ہے دعوائے باطل کا پشیمانی
خدا سے اے بتو سیکھو طریقِ کارسازی کو

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۳۳ ، نول کشور قدیم ص ۱۲۳ ، جدید ص ۱۹۵ -

جلا کرتی ہے گھل گھل کر ہمیشہ شمعِ کافوری
یہ کس گورے بدن کی اُس نے دیکھا ہے گدازی کو
نہیں غم تیغِ ابروے صنم سے قتل ہونے کا
شہادت بھی بمنزل فتح کے ہے مردِ غازی کو
فزوں کعبے سے بھی سجدہ طلب محرابِ آبرو ہے
جھکانی پڑتی ہے گردن نمازی بے نمازی کو
بتوں نے کج ادائی کی تو کی شکوہ نہیں اُس کا
خدا بھی کام فرماتا ہے ہم سے بے نیازی کو
خیالِ زلفِ مشکیں روح کو قالب میں آفت ہے
مکانِ تنگ میں کوڑا غضب ہے اسپِ تازی کو
دلادیں یاد خورشیدِ قیامت کو وہ رخسارے
بھلادے زلفِ شب گوں روزِ محشر کی درازی کو
کفن خلعت ہے ، میں دولھا ، جنازہ تختِ دامادی
براتی نوحہ گر ہمراہ ہیں شہنا نوازی کو
زباں کو بند کر آتش بس اب اس یاوہ گوئی سے
گوارہ کیجیے تا کے تری بے امتیازی کو

۳

سرمہ منظورِ نظر ٹھہرا ہے چشمِ یار کو
نیل گوں گنڈا پنھایا مردمِ بیمار کو
حال پر میرے توجہ کیا ہو چشمِ یار کو
جبر تکلیفِ نگہ ہے مردمِ بیمار کو

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۳۴ ، نول کشور قدیم ص ۱۲۳ ،
جدید ص ۱۹۵ -

حسن بے پردہ کا عالم جلوہ گر پاتا ہوں میں
دم پھڑک جاتا ہے عریاں دیکھ کر تلوار کو

زلف کو دیکھے ، اگر دیکھا نہ ہو ابر سیہ
برق دیکھی ہو نہ جس نے دیکھے اس رخسار کو

مطّلع ہو کچھ تو حال زار سے وہ بے وفا
زعفراں سے لکھ کے خط بھیجا ہے میں نے یار کو

روے روشن سے مشابہ ہے نہایت آفتاب
دھوپ میں بٹھلائے گا مجھ تشنۂ دیدار کو

میری آہوں کے دھنویں نے گھر بنایا خانہ باغ
نرگس شہلا کیا ہر روزن دیوار کو

رات بھر آنکھوں کو اس امید پر رکھتا ہوں بند
خواب میں شاید کہ دیکھوں طالع بیدار کو

بھول جاوے عالم اپنی چال کا طاؤس مست
نشۂ مے میں اگر دیکھے تری رفتار کو

غنچۂ گل کو یہ نسبت ہے دہان تنگ سے
جس طرح تشبیہ غنچے کی دہن سے غار کو

وصف قامت میں ہر اک مصرع ہے دوپہلو کا شرط
سرو بھی کہتے ہیں ، بوٹا بھی قد دلدار کو

صبر کو کھو کر نہ ہوگا تو بھی اے دل باغ باغ
پھولتے پھلتے نہیں دیکھا غریب آزار کو

لکھ کے خط حسرت میں قاصد کے لہو رویا یہ میں
کر دیا چشم کبوتر روزن دیوار کو

بوٹیاں اپنے کف پا کی جو صحرا میں اڑیں
رتبۂ سیخ کباب آتش ملا ہر خار کو

۴

ا نالۂ جاں سوز نے پھونکا دل بےتاب کو
عشق کی آتش نے کشتہ ہے کیا سیماب کو

ہجر پیغامِ اجل ہے عاشقِ بےتاب کو
زندہ دیکھا ہی نہیں ہے ماہیِ بےآب کو

عالمِ حسنِ جوانی قدرتِ اللہ ہے
چودھویں شب کوئی دیکھے صورتِ مہتاب کو

سبزۂ خط نے کیا پژمردہ دل کو بے قرار
زندہ کرتی ہے یہ بوٹی کشتۂ سیماب کو

نیم جانوں کے تڑپنے نے بڑا دھوکا دیا
کوچۂ قاتل میں سمجھا مسلخِ قصّاب کو

جاں کھوئی حسرتِ آبِ دمِ شمشیر میں
طے کیا ہمّت نے میری منزلِ بے آب کو

ہجر کی شب کی مصیبت کس طرح تحریر ہو
جمع کر سکتا نہیں کوئی پریشاں خواب کو

تشنۂ خونِ دلِ بےتاب ہیں چشمانِ تر
بیشتر مرطوب خلقت کھاتے ہیں سیماب کو

گور پر بھی آسماں اس گل کو لائے گا نہیں
خون بہا دیتے کبھی دیکھا نہیں قصّاب کو

۱۔ کلیات طبع علی بخش ص ۱۳۴ ، نول کشور قدیم ص ۱۲۳ ، جدید ص ۱۹۶ ، بہارستان سخن ص ۱۷۳ ، لیکن بجائے ''نالۂ جانسوز'' کے ''عاشقِ جاں سوز'' لکھا ہے۔

پہن کر پوشاک سرخ آیا جو تو بالائے بام
راہ رو سمجھے شفق میں مہرِ عالم تاب کو
پست فطرت کو ہمیشہ سربلندوں سے ہے لاگ
زلزلہ ڈھاتا ہے دیوار و در و محراب کو
امن میں رکھتی ہے جورِ چرخ سے وارفتگی
منزلِ رہزن میں اندیشہ نہیں سیلاب کو
کیا نفاق انگیز ہم‌جنساں ہوائے دہر ہے
نیند اڑ جاتی ہے سننے سے نفیرِ خواب کو
روز و شب رویا میں آتش رفتگاں کی یاد میں
عمر بھر آنکھیں نہ بھولیں صورتِ احباب کو

۵

[1]دوست ہی جب دشمنِ جاں ہو تو کیا معلوم ہو
آدمی کو کس طرح اپنی قضا معلوم ہو
پھر گیا ہے اس قدر رنگ زمانہ ، چاہیے
آئنے میں بھی نہ صورت آشنا معلوم ہو
آنکھ پاتے ہی خیالِ یار نے کی دل میں راہ
مل ہی رہتا ہے مکاں جس کا پتا معلوم ہو
عاشقوں سے پوچھیے خوبی لبِ جاں‌بخش کی
جوہری کو قدرِ لعلِ بے بہا معلوم ہو

۱- کلیات طبع علی بخش ص ۱۳۴ ، نول کشور قدیم ص ۱۲۴ ، جدید ص ۱۹۷ -

خطِ توأم میں لکھا ہے یار کو مکتوبِ شوق
آرزوے وصل کا تا مدّعا معلوم ہو
کانپتا ہے آہ سے میری رقیبِ رُو سیاہ
اژدہا فرعون کو موسیٰ[۴] کا عصا معلوم ہو
اس لیے مارا اُن آنکھوں نے مجھے، تا خلد میں
چشمِ حورانِ بہشتی سے دغا معلوم ہو
دام میں لایا ہے آتش سبزۂ خطِ بتاں
سچ ہے کیا انساں کو قسمت کا لکھا معلوم

٦

[۱]بیدِ مجنوں دُور سے خم ہو گیا تسلیم کو
ہر بگولا سرو قد اُٹھا مری تعظیم کو
کون کہتا ہے الف بُوٹا سے قد کو یار کے
لام کو زلفوں سے کیا نسبت، دہن سے میم کو
گورے گالوں پر ترے زیبا ہے خالِ عنبریں
تھا یہی مہنا سزاوار ایسے لوحِ سیم کو
شانۂ گیسوے جاناں میں صفا حاصل ہوئی
آئنہ حاضر ہے ناز و غمزہ کی تعلیم کو
مہرباں ہو دوست، کچھ دشمن کا چل سکتا نہیں
آتشِ نمرود ہے گلزار، ابراہیم[۴] کو
خواب و بیداری یہ مرگ وزیست ہے اے بےخبر!
لوحِ دل پر سے مٹا نقشِ امید و بیم کو

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۳۵ ، نول کشور قدیم ص ۱۲۳ ، جدید ص ۱۹۷ -

ہمتِ مردانہ نے آتش کیا ہے بے نیاز
جانتا ہوں میں گدا سلطانِ ہفت اقلیم کو

۷

[1]شفا مریضِ محبّت کو زینہار نہ ہو
برنگِ شمع نہ ہوں ہم اگر بخار نہ ہو
کمال شہرۂ حسنِ حبیب سنتا ہوں
ڈھلا ہوا کوئی مضمونِ آبدار نہ ہو
ہوا تو پھر اسے جاتے ہوئے نہیں دیکھا
غبارِ چشم دلِ یار کا غبار نہ ہو
درِ حرم کو ہے تشبیہ طاقِ ابرو سے
سوادِ کعبۂ مقصود زلفِ یار نہ ہو
فقیر کو نہیں درکار طاق کسریٰ کا
بلند نقشِ قدم سے مرا مزار نہ ہو
پیادہ پا ہوں پر اڑتا ہوں باؤ کے مانند
ہلاک نقشِ قدم سے مرے سوار نہ ہو
صنم پرستی کو زاہد روا رکھے نہ رکھے
گلہ نہیں ہے جو صوفی شراب خوار نہ ہو
کبھی کبھی جو دکھا آئے روے رنگیں تو
خزاں میں مرغِ چمن کو غمِ بہار نہ ہو
فراقِ یار میں احوال کیا کہوں اپنا
دلِ دونیم نہ ہو، جانِ بے قرار نہ ہو

۱- کلیات طبع علی بخش ص ۱۳۵ ، نول کشور قدیم ص ۱۲۴ ، جدید ص ۱۹۷ -

کہاں موت کا مشتاق ہے دلِ بیمار
خزاں کا باغ میں نرگس کا انتظار نہ ہو

بہت اسے دلِ ہمت بلند کھاتا[1] ہے
غمِ فراق کہیں شیر کا شکار نہ ہو

برنگِ سایہ گزر شاہراہِ ہستی سے
کسی کے دوش کا آتش جنازہ بار نہ ہو

۸

[2]دھیان اس کاکلِ مشکیں کا جو آیا مجھ کو
خواب میں آ کے سیاہی نے دبایا مجھ کو

نہ سنا تھا سو وہ کانوں نے سنایا مجھ کو
جو نہ دیکھا تھا اِن آنکھوں نے دکھایا مجھ کو

شکر صد شکر تعلّق نہ ہوا دل کو کہیں
یار و اغیار کے جھگڑے سے چھڑایا مجھ کو

واشدِ دل کے لیے باغ میں آ نکلا تھا
یار بن غنچوں نے ہنس ہنس کے رلایا مجھ کو

طور پر حضرتِ موسیٰؑ نے تجلّی دیکھی
بام پر یار نے دیدار دکھایا مجھ کو

اس پری رو کے جو گیسو کا ہوا سودائی
میں نے جانا کہ یہ دل پیچ میں لایا مجھ کو

---

۱ - کلیات نول کشور میں "بلند رکھتا ہے" تحریر ہے -
۲ - کلیات طبع علی بخش، ص ۱۳۵ ، نول کشور قدیم ص ۱۲۵ ، جدید ص ۱۹۸ ، بہارستان سخن ص ۱۵۵ -

جان بھی نکلی دمِ نزع تو آسانی سے
کارِ مشکل کوئی درپیش نہ آیا مجھ کو

فکرِ اشعار میں کاٹی شبِ تاریکِ فراق
رات بھر صبح کے مضمون نے جگایا مجھ کو

بعدِ مردن بھی دکھاوے گی شجاعت جوہر
شیر مارے گا جو روباہ نے کھایا مجھ کو

جوشِ وحشت میں جو اُکتا کے کبھی اُٹھ بھاگا
سیکڑوں کوس غزالوں نے نہ پایا مجھ کو

شام سے پہلوے خالی نے اِک آفت ڈھائی
صبح تک طالعِ خفتہ نے جگایا مجھ کو

حشر کے روز میں اِتنا تو کہوں گا آتش
اِن پری رویوں نے دیوانہ بنایا مجھ کو

۹

[1]چاند کہنا ہے غلط یار کے رُخساروں کو
نسبتِ ذرۂ خورشید نہیں تاروں کو

اے صنم! ہووے نہ خورشیدِ قیامت طالع
دھوپ میں تو نہ بٹھا اپنے گنہگاروں کو

حسنِ یوسف کو ترے حسن سے نسبت کیا ہے
پھونک دے گرمیِ بازار خریداروں کو

داغ چیچک کے ترے چاند سے منہ پر دیکھے
پہلوے ماہ میں دیکھا جو نہ ہو تاروں کو

۱- کلیات طبع علی بخش ص ۱۳۶ ، نول کشور قدیم ص ۱۲۵ ،
جدید ص ۱۹۹ ، بہارستان سخن ص ۱۵٦ -

ہوں وہ مردودِ خلائق کہ یقیں ہے پسِ مرگ
سہو ہو فاتحۂ خیر مرے یاروں کو

اے بتو! دل میں تمھارے جو اثر ہو تو نہ ہو
زلزلے آئے ہیں اِن نالوں سے کہساروں کو

یارِ بن مجھ کو چمن ہو گیا آتش خانہ
برگِ گل سے نہ رہا مرتبہ انگاروں کو

عیدِ قرباں ہے ، ہزاروں ہی گلے کٹتے ہیں
تو بھی آزاد کر اب اپنے گرفتاروں کو

اے اجل جسم سے چھٹ بھی چکے جانِ شیریں
زندگی تلخ ہوئی ہے مرے غمخواروں کو

اپنی بیماری کی حالت کو وہ صحت سمجھے
دیکھے نرگس جو تری چشم کے بیماروں کو

منہ نہیں پھرنے کا قاتل کی طرف سے میرا
چہرے پر کھاؤں گا میں یار کی تلواروں کو

جان گھبراتی ہے سینے میں تو دل کہتا ہے
توڑے قلعۂ فولاد کی دیواروں کو

کوئی اِنساں سے سوا سخت نہ پایا ہم نے
موت آئی نہ شبِ ہجر کے بیداروں کو

اپنے ہاتھوں سے کیا جب مجھے بیدرد نے قتل
غیر تو مر ہی گئے ، داغ رہا یاروں کو

جا کے اِس باغ سے کیا یاد کریں گے **آتش**
چشمِ تر ہم کو ملی ، خشک زباں خاروں کو

۱۰

چشمِ بیمار کا یا رب کوئی بیمار نہ ہو[1]
زُلف کے پھندے میں دُشمن بھی گرفتار نہ ہو
حسن تکلیفِ لبِ بام اُسے دیتا[2] ہے
شرم سمجھاتی ہے سایہ پسِ دیوار نہ ہو
برہمن آنکھوں کو ملتا ہے جو پائے بت پر
رشک آتا ہے مجھے سنگِ درِ یار نہ ہو
ٹھوکریں کھائیں گے دل ، جانیں نکل جاویں گی
یار کی چال ہے ، یہ کبک کی رفتار نہ ہو
غیر سے یار سوا تشنۂ خوں ہے میرا
دُشمن و دوست کی آنکھوں میں کوئی خار نہ ہو
متّصل نالوں کی آواز چلی آتی ہے
جسمِ خاکی قفسِ مُرغِ گرفتار نہ ہو
کر دیا ہے یہ حوادث نے دلِ عالم سرد
آتشِ حُسن سے بھی گرمیِ بازار نہ ہو
نام سنتا ہوں جو میں گور کی اندھیاری کا
دل دھڑکتا ہے جدائی کی شبِ تار نہ ہو
گور میں ساتھ لیے جائیں گے اپنے ہم اُسے
نہیں ہوتا جو کوئی دل کا خریدار ، نہ ہو
بے طرح جوش میں سیلابِ سرشک آیا ہے
چار دیوارِ عناصر کہیں مسمار نہ ہو

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۳٦ ، نول کشور قدیم ص ۱۲۵ ، جدید ص ۱۹۹ ، بہارستان سخن ص ۱۵۸ -
۲ - نول کشور جدید : ''اسے کرتا ہے''

چمنِ دہر میں وہ سبزۂ خوابیدہ ہوں
باغِ جنّت کی ہوا سے بھی جو بیدار نہ ہو
باغباں خاطرِ بلبل نہ شکستہ ہووے
دل بیمار ہے یہ نرگسِ بیمار نہ ہو
ترکِ اُلفت کا ارادہ نہ کر آتش زنہار
دل سے بیزار تو ہے، جان سے بیزار نہ ہو

۱۱

سروِ بستاں تجھ سے گو اے بادِ صرصر خشک ہو[۱]
غیر ممکن ہے ہمارا مصرعِ تر خشک ہو
خون ہوا جاتا ہے دل، کیا دیدۂ تر خشک ہو
روز ٹانکے ٹوٹتے ہیں، زخم کیوں کر خشک ہو
ٹھنڈی سانسوں میں اثر ہے یاں ہوائے برف کا
سرد ہوں آتش کدے، خونِ سمندر خشک ہو
بھیک سے بدتر دعا بھی مانگنا اِنساں کو ہے
ہاتھ آئے بےطلب نانِ جویں گر خشک ہو
باغِ ویراں میں جو روؤں یادِ قدِ یار میں
سبز ہو جاوے جو برسوں کا صنوبر خشک ہو
اس قدر کاہیدہ ہوں پس جائے زیرِ آبلہ
سوکھ کر کانٹا اگر میرے برابر خشک ہو
تند خو پہنچا سکیں عالی‌دماغوں کو نہ رنج
ارغوان زارِ [illegible] صرصر سے کیوں کر خشک ہو

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۳۷، نول کشور قدیم ص ۱۲۶، جدید ص ۲۰۰، بہارستان سخن ص ۱۵۲ -

داخلِ فردوس ہو آتش نفس مجھ سا اگر
گلشنِ جنّت خزاں ہو ، حوض کوثر خشک ہو

چشمۂ حیواں دہن ہے ، تو ذقن چاہِ عمیق
کس طرح سے سبزۂ رخسارِ دلبر خشک ہو

سوزِ غم سے کیا کہوں ، میں حالِ دل اے ہم نشیں !
آگ لگ جائے جو اِک دم دیدۂ تر خشک ہو

کس توقع پر بھلا اِس مے کدے میں ہم رہیں
لب نہ تر ہوویں اگر سارا سمندر خشک ہو

چار دن میں اُس نے سارا باغ ویراں کر دیا
یا الٰہی دستِ گل چینِ ستم گر خشک ہو

وہ شجر ہوں میں جو تابستان میں جلنے سے بچے
موسمِ سرما میں پانی سے مقرّر خشک ہو

حسرتِ آبِ بقا کا نقش دل پر سے مٹا
گور میں ایسا نہ ہو حلق اے سکندر خشک ہو

میری قسمت سے جو ہو انگور پیدا تاک میں
آب اُس میں اُس کا مثلِ آبِ گوہر خشک ہو

غیرِ خالق کون کرتا ہے کسی کی پرورش
دایہ پیدا ہو جو آتش شیرِ مادر خشک ہو

۱۲

[۱]مجھ سراپا داغ کا کیا گو گلستاں سبز ہو
یہ خیالِ خام ہے سروِ چراغاں سبز ہو

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۳۷ ، نول کشور قدیم ص ۱۲۶ ،
جدید ص ۲۰۱ ، بہارستان سخن ص ۱۷۴ -

حسرتِ پابوس میں کھوئی ہے میں نے جانِ زار
خاک سے میرے حنا نے ابرِ باراں سبز ہو
وہ جو کامل ہیں فضیلت ہے انھیں ہر حال میں
سرخ ہووے یا سیہ یا خطِ قرآں سبز ہو
یاد دلواتی ہے فصلِ گل مئے انگور کو
تاکِ خشک اے پرتوِ خورشید تاباں سبز ہو
حسنِ خاکی سے بہارِ باغ کو نسبت ہے کیا
زرد پھر ہوتا نہیں جب رنگِ انساں سبز ہو
سیرِ گلشن میں اگر ٹوٹے ترا بندِ نقاب
رنگ آڑے رخسارِ گل سے سروِ بستاں سبز ہو
جام دے ساقی مئے گلگوں سے بھر کر، حیف ہے
خشک ہو نخلِ تمنّا، کشتِ دہقاں سبز ہو
جوشِ وحشت میں جو روتا ہوں کبھی دل کھول کر
زرد ہو جاتا ہے، کیسا ہی بیاباں سبز ہو
شیر کی آواز پیدا ہووے نے کے نالے میں
میرے مدفن کی جو مٹّی سے نیستاں سبز ہو
حسنِ سبزِ یار سے ممکن نہیں آتش فروغ
رنگ پیدا کرکے گو شمعِ شبستاں سبز ہو

۱۳

[۱]ترے سوا کوئی ترکیب دل پسند نہ ہو
جو برقِ طور بھی چمکے تو آنکھ بند نہ ہو

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۳۷، نول کشور قدیم ص ۱۲۷،
جدید ص ۲۰۱ -

نکلتی ہی نہیں آئینہ خانے سے باہر
غرورِ حسن سے اتنا بھی خودپسند نہ ہو

گلے میں یار کے پڑنے کا ہاتھ ہے مشتاق
کسی غزال کی گردن کی یہ کمند نہ ہو

غرور کھوتی ہے تعلیم خاکساروں کی
آگے جو سرو مری خاک سے، بلند نہ ہو

گوارا یاں دلِ دشمن کی بھی شکست نہیں
ہماری کفش سے موذی کو بھی گزند نہ ہو

زیادہ بوسے سے دشنام میں حلاوت ہے
وہ زہر ہے یہ کہ جس سے لذیذ قند نہ ہو

لبوں سے جان نکلنے دے، ٹھہر جا قاتل
ہماری روح سے آگے ترا سمند نہ ہو

جو روئے حال پر اپنے وہ کیا کسی کو ہنسے
وہ دل دکھائے[۱] کسی کا جو دردمند نہ ہو

ہزاروں دیدۂ بدبیں تو اک نگاہ ہے پاک
غضب ہے ہو جو تری بزم میں سپند نہ ہو

برابر اس کے کھڑا ہو کے سرو اکڑتا ہے
الٰہی قد بھی کسی کا بہت بلند نہ ہو

زباں وہ گنگ ہو جس سے نہ آفریں نکلے
وہ گوش کر ہو جو آتش سخن پسند نہ ہو

۱۴

کیجیے ثابت دہانِ روے رشکِ ماہ کو
کان مدت سے سنا کرتے ہیں اس افواہ کو

۱۔ کلیات طبع علی بخش ص ۱۳۸، نول کشور قدیم ص ۱۲۷، جدید ص ۲۰۲، بہارستان سخن ص ۱۷٦۔

کوچۂ محبوب میں آنکھوں نے اپنی بارہا
سرمے کی قیمت لیا ہے مول گردِ راہ کو

ہم فقیروں کو تمنّا ہے یہی اے شاہِ حسن !
جھاڑتے جاروبِ مژگاں سے تری درگاہ کو

باہر اس سے ہم نہیں جو کچھ ہماری ہے بساط
جان حاضر ہے جو ہو مطلوب اس دلخواہ کو

اس قدر ہے سر کو سودائے زنخدانِ حبیب
تشنہ لب کی آنکھ سے میں دیکھتا ہوں چاہ کو

برہمن حاصل ہے تجھ کو جس طرح بت کا حضور
اس طرح پاؤں تو پھر چھوڑوں نہ میں اللہ کو

بھاگتا ہے اپنی آنکھوں سے خیالِ روے یار
کس طرح آغوش میں لیتا ہے ہالہ ماہ کو

روپ دکھلا کوئی تو ہم کو نیا اے آسماں
یاد کیا آنکھیں کریں گی اس تماشاگاہ کو

کوتہی کی ، ایک دن پہنچی نہ گوشِ یار تک
دور ہم سمجھے ہوئے تھے نصف شب کی آہ کو

موسمِ گل میں یہی ساقی سے کہتا ہوں میں مست
جامِ مالا مال دلوا اپنے دولت خواہ کو

دیکھیے دونوں میں کس کا ہو بخیر انجامِ کار
بت کو سجدہ برہمن کرتا ہے ، ہم اللہ کو

سبزۂ خط نے کیا ہے جیسے اس رخ پر ابھار
کوہ پر بھاری سمجھتا ہوں میں برگِ کاہ کو

زلف حائل ہے نگہ رخسارِ جاناں پر نہ ڈال
ہے شگونِ بد دلا ! جب سانپ کاٹے راہ کو

پھر نہ نکلوں میں چمن سے جو صبا تیری طرح
غنچۂ گل ہوں کبھی دیکھ کے خنداں مجھ کو

لبِ محبوب کی سرخی ہوں میں اس میں سنتا
لعل کو دیکھنے جانا ہے بدخشاں مجھ کو

فکرِ اشعار کو لازم ہے دماغی قوّت
سونگھنا چاہیے وہ سیبِ زنخداں مجھ کو

دل مرا نعرۂ تکبیر بلا دیتا ہے
جتنے کافر ہیں سمجھتے ہیں مسلماں مجھ کو

موسمِ گل نہیں آتا ہے ، اجل آتی ہے
گور سے تنگ ہوا جاتا ہے زنداں مجھ کو

دستِ رنگیں کی تری بیعت اُسے کرواتا
ہاتھ آتا جو کوئی پنجۂ مرجاں مجھ کو

کم ہے جتنا کہ ہوں ممنون ترا بندہ نواز !
صورت اِنسان کی دی ، جوہرِ انساں مجھ کو

ہمہ تن ہو کے جو دل اس میں گروں اے آتش !
رکھے یوسف کی طرح چاہِ زنخداں مجھ کو

۱۷

ٗصاف ہو ہرچند بد باطن ، عزیزِ دل نہ ہو
کج نما آئینہ ہرگز دید کے قابل نہ ہو

روے زیبا کا کسی محبوب کے مائل نہ ہو
دل تو دینا سہل ہے پر جان کی مشکل نہ ہو

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۳۹ ، نول کشور قدیم ص ۱۲۸ ، جدید ص ۲۰۳ -

یار تو بھولا ، کرے غمّاز ہی اسے کاش یاد
دوست تو غافل ہوا ، دشمن کہیں غافل نہ ہو

نیم بسمل کی طرح سے زندگانی ہے خراب
اِس قدر بھی آدمی کو حسرتِ قاتل نہ ہو

اے صنم ! کوئی نہیں محبوب تجھ سا دوسرا
سخت کافر ہے جو وحدت کا تری قائل نہ ہو

مشقِ طفلاں سے زیادہ روز ہوتا ہے سیاہ
نامۂ عصیاں ہمارا کاغذِ باطل نہ ہو

اے بتِ بے رحم ! عزرائیل عاشق کا نہ بن
سینۂ بیمارِ اُلفت کے لیے تو سِل نہ ہو

ہے غرورِ حسنِ دو روزہ سے از خود رفتہ یار
اِس قدر بھی نشّۂ معجونِ آب و گلِ نہ ہو

اٹھ چکا روزِ قیامت روے قاتل سے نقاب
عرصۂ محشر نگہ کے تیر کی منزل نہ ہو

حرمتِ کعبہ طریقِ صاحبِ اسلام ہے
چاہیے رنجیدہ کافر کا بھی تجھ سے دل نہ ہو

ہے ہر اک مصرع مرا خطِّ بتاں کے وصف میں
مدعّا بے عشق کو اس سے کبھی حاصل نہ ہو

ڈوب جانا پار اترنا ہے محیطِ عشق سے
یہ تو ہے بحرِ محبّت ، گر نہیں ساحل نہ ہو

اپنے اشکوں کی جو غلطانی دکھاؤں میں اسے
گوہرِ غلطاں کا [1]نیساں سے صدف سائل نہ ہو

کنجِ تنہائی میں میں نے زندگی کی ہے بسر
گور بھی میری کسی کی گور کے شامل نہ ہو

۱ - کلیات کے نسخوں میں ''گوہر غلطاں کی'' درج ہے ۔

دام میں صیّاد نے کھینچا اُنھیں ، اچھا کیا
باغ ہے ، کچھ بلبل و قمری کی یہ محفل نہ ہو

حشر تک زیرِ زمیں تڑپا کرے گا گور میں
کشتۂ ابرو ہے آتش ، تیغ کا بسمل نہ ہو

۱۸

کیا بادۂ گلگوں سے مسرور کیا دل کو
آباد رکھے داتا ساقی تری محفل کو !

مشتاق جو ہوتا ہوں کعبے کی زیارت کا
آنکھیں پھری جاتی ہیں طوفِ حرمِ دل کو

توڑے دلِ عاشق کو وہ بت تو عجب کیا ہے
کافر ہے سمجھتا ہے کیا کعبے کی منزل کو

نظارۂ صورت سے معنی کا خیال آیا
لیلٰی کے ہوئے مجنوں ، ہم دیکھ کے محمل کو

آبِ دمِ تیغ آبِ انگور ہے اے قاتل !
مستوں کی طرح پاتا ہوں رقص میں بسمل کو

رخ سے جو نقاب اپنے وہ آئنہ‌رو اُلٹے
حیران ہو ، بے خود ہو ، سکتہ سا ہو محفل کو

سودائیوں کی تیرے روح آتی ہے قالب میں
اے زلفِ سیہ سن کر آوازِ سلاسل کو

بے وجہ نہیں اپنے اُڑنے کو یہ بھولا ہے
رخ کا ترے تل سمجھا کافور نے فلفل کو

کشتہ نہ ہو دل کیوں کر ، اللہ نے بھیجا ہے
شمشیر سے دو ابرو دے کر مرے قاتل کو

کلیات طبع علی بخش ص ۱۴۰ ، نول کشور قدیم ص ۱۲۹ ، جدید ص ۲۰۴

تاخیر نہ کر کوئے محبوب کے چلنے میں
کھوٹی نہیں کرتے ہیں فردوس کی منزل کو

بے طرح پھنسا ہے تو اُس زلف کے پھندے میں
اللہ کرے آساں اے دل ! تری مشکل کو

جو چاہے سو مانگ آتش درگاہِ الٰہی سے
محروم کبھی پھرتے، دیکھا نہیں سائل کو

۱۹

[1]کھائے گا خنجرِ جلّاد کا چرکا پہلو
زخم پہلو کو مبارک ہو جگر کا پہلو

بدفِ تیرِ نگہ ہیں جگر و دل دونوں
دیکھیے ہووے کب آباد کدھر کا پہلو

شبِ تنہائی جہنّم میں مجھے رکھتی ہے
داغ پہلو سے نہ ہو گرم بشر کا پہلو

نالۂ صبح شبِ وصل دلاتا ہے یاد
خالی ہوتا ہے مگر مرغِ سحر کا پہلو

بڑھ چلا لاکھ قد یار کی موزونی سے
مصرعِ سرو میں نکلا نہ کمر[2] کا پہلو

بے قراری مری رکھتی ہے مرے پہلو سرد
نہ تو ڈھکتا ہے اِدھر کا، نہ اُدھر کا پہلو

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۳۰ ، نول کشور قدیم ص ۱۲۹ ، جدید ص ۲۰۵ ، سراپا سخن ص ۲۴۲ -

۲ - سراپا سخن میں "مصرع سرو میں نکلا نہ ثمر کا پہلو"

دور سے کوچۂ دلبر کو کھڑا تکتا ہوں
نہ تو دیوار کا تکیہ، نہ تو در کا پہلو
زخمِ کاری ہے مری جان جدائی تیری
دم نکل جائے گا پہلو سے جو سرکا پہلو
یاد آتا ہے تل اُس سیبِ زنخداں کا مجھے
نظر آ جاتا ہے داغی جو ثمر کا پہلو
صاف دل خاک ہو اُس کافرِ کینہ جو سے
نکلے جب صلح کی باتوں میں بھی شر کا پہلو
کوئی صورت نہیں کم بخت کی آبادی کی
روز ویرانہ ہے مجھ خاک بسر کا پہلو
شورِ واعظ سے نہیں کام قدح خواروں کو
پھر بگڑ جائے گی پایا جو اُدھر کا پہلو
زخمِ پہلو کا خدا حافظ و ناصر ہووے
چاند سے صاف ہے اُس رشکِ قمر کا پہلو
خلل انداز کا کیا ڈر، جو موافق ہو مزاج
کہیں ہوتا ہے جدا سکّے سے زر کا پہلو؟
خاکساری نے فضیلت مجھے دی ہے آتش
شملۂ شیخ دبا دے[۱] دُمِ خر کا پہلو

۲۰

'دلایا یاد شب اُس نے جو تیری ساق سیمیں کو
رلایا صبح تک ہنس ہنس کے میں نے شمعِ بالیں کو

---

۱ - نول کشوری نسخے میں ہے "دبا ہے".
۲ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۴۰، نول کشور قدیم ص ۱۲۹، جدید ص ۲۰۵ -

خزاں نے بیشتر کارِ گل و بلبل کیا آخر
جزائے خیر دے اللہ صیّاد اور گل چیں کو

ہزار افسوس ہے ، اے بے مروت تو نہیں آتا
غش آ جاتا ہے اکثر تیرے بےتابوں کی تسکیں کو

تماشا دیکھتا ہوں گھر میں بیٹھے ہفت کشور کا
بنایا ہے مرا دل توڑ کر جامِ جہاں بیں کو

تکلّف سے مبرّا ہے مزاجِ عاشقِ شیدا
نہ دیکھا قمریوں کی گردنوں میں طوقِ زریں کو

نئے ہر سال سرکارِ جنوں سے داغ ملتے ہیں
بہارِ گل کیا کرتی ہے جاری تازہ آئیں کو

نہ گھبرا اس قدر ، شامِ شبِ فرقت سحر ہوگی
دعا تو مانگ غافل ، مستعد اختر ہے آمیں کو

عدم پہنچائے گا شوق اس کمر کا مجھ کو ہستی سے
سمجھتا ہوں گڑھے میں گور کے گامِ نخستیں کو

سوارِ اسپ اے گلگوں قبا تجھ کو اگر دیکھیں
منجّم منزلِ مرّیخ سمجھیں خانۂ زیں کو

پری سے چہرے پر لہرا کے سو سو بار آتی ہے
ہؤا ہے آج کل سودا تمہاری زلفِ مشکیں کو

تمھیں دیکھے تو مجنوں سے سوا لیلیٰ ہو دیوانی
تمھاری دل فریبی چھین لے خسرو سے شیریں کو

سواری میں دکھائی دیں گے میری خاک کے ذرے
موا ہوں دیکھ کر اِک آفتابِ خانۂ زیں کو

حسینوں کو ہے لازم رحم اپنے عشق بازوں پر
رعیّت پر رعایت چاہیے کرنی سلاطیں کو

ہماری قبر ہو مشقِ خرامِ ناز کی تختی
قلم کی چال ادا چلوائے آن پائے نگاریں کو
بشر کو بعد نعمت کے، ہے ہوتی قدر نعمت کی
غنیمت جانتا ہے لنگ اپنے پائے چوبیں کو
ہماری یار کی رہتی ہے جنگِ زرگری آتش
نہیں کچھ دخل اس قصے میں عقلِ مصلحت بیں کو

۲۱

لپٹ[۱] کر یار سے چوما نہایت روے رنگیں کو
چمن میں توڑتے دیکھا جو میں نے پھول گلچیں کو
ہمارا کاسۂ سر راہ افتادہ ہے مدت سے
خدا توفیق دے ٹھوکر کی آن پائے نگاریں کو
تمہاری زلف کے ہر مو کو ہیں اک اژدہا کہتے
مزا دلوائیے ان شاعرانِ ناتواں بیں کو
یہ گستاخی شبِ وصل اپنے ہاتھوں سے عجب کیا ہے
کریں طوقِ کمر جو یار کی ساقِ بلوریں کو
خرامِ ناز کی مشق آج کل ان کو نہایت ہے
رہا کرتا ہے گھڑیوں زلزلہ سا کوہِ تمکیں کو
سنی ہیں کافرانِ عشق کے منہ سے جو تعریفیں
مسلماں ڈھونڈھتے پھرتے ہیں اس غارت گرِ دیں کو
نظر پڑ جائے جو تیرے صفائے رخ کا آئینہ
نگہ بد بیں کی پھر کر کور کر دے چشمِ بد بیں کو
فراقِ یار میں جب سامنے آیا تو آنکھوں نے
نگاہِ زہر آلودہ سے دیکھا خوابِ شیریں کو

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۴۱، نولکشور قدیم ص ۱۳۰، جدید ص ۲۰۶ -

کہاں پیچ و خم گیسوے مشکیں زلف سنبل میں
تمھاری نازک اندامی سے کیا نسبت ہے نسریں کو

فراق یار میں سودائے آسائش نہیں بہتر[1]
نہ آئی نیند تو توڑوں گا سر سے خشت بالیں کو

گل رخسار اپنا تم نے جس شاعر کو دکھلایا
ہوا وہ ڈھونڈھتے ہی ڈھونڈھتے مضمون رنگیں کو

خیال آتا ہے دل کو جاں کنی کی جب کہ مشکل کا
زباں سے گوش پڑھوا کر سنا کرتے ہیں یٰسیں کو

رسائی داربست تاک تک جن کی نہیں ہوتی
وہ مفلس جانتے ہیں خوشہ انگور پرویں کو

جمال یار سے روشن ہیں آنکھیں ، گھر منوّر ہے
نہیں پھولا سماتا دل ، خوشی ہے جان غمگیں کو

فقیری کا ترے کوچے کی جن کے سر کو سودا ہے
پروں کا تکیہ وہ سمجھے ہوئے ہیں خشت بالیں کو

جھکائے رکھیے گی کب تک حیاے حسن وہ آنکھیں
کوئی دن چشم پوشی طائر دل سے ہے شاہیں کو

بشر کیا کر سکیں گے کام دست قدرت حق کا
بنایا خوب صورت یار سا اک لعبت چیں کو

وہ طفلی کا بھی عالم یاد ہے آج اے شکار افگن
لپٹ جاتا تھا ہم سے ، دیکھ کر تو شیر قالیں کو

تمنّا دولت دنیا کی اے آتش نہیں رہتی
قناعت سے غنی اللہ کر دیتا ہے مسکیں کو

---

۱ - نسخہ علی بخش میں ”بہتر“ نول کشور میں ”تمہر“ -

۲۲

[1]دلِ بے تاب کو فریاد و فغاں کرنے دو
پہلے غمّاز ہی کو قصّہ بیاں کرنے دو

جانبِ دشت عدم خیمہ رواں کرنے دو
وحشتِ دل کو علاج خفقاں کرنے دو

سوزِ دل میری طرح سے نہ بیاں ہووے گا
شمع کافوری کو بھی چرب زباں کرنے دو

کوہِ غم ٹوٹنے پر آہ ہے یاں کم ظرفی
ٹھیس سے کاسۂ چینی کو فغاں کرنے دو

سامنے آ ہی گیا لشکرِ اندوہ و ملال
اب تو سیدھے مری آنکھوں کو نشاں کرنے دو

آخرِ کار تہِ خاک ہے مسکن سب کا
اہلِ دولت کو بلند آج مکاں کرنے دو

میں تو شاعر نہیں ، عاشق ہوں ، مجھے کیا ڈر ہے
کاکلِ یار پہ افعی کا گماں کرنے دو

رنگ اڑ جائے گا رخسارۂ نافرماں سے
باغ میں تم مری آہوں کو[2] دھواں کرنے دو

اُس کا افسانہ دکھا دے گا مجھے خوابِ عدم
کمرِ یار نزاکت کو نہاں کرنے دو

انتظارِ ملک الموت میں بیدار ہوں میں
بختِ خفتہ کو مرے خواب گراں کرنے دو

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۴۲ ، نول کشور قدیم ص ۱۳۰ ، جدید ص ۲۰۷ -
۲ - لکھنؤ کے ایڈیشنوں میں ہے : ''مری آہو کو دھواں کرنے دو -'' لاہوری ایڈیشن میں ''آہوں کَ دھواں کرنے دو'' غلط چھپا ہے -

آج تک آہ کے کءڑوں سے بدن نیلا ہے
آسماں کو مجھے رسوائے جہاں کرنے دو
کمر یار کا مضموں نہیں بندھ سکنے کا
موشگافوں کو رگِ گل کا گماں کرنے دو
اہلِ اسلام ہوں ، غیبت نہیں شیوہ میرا
میرے دشمن کو مرے عیب عیاں کرنے دو
پھوٹ بہنے دو آنھیں یار کے آگے آتش
دل کا احوال بھی آنکھوں کو بیاں کرنے دو

۲۳

[1]جور و جفائے یار سے رنج و محن نہ ہو
دل پر ہجومِ غم ہو ، جبیں پر شکن نہ ہو
شادی نہیں قبول مجھے ، غم قبول ہیں[2]
میری خوشی سے تنگ مرا پیرہن نہ ہو
دیکھوں تو تا کجا نہیں ہوتا ہے رام تو
انساں ہے آخر اے بتِ وحشی ہرن نہ ہو
رو اس قدر کہ آبروے ابرِ تر رہے
اتنا نہ ہنس کہ برق کبھی خندہ زن نہ ہو
پہنچے نہ راستی میں ترے قد کو قدِّ سرو[3]
ہم پلّہ نازکی میں گلِ یاسمن نہ ہو
وہ کم نصیب ہوں کہ میسّر کبھی جسے
معشوقِ نوجوان و شرابِ کہن نہ ہو

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۳۱ ، نول کشور قدیم ص ۱۳۱ ، جدید ص ۲۰۸ -
۲ - علی بخش ''قبول ہے'' متن مطابق نول کشور -
۳ - علی بخش : ''قدِ سرو'' - جدید نسخوں میں ''سرو قد'' ہے -

آئینے سے حجاب نہ ٹوٹے حبیب کا
شانے سے صاف زلفِ شکن در شکن نہ ہو
شرمندہ پیشِ یار ہیں گلبرگ و آئنہ
ایسا لطیف و صاف کسی کا بدن نہ ہو
بیمار مدتوں سے ہے میرا دلِ حزیں
اس کا علاج بوسۂ سیبِ ذقن نہ ہو
بوسوں سے عارضوں ہی کے لب لطف اٹھائیں گے
رخسارِ یار میں جو نہیں ہے دہن نہ ہو
ہستی میں یاد آئے نہ کیوں کر عدم مجھے
وہ آدمی نہیں جسے حُبّ الوطن نہ ہو
ہم تشنہ لب موئے تو سزا چاہنے کی تھی
غیرت سے پانی پانی وہ چاہِ ذقن نہ ہو
عاشق ہوں میں معاف ہوں میرے سوا تجھے
عریاں جو چاہے اس کو میسّر کفن نہ ہو
یہ رعبِ حسنِ یار سے محفل ہے دم بخود
ڈھونڈھو تو عرضِ حال کو پیدا دہن نہ ہو
کس گھر میں روشنی نہیں اندھیر ہے دلا
روشن چراغِ عشق سے قصرِ بدن نہ ہو
وہم و خیال کے بھی نہ ہاتھ آئے وہ کمر
حجّت کا اس دہن کی کسی کو دہن نہ ہو
عالم پسند صورتِ زیبائے یار ہے
یہ سکّہ وہ نہیں ہے کہ جس کا چلن نہ ہو
کہہ کر ہر ایک عضو سے یہ روح چل بسی
اس طرح بے چراغ کوئی انجمن نہ ہو

سینگوں کو اپنے دیکھے ، کھروں پر نظر کرے
ہم چشم یار چشمِ سیہ سے ہرن نہ ہو
رنگینیٔ سخن رہے گی روزِ حشر تک
اڑ جائے چار دن میں یہ رنگِ چمن نہ ہو
آتش جو بوسہ لے لے تو اس کا برا نہ مان
عاشق ہے اے صنم یہ ترا برہمن نہ ہو

۲۴

[1]سامنے آنکھوں کے پھروں ہی بٹھایا یار کو
مال مارا ہم نے ، لوٹا دولت دیدار کو
غش سے آنکھیں کھول کر دیکھے جو زلفِ یار کو
روز صحت کا شبِ تاریک ہو بیمار کو
آسماں پر حسن نے پہنچا دیا دلدار کو
دھوپ سایے کو کیا ، سورج کیا رخسار کو
چیر کر پہلو کیا قاتل کے خنجر نے کرم
اپنے گھر میں آیا مہماں توڑ کر دیوار کو
سلسلہ اپنا رخِ محبوب تک پہنچا دیا
زلف نے شیرازۂ مصحف کیا زنّار کو
مشہدِ پروانہ میں اکثر جلائی ہم نے شمع
نامِ بلبل پر لٹایا بارہا گلزار کو
کس کے چار ابرو کے نظّارے نے دم پھڑکا دیا
درمیاں پاتا ہوں دل کو ، چار سو تلوار کو

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۴۳ ، نول کشور قدیم ص ۱۳۱ ، جدید ص ۲۰۹ ، بہارستانِ سخن ص ۱۶۷ -

پرزے اُڑتا ہے دل صیّاد ہر نالے کے ساتھ
باغباں قینچی سمجھتا ہے مری منقار کو

ڈالتا ہے عاشقوں پر آپ کے رغبت کی آنکھ
آنکھ دکھلاؤ تم اپنے روزن دیوار کو

دردِ دل نے پردہ اپنی لاغری کا رکھ لیا
تارِ قانوں کردیا نالوں نے جسمِ زار کو

چار ہی دن میں نہ رکھا بلبل و گل کا نشاں
کھا گئی صیّاد و گل چیں کی نظر گلزار کو

خواب میں بھی دیکھنے سے یار کے رکھتا ہے باز
فتنۂ بیدار کہیے دیدۂ بیدار کو

حلقہ اپنی بزم کا انصاف سے خالی نہیں
شمع روشن کی ، تو نیوتا مرغِ آتش خوار کو

دشمنوں کو جان کے ، دل کی طرح رکھّا عزیز
گرگ کو پالا بغل میں ، آستیں میں مار کو

سرکشی نے پائی آتش خاکساری سے شکست
فضل سے اللہ کے توڑا بتِ پندار کو

۲۵

[1]دوست رکھتے ہیں جواں مرد اہلِ جوہر یار کو
تول کر زر سے سپاہی لیتے ہیں تلوار کو

صاف یوں کرتا ہے شانہ موئے جعدِ[2] یار کو
جنتری میں کھینچتے ہیں جس طرح سے تار کو

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۴۳ ، نول کشور قدیم ص ۱۳۲ ، جدید ص ۲۰۹ ، بہارستانِ سخن ص ۱۶۹ -
۲ - جعد = زلف -

کر دیا نوعِ دگر سُرمے نے چشمِ یار کو
نرگسِ شہلا بنایا نرگسِ بیمار کو

خوش نویسی میں بھی کی اس طفل نے مشقِ ستم
خون سے بلبل کی لکھا قطعۂ گلزار کو

ابروؤں سے وہ مسیں کیوں کر نہ ہوویں دل پذیر
خوب صورت ہم نے دیکھا راست خم تلوار کو

شمع کے شعلے کو جب گلگیر نے منہ میں لیا
پر نچا آنکھوں نے دیکھا مرغِ آتش خوار کو

سنگریزے کیا خدا اس کو نہ دیتا باغ میں
کبک نے رزاق سمجھا ہے مگر کُہسار کو

جب سے دیکھا ہے گذرگاہِ نگاہِ یار اسے
نائے ناوک جانتا ہوں روزنِ دیوار کو

پیچھے رکھنا میرے داغوں پر اسے اے دوستو
آگ پر رکھ دیکھو پہلے مرہمِ زنگار کو

پردۂ دل سے نکلنا نالے کا یاد آگیا
خوب رویا سن کے میں آوازِ موسیقار کو

دستِ قدرت نے بنایا حسن کا مجھ کو گدا
آنکھوں کے کاسے دیے دریوزۂ دیدار کو

سبز خط سے حسن نے گورے زنخداں میں ترے
چشمۂ کافور کی کائی کیا زنگار کو

یاد صحرا نے یہ زنداں میں رلایا مجھ کو خوں
گل سے رنگیں کر دیا زنجیر کے ہر خار کو

خون جگر ہوتا ہے ، یہ گفتار کیسی جانِ جاں
پیستے ہو دل کو ، کیا کہتے ہیں اس رفتار کو

دل کو بہلاتا ہے وہ ترک آتش اپنی تیغ سے
رقص بسمل کا دکھایا کرتی ہے وہ یار کو

۲٦

[1]کیا ہؤا نادم دکھا کر آئنہ میں یار کو
تپ چڑھ آئی دیکھ اپنی نرگسِ بیمار کو
سمجھے ہم دیکھا جو قدّ و ابروے دلدار کو
راستی ہے تیر کو زیبندہ ، خم تلوار کو
چل کے دکھلا دے جو اندازِ خرامِ یار کو
ہنس کی گردن میں میں ڈالوں موتیوں کے ہار کو
طاق ابرو میں یہ چشمِ یار سے ظاہر ہوا
بہرِ صحّت لاتے ہیں مسجد میں بھی بیمار کو
شربتِ عنّاب ، آبِ تیغِ زہرآلودہ ہے
سیب انارِ آتشیں ہے عشق کے بیمار کو
وہ تنک مشرب ہیں ہم خم خانۂ افلاک میں
نشۂ زر ہو ، پییں گر شربتِ دینار کو
خاک سے روشن ضمیروں کی بنی ہے یہ مگر
سیر بیرون و دروں ہے روزن و دیوار کو
چہرۂ رنگیں کی دکھلائی تصوّر نے بہار
بند آنکھوں کو کیا ، کھولا درِ گلزار کو
جوش وحشت میں کیا میں نے گریباں چاک چاک
ہڈیاں زخموں کی پہنائیں گلے کے ہار کو

---

۱ ۔ کلیات طبع علی بخش ص ۱۴۴ ، نول کشور قدیم ص ۱۳۲ ، جدید ص ۲۱۰ ، بہارستانِ سخن ص ۱۷۱ ۔

یار بن سمجھا گلوں کو میں گنہ گاروں کی بھیڑ
سرو و سنبل نے دکھایا ریسمان و دار کو

وقتِ آخر عشقِ پنہاں یار پر ظاہر ہوا
نزع میں عیسٰی نے پہچانا مرے آزار کو

لب بلب فریاد کو شیریں سے ہونا ہے محال
لعل قسمت میں نہیں کاٹا کرے کہسار کو

حسن کے جلوے سے روشن ہوں گے آنکھوں کے چراغ
کورِ مادر زاد دیکھیں گے ترے دیدار کو

بھر گیا آنکھوں میں آتش گورِ تیرہ کا گڑھا
خاک اڑائی میں نے ، جب سوچا مالِ کار کو

۲۷

[1]جو نعمت عشق کی چاہے تو راحت جان ایذا کو
عصا پیچھے دیا ، پہلے جلایا دستِ موسٰی کو

وہ منصف ہوں اگر میں نے کیا ختمِ کلام اللہ
ثوابِ سورۂ یوسف دیا روحِ زلیخا کو

خدا جانے کہ ہو گا حال کیا ہم بادہ نوشوں کا
لڑا کر جام سے توڑا ہے بدمستی میں مینا کو

حنا اے بحرِ خوبی تیرے دست و پا میں لازم ہے
نہیں دیکھا ہے خالی پنجۂ مرجاں سے دریا کو

شب و روز اس کو رقصِ شادمانی میں میں پاتا ہوں
حصارِ عافیت گرداب نے سمجھا ہے دریا کو

دلِ پژمردہ ہوتا ہے شگفتہ کوے جاناں میں
ہوائے باغِ جنت زندہ کر دیتی ہے مُوتا کو

۱- کلیات طبع علی بخش ص ۱۴۴ ، نول کشور قدیم ۱۳۳ ، جدید ص ۲۱۱ -

کیا استاد کو شاگرد اُس طفلِ پری رو نے
پڑھایا روزِ بسم اللہ علمِ عشق مُلّا کو

نہیں جس کا کوئی ، اس کا خدا ہے پوچھنے والا
اٹھاتے ہیں ملائک آ کے بے وارث کے موتا کو

مری میراث ہے خلدِ بریں ، فرزندِ آدم[۴] ہوں
سرھانے جانتا ہوں اپنے میں زانوے حورا کو

شبِ تاریک میں آنکھوں کو وہ دل بر نظر آیا
سیہ خیمے میں مجھ مجنوں نے دیکھا روئے لیلا کو

تراشا تجھ کو جس بت ساز نے اے بت قیامت کی
بنایا شیشے سے نازک مزاج سنگِ خارا کو

دکھایا کس پری پیکر نے خالِ چہرۂ رنگیں
غنیمت جانتا ہے لالہ اپنے داغِ سودا کو

چمن میں یار سروِ بن جو رویا [۱]میں تو اشکوں نے
گلوں کے کان کا جھمکا بنایا ہے ثریّا کو

قریبوں سے نہ رکھ امداد کی امیّد مشکل میں
نکالا ناخنِ پا نے کہاں خارِ کفِ پا کو

وہ محبوبِ جہاں ہے تو ، ہوا نے تیرے کوچے کی
چھڑایا شیخ سے کعبے کو ، راہب سے کلیسا کو

یدِ بیضا سا روشن یار کا رخسار ہے آتش
لبِ جاں بخش رکھتے ہیں دمِ پاکِ مسیحا کو

---

۱ - کلیات طبع علی بخش : ”رویا ہوں تو اشکوں نے ۔“ نول کشور جدید : ”رویا میں تو اشکوں نے ۔“

۲۸

یا رب آغازِ محبّت کا بخیر انجام ہو[1]
شیشے میں اُترے پری ، پختہ جنونِ خام ہو

دل کو عشقِ آتشِ گل سے جلا مثلِ سپند
نالۂ اول میں اے بلبل تجھے آرام ہو

دفن ہوں دولت سرائے یار کی دہلیز میں
اس صنم کا آستانہ میرے گھر کا بام ہو

مرغِ دل کو کنجِ لب میں زلفِ پیچاں لے گئی
اس طرح سے جس طرح رہبر قفس کا دام ہو

اس قدر شوقِ قبائے تنگ و چست اچھا نہیں
جامے سے باہر نہ وہ محبوبِ گل اندام ہو

کیسی کیسی راحتیں پائی ہیں کوے یار میں
صبحِ جنّت سے منوّر اس گلی کی شام ہو

مے سے تلوار اپنی بجھوائی ہے اس سفّاک نے
دیکھیے لبریز کس کس بے گنہ کا[2] جام ہو

دستِ انصاف و ترازوے خرد موجود ہے
وہ تُلے اس چشم سے بے مغز جو بادام ہو

ابرِ دریا بار آ پہنچا قریبِ مے کدہ
نا خدائے کشتیٔ مے ساقیِ گلفام ہو

ہے یہی اپنی دعا زلفِ سیاہِ یار کو
ہو نہ جس سر کو ترا سودا ، اسے سرسام ہو

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۰۵ ، نول کشور قدیم ص ۱۳۳ ، جدید ص ۲۱۱ -

۲ - نسخۂ علی بخش میں ''بے گنہ کے جام ہو'' - نول کشور جدید و لاہور : ''بے گنہ کا جام ہو -''

حسن کا شہرہ ہو ہم کو خاک میں ملوائے عشق
کارِ مردانہ کرے کوئی ، کسی کا نام ہو
چال وہ چلتے ہو ، دل پستے ہیں جس پر ہر قدم
کام وہ کرتے ہو تم ، جس میں کسی کا کام ہو
کچھ تکلف چاہیے دولت سرائے یار میں
نقرئی دیوار و در ہوویں ، طلائی بام ہو
راز ہے ، سن لو اسے ، تم سے کہے رکھتے ہیں ہم
انجمن میں بات خلوت کی نہ آتش عام ہو

۲۹

بے یار ساری رات جلایا شراب کو
تا صبح میں نے منہ نہ لگایا کباب کو
کھل جائے پردہ آپ کے حسن و جمال کا
عاشق نگاہِ بد سے جو دیکھیں نقاب کو
اُمّیدوار ہیں نگہِ لطف کے کھڑے
آنکھوں کے سامنے سے ہٹاؤ حجاب کو
ترکِ فراقِ یار ہے وہ ترکِ بد مذاق
کھا جائے بے نمک کے جو کچّے کباب کو
دندانِ یار کھلتے ہیں ہنسنے میں بیشتر
بے آبرو کریں گے یہ دُرِّ خوشاب کو

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۴۵ ، نول کشور قدیم ص ۱۳۴ ، جدید ص ۲۱۲ ، بہارستانِ سخن ص ۱۷۸ - اس طرح میں ناسخ کی غزل کا ایک خوبصورت شعر دیکھیے :

کرتے تھے فاش نشے میں بد مست سرِّ غیب
اس واسطے حرام کیا ہے شراب کو

سنتے ہیں روزِ حشر کو منہ ہوگا اس طرف
ذرّے بھی دیکھ لیں گے رخِ آفتاب کو

کچھ کچھ اثر تو ہونے لگا جذبِ عشق کا
غش سُن کے ہم کو یار نے بھیجا گلاب کو

اس کا جواب ہے ، نہ تو اُس کا جواب ہے
رُخ یار کو ملا ہے تو پشت آفتاب کو

قاصد کے ہاتھ آنے سے رشک آنے کا مجھے
لکّھا ہے میں نے خط میں ، نہ لکھنا جواب کو

دل کو رہیں گے جوشِ محبّت سے ولولے
ہوگا وہ مست جو کہ پیے گا شراب کو

فرقت میں یار کے ہے بھرا پیس کر نمک
آنکھوں میں اپنی ، میں نے جو دیکھا ہے خواب کو

پی کر شراب نشے سے اس نونہال نے
شمشیرِ آبدار کیا ہے شباب کو

بے گنتی بوسے لیں گے رخِ دل پسند کے
عاشق ترے پڑھے نہیں علمِ حساب کو

رکھتے ہیں اہلِ مدرسہ بھی عشق یار سے
سمجھے ہوئے ہیں روئے کتابی کتاب کو

سودائے زلفِ یار کی سر میں ہوا نہ رکھ
اپنے دل لگا نہ جان کے پیچھے عذاب کو

اے شہسوار خانۂ زیں کا ہے تُو چراغ
یمنِ قدم سے تیرے شرف ہے رکاب کو

اُترے ہو تم جو غسل کو ، عالم ہے وجد کا
دریا اُچھالتا ہے کلاہِ حباب کو

نعمات بےحساب کو تیرے کمی نہیں
پایا طَعام خوان میں ، کوزے میں آب کو
آتش جو شوقِ کعبہ ہے دل سے کرو رجوع
دیکھو اس آستانۂ عالی جناب کو

۳۰

[1]بے قراری میں مری یار اثر پیدا ہو
سر کو دیوار سے ٹکراؤں تو در پیدا ہو
جوہر پاک سے پاکیزہ گُہر پیدا ہو
صُلبِ یعقوب سے یوسف سا پسر پیدا ہو
خوش جمالوں سے زمانہ نہیں رہتا خالی
مہر پنہاں ہو نظر سے تو قمر پیدا ہو
ابرِ نیساں کے کرم سے دُرِ یکتا لا کھوں
گوش تو کوئی سزاوارِ گُہر پیدا ہو
شعر گوئی میں مری طبع کو دقّت ہے پسند
خشک دو لب ہوں تو اک مصرعِ تر پیدا ہو
بے نمودوں کو بھی ہو شوق نموداری کا
ناف کی طرح وہ معدوم کمر پیدا ہو
مجھ مسافر کی تو صورت نہ کسی نے دیکھی
میں تو پوشیدہ رہا گردِ سفر پیدا ہو
ایک دم میں میں لُٹا[2] دوں ابھی نشے میں اسے
مجھ کو دولت سے اگر نشۂ زر پیدا ہو

---

۱ - کلیات طبع علی بخش،ص ۱۴۶ ، نول کشور قدیم ۱۳۴ ، جدید ص ۲۱۳ -
۲ - علی بخش : ”میں لٹا دوں اسی نشتہ میں اسے -“

باغِ عالم میں ہوا چلتی ہے وہ وحشت خیز
صورتِ بید ہو مجنوں ، جو شجر پیدا ہو
عہدِ پیری میں طبیعت کو جواں ہم بھی کریں
خوب صورت جو وفادار بشر پیدا ہو
حلقۂ زلف سے وہ چہرۂ روشن نظر آئے
ظلمتِ شام میں بھی نورِ سحر پیدا ہو
میرے اشعار گل‌اندام پڑھیں اے آتش
فکرِ رنگیں میں مرے رنگِ اثر پیدا ہو

۳۱

[1]ٹھوکریں مار کے مُردوں کو جلاتے نہ چلو
رشک سے خاک میں زندوں کو ملاتے نہ چلو
ان کی پازیب کی جھنکار سے آتی ہے صدا
فتنۂ حشر کو بدخواب جگاتے نہ چلو
باغ میں آئے ہو ساتھ ان کے بھی پھر لو دو گام
کبک و طاؤس کا جھگڑا ہی چکاتے نہ چلو
برقِ شمشیر کی اچّھی نہیں چالیں چلنی
راہ کو کاٹتے ، جادے کو جلاتے نہ چلو
[2]سائلِ بوسہ کو منہ پھیر کے کہتا ہے وہ شوخ
نیک طینت ہو تو بدذاتی پر آتے نہ چلو

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۴۶ ، نول کشور قدیم ص ۱۳۵ ، جدید ص ۲۱۴ ، چمن بے نظیر ص ۱۷۶ -
۲ - چمن بے نظیر :
سائل حسن کو منہ پھیر کے کہتا ہے وہ شوخ
خاک طینت ہو تو وہ ذاتی جلاتے نہ چلو

گرے پڑتے ہیں کنووں[1] اور گڑھوں میں رہگیر
ذقن و ناف کے عالم کو دکھاتے نہ چلو

دو قدم ساتھ جو[2] چلتا ہوں میں گریاں ان کے
یہی فرماتے ہیں ہنس ہنس کے ، ہنساتے نہ چلو

گوشمالی دو نہ گلگشت میں گل کو پیارے
طفلِ غنچہ ہے غریب ، اس کو ڈراتے نہ چلو

پُر مشقّت ہے رہِ عشق ، نہ طے ہو دو گام
کوسوں دریا جو پسینے کے بہاتے نہ چلو

منہ چھپا کر یہ نکلنا ہے تمھارا اندھیر
رہ نشیں عاشقوں کو راہ بتاتے نہ چلو

مشقِ رفتار کرو ، گرم روی کی نہ سہی
کون سی چال ہے یہ ، آگ لگاتے نہ چلو

بھاگ کر عاشقِ شیدا سے کہاں جاؤ گے
قدم آہستہ رکھو ، ٹھوکریں کھاتے نہ چلو

اپنے ہاتھوں سے نہ اندھوں کا گلا کٹواؤ
یوں چلو ، پاؤں کی آواز سناتے نہ چلو

کوے معشوق میں اے عاشقو جاتے ہو تو جاؤ
یہ شگوں نیک نہیں ، خاک اڑاتے نہ چلو

ان سے کہہ دے کوئی آتے ہیں جو یہ لکّۂ ابر
چشمِ آتش کی طرح آنسو بہاتے نہ چلو

---

۱ - کلیات کے جدید نسخوں میں ''کنویں اور گڑھوں'' ہے - طبع علی بخش و چمن بے نظیر سے تصحیح کی گئی - چمنِ بے نظیر میں اس شعر کا قافیہ 'دکھاتے' کے بجائے 'جگاتے' ہے -

۲ - علی بخش : ''تو چلتا ہوں'' -

۳۲

محبّت سے بنا لیتے ہیں اپنا دوست دشمن کو
جھکاتی ہے ہماری عاجزی سرکش کی گردن کو

بیاں کچھ تو کرے آگے ہمارے حالِ گلشن کو
خدا نے دس زبانیں اک دہن میں دی ہیں سوسن کو

دلِ بے تاب بسمل کی طرح سے رقص کرتا ہے
چھری سے اک کمر کی ہو گئی ہے لاگ گردن کو

نقاب اُس آفتابِ حسن کا اندھیر رکھتا ہے
رخِ روشن چھپا کر شب کیا ہے روزِ روشن کو

اڑاتے دولتِ دنیا کو ہیں ہم عشق بازی میں
طلائی رنگ پر صدقے کیا کرتے ہیں کندن کو

ملاحت کا تمھاری دور دور افسانہ پہنچا ہے
چمن سے باغباں نے کھود کر پھینکا ہے سوسن کو

یہی سودا رہا شمشیرِ قاتل کی تمنّا میں
پیا پانی بجھایا لال کر کے جب کہ آہن کو

قبائے سرخ وہ اندامِ نازک دوست رکھتا ہے
ملانا خاک میں عاشق کا ہے شغل اُن کے دامن کو

تجھے مُلوا کے مِسّی باغ اے محبوب لے چلتے
گھڑی بھر کو جو ملتی چشمِ نرگس روئے سوسن کو

کوئی شمشیرِ چوبیں جو نظر آئی ہے میلے میں
کیا ہے یاد ہم نے اپنے قاتل کے لڑکپن کو

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۴۶ ، نول کشور قدیم ص ۱۳۵ ، جدید ص ۲۱۴ ، بہارستانِ سخن ص ۱۶۵ -

نہایت زخم کے سینے میں کرتی ہے یہ بے دردی
کسی مژگاں سے تو کچھ رشتہ داری ہو نہ سوزن کو
تصوّر لالہ و گل کا رہا کرتا ہے آنکھوں میں
قفس میں بھی سلامِ شوق کر لیتے ہیں گلشن کو
سوار اس تیغ زن کو دیکھتا ہے جو وہ کہتا ہے
ہمارا خون حاضر ہے ، اگر رنگواؤ توسن کو
کمی ہوگی نہ بعدِ مرگ بھی بے تابیٔ دل میں
قیامت تک رہے گا زلزلہ سا میرے مدفن کو
قدم مردانگی کے ساتھ مارا دوست داری میں
کیا ہشیار غافل ہا کے اکثر ہم نے دشمن کو
دگرگوں رنگ رہتا ہے مرا شوقِ شہادت میں
گراں ہے دوش کو گردن تو بھاری سر ہے گردن کو
تبسّم میں نظر آنا ترے دنداں کا آفت ہے
چمکنے سے لگاتی ہے یہ بجلی آگ خرمن کو
حقیقت ہم سے پوچھے کوئی اس عشقِ مجازی کی
بہت دیکھا ہے تصویرِ گلی کے رنگ و روغن کو
یہ قصرِ یار کو پیغام دینا اے صبا میرا
نگاہیں ڈھونڈھتی ہیں تیری دیواروں کے روزن کو
پڑے ہو غش میں کیا مردے سے آتش آنکھ کو کھولو
خبر کے واسطے اس بت نے بھیجا ہے برہمن کو

۳۳

[1]حاضر ہیں ہم جو معرکۂ کارزار ہو
متّریخ فیلِ مست کے اوپر سوار ہو

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۴۷ ، نول کشور قدیم ص ۱۳۶، جدید ۲۱۵-

رسوا نہ نالے کر کے دلِ بے قرار ہو
بدتر ہے عشق عیب سے ، جب آشکار ہو
رنگِ حنا سے سرخ کفِ دستِ یار ہو
خونِ شہیدِ مہر و وفا سازوار ہو
یا رب! اسیرِ زلف دلِ داغ دار ہو
طاؤس دامِ ابرِ سیہ کا شکار ہو
زاہد فریب نرگسِ جادوئے یار ہو
بیمار ہو وہی کہ جو پرہیز گار ہو
کج رکھ کے وہ کلاہ جو چڑھتے ہیں اسپ پر
گردن پر ان کی خون ہمارا سوار ہو
مستِ شرابِ عشق کب آتے ہیں ہوش میں
یہ نشہ وہ نہیں ہے کہ جس کو خمار ہو
الٹی ہوا زمانے میں چلتی ہے ، چاہیے
اس گل بدن کو میری طرح خار خار ہو
پنہاں دہن جو ہے تو رہے ، کچھ غرض نہیں
بوسے کے واسطے لبِ یار آشکار ہو
اے آفتابِ حسن! یہ حسرت ہے بعدِ مرگ
ہر ذرہ میری خاک کا تجھ پر نثار ہو
بلبل کو مول لے کے حوالے کروں چمن
کوچے میں یار کے جو مرا اختیار ہو
دستِ جنوں سے زلف کے سودے میں چاہیے
پیراہنِ حیات مرا تار تار ہو
کب سے دل و جگر ہیں نشانہ بنے ہوئے
دیکھوں کدھر سے تیرِ نگہ کا گذار ہو

چنگاریاں جھڑیں[1] عوضِ قطرہ ہائے آب
برسائے آگ ابر جو دل کا بخار ہو
وردِ زباں ہو نام ترا جس کو اے حبیب
حاصل اسے نگیں سے سوا اعتبار ہو
دھوکا جو تیرے آتشِ رخسار کا نہ کھائے
سیاب آگ میں نہ کبھی بے قرار ہو
اس رشکِ گل کی چینِ جبیں میں نہ ہو کمی
شبنم کی طرح سے کوئی گریاں ہزار ہو
گلگشت کا خیال جو آ جائے آپ کو
تم آگے ، پیچھے پیچھے تمھارے بہار ہو
سُرمہ نہ سمجھے جو کہ تری گردِ راہ کو
آشوب ہو اس آنکھ کے اندر غبار ہو
بیزار زندگی سے ہوں یہ شوقِ مرگ میں
ڈھونڈھوں چراغ لے کے جو پیدا مزار ہو
لازم نہیں ہے وصل کی شب میں "نہیں نہیں"
ایسا نہ غمزہ کیجیے جو ناگوار ہو
آتش ہو دل دونیم ، سخن چیں اگر سنے
اپنا کلام معجزۂ ذوالفقار ہو

---

۱ - کلیات طبع علی بخش :

"چنگاریاں چڑھیں عوضِ قطرہ ہائے آب"

طبع جدید لکھنؤ و لاہور :

"چنگاریاں جھڑیں عوضِ قطرہ ہائے آب"

۳۴

۱ہوس نعمت کی بعدِ مرگ بھی رہتی ہے انساں کو
لحد میں پاس رکھ دیتے ہیں دور افتادہ دنداں کو
جلا دیتی ہے اپنی گرم رفتاری بیاباں کو
کھٹکتے ہیں ہمارے آبلے خارِ مغیلاں کو
بہار آئی ہے دیوانو ! چلو سیرِ بیاباں کو
گریباں پھاڑنے پر باندھو اپنے اپنے داماں کو
نہ اٹھ کر دربدر ہو ، کنجِ عزلت میں جو بیٹھا ہے
دہن سے چھوٹ کر بے قدر دیکھا ہم نے دنداں کو
روا ہے عاشقوں کی ، اپنے معشوقوں کو دل داری
محبت سے محبت ہوتی ہے انساں سے انساں کو
مٹھائی کھائی تو شکرِ لبِ شیریں کیا پہروں
پیا پانی تو دی ہم نے دعا چاہِ زنخداں کو
فراقِ دوست کا صدمہ نہ ہو دشمن کے دل کو بھی
محبت ہو اسے بھی جس سے الفت ہووے انساں کو
کبھی جو ہاتھ اس محبوب کی ٹھڈی میں ڈالا ہے
کہا ہے توڑ تو لو گے نہ تم سیبِ زنخداں کو
ترا منہ دیکھ کر پڑھتا ہوں سورہ قل ہو اللہ کا
مسلماں ہوں ، بجا لاتا ہوں میں تعظیمِ قرآں کو
ہر اک حلقے میں ہو سو سو دلِ عاشق کی گنجائش
خدا جمعیّتِ خاطر دے اس زلفِ پریشاں کو

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۴۸ ، نول کشور قدیم ص ۱۳۶ ، جدید ص ۲۱۶ ، بہارستان سخن ص ۱۶۱ -

نہیں تیرے کرم کو قید کچھ اعلیٰ و ادنیٰ کی
سکندر تشنہ رہ جاوے ، پیے خضر آبِ حیواں کو
تری درگاہ کے ذروں سے ہے جب سامنا ہوتا
حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں مہرِ تاباں کو
دلِ دیوانہ کو میرے پھنسا کر تم نے زلفوں میں
دکھایا خانۂ زنجیر میں مجنوں سے مہماں کو
نگاہوں کا اُن آنکھوں کی ہے ترچھا پن وہی اب تک
وہی کاوش ، وہی دل سے خلش رہتا ہے مژگاں کو
فغاں کرتا ہوں جب اندام میں رعشہ سا ہوتا ہے
دلِ دیوانہ کا نالہ ہلا دیتا ہے زنداں کو
فراقِ یار میں گریے کا ضبط آتش نہیں بہتر
بخارِ دل نکلنے دو ، برس لینے دو باراں کو

۳۵

[1]کریں گے جمع معنی فہم اجزائے پریشاں کو
شکنجے میں بہت کھینچیں گے صحّاف اپنے دیواں کو
فقیری سلطنت ہے خاکسارِ کوے جاناں کو
مبارک جام ہو جمشید کو ، خاتم سلیماں[۴] کو
[2]مذاق اس کو ہے جو چوسے لبِ شیرینِ جاناں کو
دماغ اُس کا ہے جو سونگھے کسی سیبِ زنخداں کو

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۴۸ ، نول کشور قدیم ص ۱۳۷ ، جدید ص ۲۱۷ -

۲ - غالب کا شعر بھی زیر نظر رکھیے :

نیند اس کی ہے ، دماغ اس کا ہے ، راتیں اس کی ہیں
جس کے کاندھے پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں

خمِ ابروے قاتل پھر گیا ہے اپنی آنکھوں میں
لیا ہے بوسہ، دیکھا ہے جو ہم نے تیغِ عریاں کو

تمھارے چہرۂ پُر نور کے بےداغ ہونے نے
نظر سے اپنی آنکھوں کے گرایا ماہِ تاباں کو

ہوا ہے یار جو سیرِ چمن میں ساتھ اپنے
کبھی گل کی طرف دیکھا ہے، گاہے روے خنداں کو

غمِ الفت کو کتنا ہی نگلیے، دل نہیں بھرتا
یہ وہ نعمت ہے بھوکا رکھتی ہے جو اپنے مہماں کو

آنکھی سے جوہری فریاد کرنے ان کی آتے ہیں
ہسے جاتے ہیں موتی[1]، پیستے ہیں جب وہ دنداں کو

محبّت کی نگہ سے لطف ہر اک رنگ میں پایا
تماشا تھا جو دیکھا چشمِ بلبل سے گلستاں کو

جنوں کے جوش میں کرتا ہوں کارِ سیل میں مجنوں
نکل جاتا ہوں صحرا، توڑ کر دیوارِ زنداں کو

کیے ہیں کافر و دیں‌دار ان زلفوں نے سودائی
ہوئے ہیں جان کا جنجال ہندو و مسلماں کو

کبھی دل کھول کر رویا جو ہوں شوقِ شہادت میں
کیا ہے حلق بسمل، خونِ دل سے چشمِ گریاں کو

جنوں کے جوش میں ایسا گلے کو اپنے گھونٹا ہے
حکومت ہو تو دلوا دیجیے پھانسی گریباں کو

شبِ وصلت میں بوسے لے کے اس روے کتابی کے
جبیں سے تا زنخداں ختم کر دیتا ہوں قرآں کو

---

۱ - علی بخش: "پسے جاتے ہیں ہیرے۔"

خیال آتا ہے صحرا کا جو شب کو جوشِ وحشت میں
بناتا ہوں فتیلہ پھاڑ کر میں جیب و داماں کو

دو روزہ نوجوانی ہے ، دو روزہ تاج داری ہے
مروت حسن کو اللہ دے ، انصاف سلطاں کو

منور کر جمال و حسن کے نظارے سے آنکھیں
الٰہی بھیج دے گھر میں مرے یوسف سے مہماں کو

ترا مجروح مثلِ ارغواں ہوتا جو گلشن میں
گلِ خنداں کو شرماتا دکھا کر زخمِ خنداں کو

تمہارا حسن اپنے جوہرِ حکمت کرے ظاہر
شفا بیمار پائیں ، سونگھ کر سیبِ زنخداں کو

زہے اقبالِ سیم و زر ، زہے عزّ و شرف آتش
تمام آرائشوں میں سے چنا اس رخ نے افشاں کو

۳۶

ہنسنا[1] ہی خوش آیا ، نہ تو رونا مرے دل کو
میٹھا ہی نہ بھایا ، نہ سلونا مرے دل کو

اکسیر سے بہتر ہے درِ یار کی مٹّی
منظور نہ چاندی ہے ، نہ سونا مرے دل کو

تا صبح تجھے یاد کیا ، مجھ کو جگا کر
بھولا نہ ترے ساتھ کا سونا مرے دل کو

بے وجہ رلاتا نہیں دکھلا کے رخِ یار
آنکھوں کو ہے ساتھ اپنے ڈبونا مرے دل کو

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۴۹ ، نول کشور قدیم ص ۱۳۷ ، جدید ص ۲۱۸ - سراپا سخن ص ۲۸۸ میں دس شعر ہیں -

بس ہو تو ابھی چیر کے پہلو کو نکل جائے
رکھتا ہے بہت تنگ یہ کونا مرے دل کو

یوسف سے حسیں ہووے کوئی طفل تو چاہوں[1]
کچھ کھیل نہیں جان کا کھونا مرے دل کو

بازیچۂ ہستی میں وہ مجنونِ پری ہوں
اطفال سمجھتے ہیں کھلونا مرے دل کو

پہلو میں نہیں جب سے کہ وہ غیرتِ لالہ
داغ اوڑھنا ہے ، داغ بچھونا مرے دل کو

نالوں سے نہ اظہار ہو بے تابیِ جاں کا
رسوائی ہے اس دکھڑے کا رونا مرے دل کو

نظّارہ کیا کیں وہ ، یہ دیدار کو ترسا
دن رات رہا آنکھوں کا رونا مرے دل کو

کانٹا سا کھٹک جاتا ہے جب یاد ہے آتا
بالی میں ترا پھول پرونا ، مرے دل کو

خالِ سیہِ یار کا نقش آفتِ جاں ہے
اچّھا نہیں اس تخم کا بونا مرے دل کو

انکار ترے قد کی قیامت کا نہ ہوگا
مومن ہوں میں ، کافر نہیں ہونا مرے دل کو

تر گریۂ شادی سے رہوں گا میں شبِ وصل
بے فصل کے منہ میں ہے بھگونا مرے دل کو

گل سے جو سحر قطرۂ شبنم ہیں ٹپکتے
یاد آتا ہے منہ کا ترے دھونا مرے دل کو

---

۱ - سراپا سخن میں ''طفل تو چاہے ۔''

کچھ خاک آڑانے سے نہیں ملنے کا آتش
بیکار یہ مٹی کا ہے ڈھونا مرے دل کو

۳۷

انکلتی کس طرح ہے جانِ مضطر دیکھتے جاؤ
ہمارے پاس سے جاؤ تو پھر کر دیکھتے جاؤ

نسیمِ نوبہاری کی طرح آئے ہو گلشن میں
تماشاے گل و سرو و صنوبر دیکھتے جاؤ

جدھر جاتے ہو، ہر گھر میں سے یہ آواز آتی ہے
مسیحا ہو، جو بیماروں کو دم بھر دیکھتے جاؤ

قدم انداز سے باہر ہوئے جاتے ہیں صاحب کے
ستم رفتار میں کرتی ہے ٹھوکر، دیکھتے جاؤ

ملیں وہ راہ میں اب کی تو کہتا ہوں جو ہو سو ہو
دکھا دو گھر مجھے اپنا، مرا گھر دیکھتے جاؤ

خرامِ ناز میں عاشق سے ہو اس کا اشارہ بھی
کچھ اپنی تیغِ ابرو کے بھی جوہر دیکھتے جاؤ

روش مستانہ چلتے ہو، قدم مستانہ پڑتے ہیں
خدا کے واسطے، بہرِ پیمبر دیکھتے جاؤ

کوئی ان سے کہے منہ پھیر کر جو قتل کرتے ہو
تڑپتا ہے تمہارا کشتہ کیوں کر، دیکھتے جاؤ

نگاہِ لطف کا شائق ہے تحت و فوق کا عالم
کبھی نیچی نظر ہو، گاہ اوپر دیکھتے جاؤ

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۵۰، نول کشور قدیم ص ۱۳۸، جدید ص ۲۱۹ -

کبھی ہل جاتے ہیں ابرو، کبھی جنبش ہے مژگاں کو
دکھاتے ہو ہمیں شمشیر و خنجر، دیکھتے جاؤ
نقاب اک دن الٹ کر تم نے یہ منہ سے نہ فرمایا
جمال آفتاب ذرّہ پرور دیکھتے جاؤ
نہ پھیرو اس سے منہ آتش جو کچھ درپیش آجائے
دکھاتا ہے جو آنکھوں کو مقدّر، دیکھتے جاؤ

۳۸

رخ[1] ہو، خط رخسار سے کیا کام ہے ہم کو
گل سے ہے غرض، خار سے کیا کام ہے ہم کو
مطلب ہے رخ صاف سے، خط سے نہیں مطلب
آئینہ ہو، زنگار سے کیا کام ہے ہم کو
گلزار ترا تجھ کو مبارک رہے بلبل
بلبل ترے گلزار سے کیا کام ہے ہم کو
دیوانے ہیں، صحرائے جنوں خیز محل ہے
بام و در و دیوار سے کیا کام ہے ہم کو
خواہاں سے ترے رشک ہے اے غیرت یوسف
یوسف کے خریدار سے کیا کام ہے ہم کو
کافی ہے ہمارے لیے دل ہی کا اشارہ
رمّال سے جفّار سے کیا کام ہے ہم کو
جب جوش جنوں نے ہمیں گھر ہی سے نکالا
پھر سایۂ دیوار سے کیا کام ہے ہم کو

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۶۸، نول کشور قدیم ص ۲۸۲، جدید ص ۳۸۳ - دیوان دوم ردیف 'و' میں انھی دو غزلوں کا اضافہ ہوا -

اللہ ہے مشکل میں مددگار ہمارا
اعوان سے ، انصار سے کیا کام ہے ہم کو [1]
'مرتا ہوں' جو کہتا ہوں ، تو کہتے ہیں وہ ہنس کر
"عیسیٰ نہیں ، بیمار سے کیا کام ہے ہم کو"

۳۹

حسرتِ شادی نہیں جانِ غم آلود کو
لالہ سمجھتا ہے دل داغِ نمک سود کو
داغِ غمِ عشق کو دل میں جگہ دیجیے
ڈھونڈھیے لے کر چراغ شاہدِ مقصود کو
لعلِ شکربار کے بوسے میں کیوں کر نہ لوں
کوئی نہیں چھوڑتا حلوۂ بے دود کو
پردۂ غفلت اٹھا ، پیشِ نظر یار ہے
دیر و حرم میں نہ جا ڈھونڈھنے موجود کو
سجدے کے انکار سے فوق نہ ہو جائے گا
خاکیِ مقبول پر ناریِ مردود کو
صبح تھی شب ہجر کی ، نالہ کیا جس گھڑی
ایک شرارہ ہے بس تودۂ بارود کو
سینۂ بےمعرفت حلقے میں اپنے نہیں
رہ نہیں اس بزم میں مجمرِ بے عود کو
صاحبِ اقبال کو خوب ہے پہچانتا
آنکھ خدا نے ہے دی کوکبِ مسعود کو

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۶۸ ،نولکشور قدیم ص ۲۴۳ ، جدید ص ۳۸۳۔

طائرِ دل ہو گیا بستۂ زلفِ ایاز
بندہ کیا حسن کا ، عشق نے محمود کو

خاک سے بھریے اسے ، چاہ جو بے آب ہو
آگ لگا دیجیے مطبخِ بے دود کو

جھاڑ دیے مغز سے[1] ، کبر کے کیڑے جو تھے
خاک برابر کیا پشّے نے نمرود کو

یاد الٰہی میں جو نعرۂ "یا ھو" کیا
بھول گئے وحش و طیر نغمۂ داؤد کو

ہجر کی ایذا سے چھٹ ، دل کو جلا بہرِ وصل
داغ کے اچّھا کر اس زخمِ نمک سود کو

راہ کی آفات کا کیجیو آتش بیاں
سامنے آئے تو دے منزلِ مقصود کو

* * *

---

۱ - علی بخش : "جھاڑ ڈالے مغز کے کبر کے کیڑے جو تھے ۔"

ردیف ہائے ہوز

۱

[1]ہے نرالی کششِ عشقِ جفاکار کی راہ
چاہِ کنعاں میں ملی مصر کے بازار کی راہ

رہ نما یادِ الٰہی کا ہوا عشقِ صنم
پہنچے ہم کعبۂ مقصود کو کہسار کی راہ

کثرتِ شوق نے از بسکہ کیا عرصہ تنگ
مردہ نکلا نہ مرا کوچۂ دل دار کی راہ

شہرۂ حسن نے دیدار کا مشتاق کیا
نکہتِ گل نے بتائی مجھے گلزار کی راہ

پیشتر سب سے کیا طالعِ بد نے بیدار
حشر کے روز بھی دکھلائی مجھے یار کی راہ

تنگ دستی نے زمانے میں یہ پایا ہے رواج
یوسف اس عہد میں تکتا ہے خریدار کی راہ

نہیں مجھ سا کوئی دنیا میں سکندر طالع
آئنہ رو نے مجھے قتل کیا پیار کی راہ

لبِ بام آ کے جو دیدار کرے عام وہ شوخ
ایک ہو جائے ابھی کافر و دیں دار کی راہ

پیار سے کہتے ہیں ان کو جو 'مسیحا' عاشق
ناز سے چلتے نہیں خانۂ بیمار کی راہ

---

۱ - کلیات ، دیوان اول ، طبع علی بخش ص ۱۵۰ ، نول کشور قدیم ص ۱۳۸
جدید ص ۱۱۹ -

دیکھ کر صورتِ احباب کو پھر جاتا ہے
کج ادائی سے ہے الٹی ترے رخسار کی راہ
زلفِ مشکیں کے جو سودے میں ہے دل گھبراتا
پوچھتا پھرتا ہوں ایک ایک سے تاتار کی راہ
حسن کے عشق نے ہستی میں عدم سے کھینچا
شوقِ یوسف نے دکھائی ہمیں بازار کی راہ
کھینچ لی ہے تو لگانے میں تامّل نہ کرو
کھوٹی ہوتی ہے میاں آپ کی تلوار کی راہ
عید ہوگی ، رمضاں جائے گا ، اے بادہ کشو !
بند رہنے کی نہیں خانۂ خمّار کی راہ
غیرِ حق کو میں سمجھتا ہوں خیالِ باطل
آتش اک دل میں نہیں ہوتی ہے دوچار کی راہ

۲

[1]دیکھا ہے سبو کو جو دھرے سر کے تلے ہاتھ
[2]یاد آیا ہے ساقی کا وہ ساغر کے تلے ہاتھ
دامن کا خیال آتا ہے جب جیب دری میں
دیوانوں کے ہو جاتے ہیں اوپر کے تلے ہاتھ
دل دوستیِ بت کا نہ پابند ہو یا رب !
دشمن کا بھی دب جائے نہ پتّھر کے تلے ہاتھ
گرمی نہ تمھاری سی ہوئی آتشِ گل سے
گلچیں کا نہ رکھا کبھی اخگر کے تلے ہاتھ

---

۱ ۔ کلیات طبع علی بخش ص ۱۵۰ ، نول کشور قدیم ص ۱۳۹ ، جدید ص ۳۲۰ ۔ سراپا سخن ص ۱۸۶ میں چھ شعر انتخاب ہیں ۔
۲ ۔ علی بخش : ''یاد آتا ہے ۔''

یاد آتا ہے وہ قدِ کشیدہ جو چمن میں
مَلتا ہوں میں جا جا کے صنوبر کے تلے ہاتھ

تبدیل شبِ وصل سے ہو روزِ جدائی
بالش کے عوض ہو سرِ دلبر کے تلے ہاتھ

عاشق سے نگاہوں میں یہ کہتی ہیں وہ آنکھیں
مژگاں جو چھوئیں ، رکھ دیا خنجر کے تلے ہاتھ

مستی میں طلب‌گار تو ساقی سے ہے مے کا
کاٹوں گا میں کانپے گا جو ساغر کے تلے ہاتھ

صحرا کو چلو ، چاک گریباں کرو آتش
[1]لنگر میں نہ ہیں پاؤں ، نہ پتھر کے تلے ہاتھ

۳

[2]اس قدر دل کو نہ کر اے بتِ سفاک سیاہ
زیب دیتی نہیں اس کعبے کو پوشاک سیاہ

میلِ تزئیں جو تری نرگسِ فتاں کو ہوا
طُور کو واسطے سرمے کے کیا خاک سیاہ

پانی مانگے نہ کبھی ترچھی نگہ کا مارا
دلِ کافر سے ہے چشمِ بتِ بےباک سیاہ

یار سے وعدۂ فردا ہے عجب کیا اس کا
روزِ روشن کو کرے گردشِ افلاک سیاہ

---

۱ - سراپا سخن :

"لنگر ہے نہ پاؤں میں نہ پتھر کے تلے ہاتھ"

لنگر : وہ بھاری وزن جو قید میں قیدی کے باندھا جاتا ہے ۔

۲ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۵۱ ، نول کشور قدیم ص ۱۳۹ ، جدید ص ۳۲۰ ۔

کسی حالت میں نہ ظاہر ہو جو ہو اصل نجس
سرخ ہو یا کہ ہو رنگِ سگِ ناپاک سیاہ
نہ ہوا شانہ گیسو ، نہ تو دستار کا گل
بخت رکھتا ہے ہمارا دلِ صد چاک سیاہ
نظر آیا ادھر آنکھوں سے ، آدھر غائب تھا
اسپِ مشکیں ہے ترا آہوے چالاک سیاہ
کون سے باغ میں لاتی ہے مجھے شامتِ بخت
گل سیہ ، بوٹے سیہ ، سرو سیہ ، تاک سیاہ
نگہِ بد سے تجھے دیکھے تو اے عالمِ نور
کوئلے سے ہو سوا روئے ہوس ناک سیاہ
کون سا صیدِ زبوں صید فگن نے باندھا
خونِ فاسد نے کیا کس کے یہ فتراک سیاہ
جس بیاباں میں لگی نالہ آتش سے 'اوں'[1]
کوسوں تک ہوگئے جل کر خس و خاشاک سیاہ

۴

[2]سرخ مہندی سے نہیں اس بتِ خوں خوار کے ہاتھ
دست آویز مرے خوں کی لگی یار کے ہاتھ
بندگی کی یہ تمنّا ہے ، کوئی لے جو ہمیں
بکتے ہیں کوڑیوں کے مول خریدار کے ہاتھ
نیم جاں دل ہے طلب گارِ سلوکِ شمشیر
آبرو اپنی ہے اب ابروے خم دار کے ہاتھ

---

۱ - علی بخش : "آتش سے دوں" - تصحیح از نسخِ دیگر -
۲ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۵۱ ، نول کشور قدیم ص ۱۲۹ ، جدید ص ۲۲۱ ، سراپا سخن ص ۱۷۳ -

حقِّ خدمت میں نہیں کوئی کمی کی ہم نے
جاں فشانی کا اب انصاف ہے سرکار کے ہاتھ

پاؤں کو ان کے چھؤا میں نے تو ہنس کر بولے
کاٹے جاتے ہیں تو ایسے ہی گنہ گار کے ہاتھ

نہیں بےوجہ یہ ابرو سے اشارے ان کے
عشق بازوں کو بتاتے ہیں وہ[1] تلوار کے ہاتھ

زر سا محبوب ستم‌گار نہیں اس کے لیے
بیچتے سر کو جواں مرد ہیں سردار کے ہاتھ

روے زیبا نہ دکھایا کریں ہر ایک کو آپ
قدر اس شے کی نہیں جو گئی دو چار کے ہاتھ

توڑ لے اے شجرِ حسن لبوں کے عنّاب
ضعف رکھے جو نہ باندھے ترے بیمار کے ہاتھ

کام جس کا ہے اسی سے ہے تعلّق رکھتا
پاؤں کی طرح سے زیبا نہیں رفتار کے ہاتھ

وعدۂ وصل کی شادی سے فنا دم ہوگا
قتل کر ہاتھ پر اپنے نہ صنم[2] مار کے ہاتھ

نہ جلائے، نہ تو گاڑے کوئی ہم کو آتش
مردہ اپنا نہ پڑے کافر و دیں دار کے ہاتھ

---

۱ - کلیات کے پیش نظر نسخوں میں ''یہ تلوار'' ہے لیکن سراپا سخن میں ''وہ تلوار'' ہے -

۲ - علی بخش : ''نہ صنم یار کے ہاتھ -''

۵

پاس دل رکھتا ہے منظورِ نظر ہر آئنہ
نیک و بد سے پیش آتا ہے برابر آئنہ

جب نہ تب چڑھتا ہے اُس قاتل کے منہ پر آئنہ
ٹکڑے ٹکڑے ہوئے گا اک دن مقرّر آئنہ

چاند سے مکھڑے کو دکھلا کر چھپانا قہر ہے
اُس خدا ناترس کو دکھلاؤں کیوں کر آئنہ

چاند کے اوپر نہیں پڑتی کسی صورت سے خاک
منہ تو دیکھیں لے کے یوسف کے برادر آئنہ

دیکھ کر حالِ زبوں کو میرے حیران رہ گیا
یار کے دل سے بھی تھا ہرچند پتّھر آئنہ

ہو کے اُس شمشیر ابرو کے مقابل بچ چکا
ایسا کیا پہنے ہوئے ہے خود و بکتر آئنہ

آنکھ بھر کر ایک دن دیکھا نہ روئے صافِ یار
میں وہ مفلس ہوں ، نہیں جس کو میسر آئینہ

موردِ نفرت کوئی مجھ سا نہیں ، حیران ہوں
مجھ سے صورت آشنا ہوتا ہے کیوں کر آئنہ

روبروئے یار ہوتے ہی زباں ہوتی ہے بند
کس طرح طوطی کو کرتا ہے سخن‌ور آئنہ

اب زمیں پر پاؤں بھی رکھ کر نہیں چلتا ہے یار
کر چکا آراستہ اس کو مقرّر آئنہ

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۵۱ ، نولکشور قدیم ص ۱۴۰ ، جدید ص ۲۲۱ -

یہ نہیں بے وجہ اے قمری اکڑنا سرو کا
آب جو اس کو دکھاتی ہے مقرر آئنہ
ہرزہ گوئی سے تری حیرت ہوئی آتش خموش
خود پسندی تا کجا ، اب طاق پر دھر آئنہ

٦

معشوق نہیں کوئی حسیں تم سے زیادہ[1]
مشتاق ہیں کس ماہ کے انجم سے زیادہ
کیا کہیے ترے عاشقِ بےتاب ہیں کتنے
ذروں سے زیادہ ہیں یہ انجم سے زیادہ
کملی مری پشمینے سے رکھتی ہے مجھے گرم
سنجاب سے افزوں ہے ، یہ قاقم سے زیادہ
سیلاب کا کام اشک کریں خانۂ تن میں
ان چشموں میں بھی جوش ہے قلزم سے زیادہ
لنگ ابلقِ ایّام نہ ہو مار کے ٹھوکر
ہے سخت مرا کاسۂ سر ، سم سے زیادہ
اندھیر ہے ، دل پستے ہیں سرمے کی طرح سے
آنکھیں نہ لڑایا کرو مردم سے زیادہ
ہے خانۂ اُلفت میں نہیں جائے تنک ظرف
کس جام میں یاں نشہ نہیں خم سے زیادہ

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۵۲ ، نول کشور قدیم ص ۱۴۰ ، جدید ص ۲۲۳ ، بہارستانِ سخن ص ۱۸۰ - اس زمین میں ناسخ کا یہ مقطع خوب ہے :

معشوق سے امیدِ وفا رکھتے ہو ناسخ ؟
نادان نہیں دنیا میں کوئی تم سے زیادہ

منظورِ نظر ہے دلِ بلبل کا دکھانا
شوق ان دنوں اس گل کو ہے گلدم سے زیادہ
صوفی جو سنے نالۂ موزوں کو ہمارے
حالت ہو مغنّی کے ترنّم سے زیادہ
ٹھوکر ہے تری صاحبِ اعجازِ مسیحا
نالہ تری خلخال کا ہے "قُم" سے زیادہ
آئینے میں دیکھا ہے جو منہ چاند سا اپنا
خود گم ہے وہ بت، عاشقِ خود گم سے زیادہ
فائق ہو غضب پر کرم اس بت کا الٰہی
"اِجلس[1]" وہ دل آرام کہے "قُم" سے زیادہ
دشمن ہیں مرے خورد و کلاں عشق میں تیرے
موذی ہوئے ہیں افعی و کژدم سے زیادہ
حسرت کی نگاہوں سے عیاں حال ہے میرا
گویا ہوں خموشی میں تکلّم سے زیادہ
بجلی کو جلا دیں گے وہ لب دانت دکھا کر
شغل آج کل ان کو ہے تبسّم سے زیادہ
کہتا ہے وہ شوخ آئنے میں عکس سے آتش
تم ہم سے زیادہ ہو تو ہم تم سے زیادہ [2]

۷

مرد آلودہ نہ ہوں دنیائے بازی گر کے ساتھ
کب وفاداری زنِ قحبہ نے کی شوہر کے ساتھ

---

۱ - اجلس : بیٹھیے - قُم : کھڑے ہو جائیے ، نکل جائیے -
۲ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۵۲ ، نول کشور قدیم ص ۱۴۰ ، جدید ص ۲۲۳ -

منزلِ مقصود کا سودا ہے اپنے سر کے ساتھ
گردِ رہ کی طرح لپٹے جاتے ہیں رہبر کے ساتھ
چل سکیں گے کبک کیا اُس فتنہٗ محشر کے ساتھ
کوہ مثلِ کاہ اڑتے پھرتے ہیں ٹھوکر کے ساتھ
حلقہٗ دیوانگاں ہے اُس پری پیکر کے ساتھ
اس طرح، اصحاب ہوں جس طرح پیغمبر کے ساتھ
دیکھتا ہوں حسن کے عالم کو میں زیور کے ساتھ
مجھ کو بھاتی ہے بنا گوشِ صنم گوہر کے ساتھ
میکشِ عاشق مزاج اے ساقیِ مہرو ہوں میں
بوسہٗ لب کی گزک بھی دے مجھے ساغر کے ساتھ
سبزہٗ خط کو دکھا کر تو نے مارا ہے جنھیں
حشر اُن لوگوں کا ہوگا خضر پیغمبر کے ساتھ
پر کترتا ہے مرے صیّاد تو کاٹ اس طرح
حسرتِ پرواز بھی اڑ جائے بال و پر کے ساتھ
جوہراس کے اک دن اے سفّاک اس پر کھول دے
لاگ رکھتی ہے مری گردن ترے خنجر کے ساتھ
مومن و کافر کا قاتل ہے ترا حسنِ شباب
آتشِ افروختہ یکساں ہے خشک و تر کے ساتھ
اس قدر شیریں دہن اے دلربا ہوتا نہیں
شیر دایہ نے پلایا ہے مجھے شکّر کے ساتھ
جس قدر نفرت ہے اس سے مجھ توکل پیشہ کو
اس قدر ہوگی نہ قاروں کو محبّت زر کے ساتھ
یہ اشارہ جنبشِ مژگاں سے اس گل رُو کے ہے
دم نکل جاتا ہے سودائی کا اس نشتر کے ساتھ

قدر دیوانے کی ہے ہنگامۂ طفلاں نہیں
چاہیے سالارِ لشکر کو ، رہے لشکر کے ساتھ
صورت آبادِ جہاں کے حسن کا شیدا نہ ہو
صندل اس بت خانے میں ملتا ہے دردِ سر کے ساتھ
جب رلاتا ہے تصوّر تیرے دانتوں کا مجھے
تولتا ہوں اشک کے قطروں کو میں گوہر کے ساتھ
ہمرہی کا جو کبھی ہوتا ہے آتش اتّفاق
خضرِ صحرا گرد دیتا ہے مرا مرمر کے ساتھ

٨

[1]اونچا ہو لاکھ تاڑ سے بھی سرو چار ہاتھ
رتبہ بلند ہے ترے قد کا ہزار ہاتھ
کھاتے ہیں غوطے رہگزرِ کوئے یار میں
رہتا ہے میرے اشکوں سے تیراؤ چار ہاتھ
دامن چھڑا کے جب سے گیا ہے وہ بے وفا
دانتوں سے کاٹتا ہوں میں بے اختیار ہاتھ
دو کو کمر میں ، دو تری گردن میں ڈالتا
دیتا جو اے صنم ! مجھے[2] اللہ چار ہاتھ
دوں گا سزا میں تارِ گریباں سے باندھ کر
رازِ جنوں کریں گے اگر آشکار ہاتھ

---

١ - کلیات طبع علی بخش ص ١٥٣ ، نول کشور قدیم ص ١٣١ ، جدید ص ٢٢٣ - آخری غزل دیوان اول - سراپا سخن صفحہ ١٧٧ میں بارہ شعر ہیں -

٢ - علی بخش : ”مرے اللہ -“

دیوانے منتظر ہیں نسیمِ بہار کے
کپڑوں کے پھاڑنے کے ہیں اُمّیدوار ہاتھ
رخسارۂ صنم سے اُلٹ کر نقاب کو
دکھلا رہی ہے قدرتِ پروردگار ہاتھ
چپتّی شبِ وصال سحر تک کیا کیے
پائے حبیبؔ کے رہے خدمت گزار ہاتھ
صید افگنی کا لطف دکھاتا ہے دامِ فکر
مضموں کو جانتے ہیں ہم آیا شکار ہاتھ
چھلّے جڑاؤ رکھتے ہیں وہ پور پور میں
دکھلا رہے ہیں ہم کو جواہر نگار ہاتھ
کہتا ہوں دستِ قاتلِ بے رحم چوم کر
وقتِ عطائے رحمتِ پروردگار ہاتھ
نعمت وہ تیرے خوانِ کرم کی ہے بے حساب
خالی نہ کر سکیں جسے ہژدہ ہزار ہاتھ
کھجلائی پیٹھ اس کی تو بولا وہ گل بدن
ہو جائے[1] خشک ہوکے ترا پشت خار ہاتھ
کیفیّتِ حیات ہے پیری میں میرہاں
لبریزِ جامِ روح ہے تن ، رعشہ دار ہاتھ
زنجیر کو بہار میں توڑا ، نہ طوق کو
گردن سے اور پاؤں سے ہیں[2] شرمسار ہاتھ

---

١ - سراپا سخن : ''ہو جائیں خشک ۔''

٢ - جدید ایڈیشنوں میں : ''پاؤں سے ہے ۔''

[1]منھدی لگا کے قتل جو مجھ کو نہیں کیا
غیرت کے مارے مَلتا ہے حسرت سے یار ہاتھ
چاہے جو ہم نشینی کے حق کو ادا کرے
آتش ہو پار توڑ کے گل چیں کا خار ہاتھ

۹

[2]ظاہر کسی کے دل کو ہو کیا خار خار کچھ
سنتا نہیں وہ گل کہے کوئی ہزار کچھ
توفیقِ خیر رکھتی ہے جو تیغِ یار کچھ
زخم اتنے کھاوے گا نہ رہے گا شمار کچھ
پوچھی کسی نے محکمۂ حشر میں نہ بات
ٹھہرے نہ ہم حساب میں روزِ شمار کچھ

۱۰

[3]خوب آگاہ ہے نظّارے کے دستور سے آنکھ
یہ شگوفہ ہے لڑاتا شجرِ طُور سے آنکھ

---

۱ - سراپا سخن میں یہ شعر مقطع ہے:
آتش کو قتل مَل کے جو منھدی نہیں کیا
غیرت کے مارے مَلتا ہے حسرت سے یار ہاتھ
نول کشور جدید اور لاہوری نسخے میں ہے: ''منہ ہی لگا کے ۔''
۲ - کلیات (دیوان دوم) طبع علی بخش ص ۲٦۹ ، نول کشور قدیم ص ۲۴۳ ، جدید ص ۳۸۴ ۔
۳ - کلیات طبع علی بخش ص ۲٦۹ ، سراپا سخن ص ٦۵ ، کلیات طبع نولکشور میں یہ غزلیں موجود نہیں ہیں ۔

[1]نہ دبی یار کی میرے پری و حور سے آنکھ
نہ جلی نار سے ، جھپکی نہ کبھی نور سے آنکھ
[2]کیا کریں سامنے وہ عاشقِ رنجور سے آنکھ
فعل مختار ملاتے نہیں مجبور سے آنکھ
اثرِ عشق ہے پیری میں بھی اتنا باقی
دیکھ لیتی ہے حسینوں کی طرف دور سے آنکھ
لالہ رو عشق میں تیرے ہے یہی اپنی دعا
داغِ دل کی نہ دبے مرہمِ کافور سے آنکھ
عشق ہے حسن سے کس پردہ نشیں کے تجھ کو
واقف اب تک نہیں اے دل ترے منظور سے آنکھ
پھر نہیں سکتی چھری شرم و حیا پر ان سے
لال کرتے نہیں وہ بادۂ انگور سے آنکھ
غم نہ کھا رزق کا ، گو کور ہو ، گو لنگ ہو تو
پھیرتا خواجہ نہیں بندۂ معذور سے آنکھ
مُردنی چھائی ہے منہ پر ، ہے کفن یاد آیا
جب کبھی ہو گئی ہے سامنے کافور سے آنکھ
کیا توقّع ہو بھلا ان سے ہم‌آغوشی کی
پاس کب آئے وہ دکھلاتے ہیں جو دور سے آنکھ
روزِ روشن سے ہے روشن رخِ نورانیِ یار
فوق ظلمت میں ہے رکھتی شبِ دیجور سے آنکھ

---

۱ - سراپا سخن میں ہے : ''نہ کبھی نار سے جھپکی نہ کبھی ۔''

۲ - شعر نمبر ۳ ، ٦ ، ۷ ، ۹ ، ۱۲ ، ۱۴ ، ۱۷ ، ۲۰ سراپا سخن میں نہیں ہیں ۔

تو توجہ جو نہ فرمائے تو اندھیر ہے پھر
دل ہے روشن ترے دم سے ، تو ترے نور سے آنکھ
ڈر یہی ہے مجھے ، احول نہ کہیں ہو جاؤ
ٹیڑھی رکھتے ہو بہت عاشقِ رنجور سے آنکھ
چار سُو یار کو ڈھونڈھے گی تری خاطر سے
تجھ سے اے دل نہیں باہر کبھی مقدور سے آنکھ
دار پر بھی مجھے کھینچیں تو اناالحق نہ کہوں
سرخ ہر چند ہو میری مئے منصور سے آنکھ
خون ہو ہو کے شب و روز بہا کرتی ہے
کور ہو جائے گی ہم چشمیِ ناسور سے آنکھ
اس لطافت کی سفیدی و سیاہی ہے عجب
مُشک ہی سے نہ بنی تھی ، نہ تو کافور سے آنکھ
اپنی پازیب کی جھنکار سناؤ مجھ کو
کھولنے کا میں نہیں غلغلۂ صور سے آنکھ
پردہ ناموسِ محبّت کا رہے یا نہ رہے
لڑ گئی اب تو ہے اک شاہدِ مستور سے آنکھ
حشر کے روز وہ دیدارِ خدا دیکھیں گے
نیچی ہوتی نہیں جن کی کسی[1] مغرور سے آنکھ
اور کیا یار کی تعریف کروں اے **آتش**
چہرہ بہتر جو پری سے ہے تو پھر حور سے آنکھ

---

۱ - علی بخش ''کسی مغرور''۔ نولکشور ''بت مغرور۔''

۱۱

[۱]کیوں کر اُن پر پڑے نہ سب کی آنکھ
قد قیامت کا ہے ، غضب کی آنکھ

کیا تلوّن مزاجِ یار میں ہے
صبح کو پھر نہ تھی وہ شب کی آنکھ

تجھ سے قاتل کی شکل دکھلائی
دشمنِ جان و دل تھی کب کی آنکھ

جوہری ہو گئی ہے اِن روزوں
دُرِ دندان و لعلِ لب کی آنکھ

بوسۂ لب میں ان سے کیا مانگوں
تاڑ جاتے ہیں وہ طلب کی آنکھ

تیرے نظّارے کے لیے ہی ہوئے
ماہ و خورشید ، روز و شب کی آنکھ

سامنے کرتی ہیں تجلّی کے
بند اگر ہو گئی تو ڈب کی آنکھ

یوں نگہ اُس ذقن کو ڈھونڈتی ہے
چاہ کو جیسے تشنہ لب کی آنکھ

دیکھ سکتا ہے کون انھیں عریاں
پھوٹ جاتی ہے بے ادب کی آنکھ

یار پیشِ نظر ، نظر آیا
کھل گیا پردہ ، بند جب کی آنکھ

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۷۰ ، نول کشور ندارد - سراپا سخن میں مطلع کا پہلا مصرع یوں ہے : ''کیونکر اس پر پڑے -''

تم نے بے وجہ ہم سے منہ پھیرا
تم نے کج ہم سے بےسبب کی آنکھ
مرض عشق کیا جتاؤں میں
چھپی رہتی کہیں ہے تپ کی آنکھ ؟
بت بے دیں پھرے تو کیا غم ہے
نہ پھرے مجھ سے میرے رب کی آنکھ
آنکھ اس ترک نے نکلوائی
سامنے پھر جو آتش اب کی آنکھ

۱۲

سرمے سے مرے یار کی جادو سے بھری آنکھ[1]
دیوانہ ہوا جس نے کہ دیکھی وہ پری آنکھ
کرتی ہے سر معرکہ ، بیداد گری آنکھ
فی‌الواقعی ہے یار تری ترک جری آنکھ
نیچی نہ کہیں رہتی ہیں قاتل کی گلی میں
روزن سے ملا سکتے نہیں رہ‌گذری آنکھ
پیری میں فنا یاد دلاتی ہے دکھا کر
خورشید لب بام و چراغ سحری آنکھ
یہ شغل ہے دن رات جدائی میں کسی کے
خالی میں کیا کرتا ہوں اشکوں سے بھری آنکھ
دیکھے نگہ بد سے نہ صورت کو کسی کے
اللہ رکھے تجھ کو گناہوں سے بری آنکھ

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۷۰ ، نول کشور ندارد - سراپا سخن ص ۶۴ -
سراپا سخن میں اس غزل کے سترہ میں سے پندرہ شعر نقل ہوئے ہیں -

کس منہ سے زباں اپنی کرے لافِ محبّت
لب خشک ہی رکھتی ہے نہ رکھتی ہے تری آنکھ

او دشمنِ جاں! تجھ کو خبر ہے کہ نہیں ہے
احباب سے کرتی ہے بہت کج نظری آنکھ

سرمہ جو لگایا ہے تو پھر چل کے چمن میں
دکھلائیے اب نرگسِ شہلا کو ذری آنکھ

الفت کا طریقہ ہے زمانے سے نرالا
یاں آتے ہیں رہزن سے لڑاتے سفری آنکھ

روئی یہ، کہ بت اشکوں کے ریلے سے بہائے
کیا کام کیا تو نے، خدا سمجھے اری آنکھ

ہوتے ہیں بہت ظلم و ستم کوئی سمجھائے
موقوف کرے شرم و حیا ان کی ذری آنکھ

بندھوائے دمِ قتل نہ جلّاد سے پٹّے
تلوار سے جھپکی، نہ تو قاتل سے مڑی آنکھ

یوں گور کا رہتا ہے مرے دل میں تصوّر
منزل کی طرف رکھتے ہیں جیسے سفری آنکھ

رو رو کے نہ رسوا کرے دل دوست ہے اس کا
دشمن سے بھی رکھتے نہیں یہ پردہ دری آنکھ

روتا ہوں جو یادِ لبِ لعلیں میں لہو میں
خونابۂ دل سے ہے عقیقِ جگری آنکھ

آتش نظر آتا نہیں یہ ناف کا حلقہ
دکھلا رہی ہے یار کی نازک کمری آنکھ

* * *

ردیف یاے تحتانی

۱

¹خدا یاد آ گیا مجھ کو بتوں کی بےنیازی سے
ملا بامِ حقیقت زینۂ عشقِ مجازی سے
رسائی مصر تک اس کی تو اُس کی عرش تک حد ہے
مہِ کنعاں کو کیا نسبت ہے خورشیدِ حجازی سے
طرح داری کرے گی عاشقوں کو جامے سے باہر
گریباں چاک ہوں گے یار کی دامن درازی سے
برنگِ سبزہ ²روندا ہوں رہِ محبوبِ گلرو میں
یہ پامالی ہے بہتر ، دوجہاں کی سرفرازی سے
صفاے قلب سے زیرِ نگیں ہیں بحر و بر دونوں
ملا رتبہ سکندر کا مجھے آئینہ سازی سے
جبیں ساؤں سے اے بت تیرے کوچے کو بھرار کتنے
نہ دکھلائے خدا اُس کعبے کو خالی نمازی سے
بُھلایا اسمِ اعظم کو فسونِ حسنِ لولی نے
فرشتوں کی حقیقت کھل گئی عشقِ مجازی سے

---

۱ - کلیات (دیوان اول) طبع علی بخش ص ۱۵۳ ، نول کشور قدیم ص ۱۵۳ ، جدید ص ۲۲۴ -

۲ - کلیات علی بخش : ”برنگ سبزہ زندہ تا ہوں رہ محبوب گلرو میں -“

پناہ اے پُر فریبو! قہر سے اللہ کے مانگو
سزا دیتا ہے حاکم آدمی کو قلب سازی[1] سے
ہزاروں کشتیِ تن پار اتری گھاٹ سے اس کے
رہے دریائے خوں جاری تری تیغِ حجازی سے
تنِ محرور کا میرے پڑے اس پر جو پرچھانواں
یقیں ہے موم شرما جائے آہن کی گدازی سے
رہی ہیں بند اک کانِ ملاحت کے تصوّر میں
مزا لوٹا ہے آنکھوں نے مری نظّارہ بازی سے
شب آدینہ بھی آتا نہیں گورِ غریباں پر
ہنوز آگہ نہیں وہ شمع رُو مسکیں نوازی سے
کمیتِ خامہ خوش رفتار ہے کس مرتبہ آتش
قدم میں آگے تُرکی سے رہا، سرپٹ میں تازی سے

۲

[2]گیسوے مُشکیں رُخِ محبوب تک آنے لگے
چشمۂ خورشید میں بھی سانپ لہرانے لگے
دور کروایا پسینے نے نقابِ گل عذار
قطرۂ شبنم بھی دیوارِ چمن ڈھانے لگے
چال لیلیٰ کی کنارِ جو جو وہ خوش قد چلا
بیدِ مجنوں کی طرح سے سرو تھرّانے لگے
لے کے دل کو چار بوسوں پر دیا اک یار نے
ہم نے یہ سمجھا روپے کے ہاتھ چار آنے لگے

---

۱ - قلب سازی : جعلی سکّہ بنانا۔
۲ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۵۴ ، نول کشور قدیم ص ۱۴۲ ، جدید ص ۲۲۵ -

رنگ لائی چہرۂ گل پر نسیمِ نوبہار
اپنی اپنی زمزمہ سنجِ چمن گانے لگے

ظلم مُردوں پر کیا مشقِ خرامِ یار نے
ہر قدم پر کاسہ سر ٹھوکریں کھانے لگے

تُو بھی تو اے شعلہ رُو اک شب اُلٹ منہ سے نقاب
گرد شمعوں کے بہت رہتے ہیں پروانے لگے

کم نہیں کالی گھٹا سے یار کی زلفِ سیاہ
دیکھ لے طاؤس کافر کو تو چلّانے لگے

گاہ مسّی کی دھڑی ہے ، گہ لکھوٹا پان کا
رنگ عاشق سے تمہارے لعلِ لب لانے لگے

نام جس نے عشق کا روے کتابی کے لیا
اس کو زلفوں کے شکنجے میں وہ کھنچوانے لگے

آنکھ پھیری تُو نے جس سے دم فنا اس کا ہوا
مُردے کے آثار زندے میں نظر آنے لگے

مُشک کی بو سونگھ کر اک بددماغی سی ہوئی
یادِ زلفِ یار آئی ، سر کو ٹکرانے لگے

دم فنا کرنے لگی تیری کمر کی جستجو
عاشقِ جاں‌باز ہستی سے عدم جانے لگے

مر بھی جاؤں تو نہ آتش گور پر آئے وہ گل
کام تمکیں کو غرورِ حسن فرمانے لگے

۳

صبر ہرچند ہے سینے کے لیے سِل بھاری
نہ سبک ہو نہ جو سمجھے اُسے غافل بھاری

بوسۂ خال کے سودے میں ہوا ہوں یہ زار
تولیے مجھ سے ، ترازو میں ، تو ہو تِل بھاری

بارِ ہستی نہیں اب مجھ سے سنبھالا جاتا
یا الٰہی ! مجھے سمجھے کوئی قاتل بھاری

حاملِ جسم ہوئی ، روح ہی کا حوصلہ تھا
کوہ ناقہ ہو تو اُس پر ہے یہ محمل بھاری

نہ[2] پھرا دربدر اے دیدۂ معشوق طلب
دستِ ہمّت کو ہے اب کاسۂ سائل بھاری

صورتیں سدِّ رہِ معنی ہیں ، باز آ اُن سے
پھیر کھا کھا کے نہ کر پاؤں کو[3] منزل بھاری

بسکہ تھی کوچۂ جلّاد سے اُلفت مجھ کو
ہوگیا کوہِ گراں سے تنِ بسمل بھاری

فوق مجنوں سے رہے عشق و جنوں میں مجھ کو
اُس کی زنجیروں سے ہوں میری سلاسل بھاری

زور کر توڑ کے جاں ، دل کو اُٹھا دنیا سے
یہ وہ پتّھر ہے ، نہیں جس سے کوئی سل بھاری

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۵۴ ، نولکشور قدیم ص ۱۴۲ ، جدید ص ۲۲۶ ، بہارستان سخن ص ۲۱۸ - نسخۂ نول کشور میں : ''صبر ہرچند ہو'' متن مطابقِ نسخۂ اول -

۲ - نول کشوری نسخوں میں ''نہ پھرا'' ہے - نسخۂ علی بخش میں ''یہ پھرا'' ہے -

۳ - نول کشوری نسخہ ''پاؤں سے'' - علی بخش ''پاؤں کو'' -

نہ آٹھا بھر خدا ناز حسیناں اے دل !
نہیں اٹھ سکنے کا ، یہ بوجھ ہے غافل بھاری
خاک کے پُتلے نے وہ بوجھ لیا گردن پر
کہ سمجھتے تھے جسے عرش کے حامل بھاری
شمع رُو نے مرے آلٹا سر مجلس جو نقاب
ایک پر ایک ہوا ساکنِ محفل بھاری
ناتوانی سے کہاں ہرزہ دوی کی طاقت
گھر سے دروازے تلک ہے مجھے منزل بھاری
بارِ خاطر ہو نہ عالم کا سبک باتوں سے
زندگانی میں نہ ہو مُردے سے غافل بھاری
مجھ سے ہر بات میں قرآن وہ آٹھواتا ہے
گردنِ یار میں شاید ہے حمائل بھاری
ہمرہِ غیر گیا چاندنی کی سیر کو یار
ہوگیا مجھ کو ستارہ ، مہِ کامل بھاری
آتش ان سے نہیں نظّارے کا لپکا چھٹتا
میری آنکھوں کو ہے شاید کہ مرا دل بھاری

۴

[1]واقعہ دل کا جو موزوں ہے تو مضمون غم ہے
صفحہ بر اک مرے دیواں کا صفِ ماتم ہے
خاکساری سے جھکا ہے سرِ شوریدہ مرا
وائے بر حال ! ندامت سے جو گردن خم ہے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۵۵ ، نول کشور قدیم ص ۱۴۳ ، جدید ص ۱۱۶ -

دل میں آتا ہے کہ اب اپنے گلے کو کاٹوں
نیم جاں چھوڑ کے قاتل کو ندامت کم ہے
دل کہیں ، جاں کہیں ، چشم کہیں ، گوش کہیں
اپنے مجموعے کا ہر ایک ورق برہم ہے
کس نے دیکھا ہے محبّت کی نظر سے اُن کو
صفِ مژگاں ہے تلے زلفِ سیہ برہم ہے
دل کو آنکھوں نے کیا کشتۂ رخسارِ ملیح
نہ سمجھتے تھے ہم اس کو کہ نمک بھی سم ہے
کیا کہوں میں کمرِ یار ہے کیسی نازک
عالم الغیب سوا کوئی نہیں محرم ہے
زندگانی سے جو تنگ آکے ہے دل گھبراتا
پوچھنے جاتا ہوں مُردوں سے کہ کیا عالم ہے
کھینچ لاتا ہے جو چل جاتی ہے جذبِ دل کی
منتظر یار کا ہوں ، آنکھوں میں جب تک دم ہے
زلف و رخ کو ہیں حیا سے وہ چھپائے رکھتے
شانہ و آئینہ نا واقف و نا محرم ہے
بام پر جب سے ہے اک رشکِ پری کو دیکھا
روح دیوانۂ سیرِ فلکِ اعظم ہے
وعدۂ شربتِ دیدار ہے بیماروں سے
دم کے دینے کو مسیحا بھی مرا حاتم ہے
دردمندانِ محبّت کا ہے تُو تسکیں بخش
زخمِ فرقت کے لیے وصل ترا مرہم ہے
دلِ عاشق کو نگینے کے عوض جڑواؤ
دستِ معشوق کو زیبا ہے تو یہ خاتم ہے

کوچۂ یار کی حسرت میں ہوں رویا کرتا
شوقِ گلزار میں آنسو نہیں ہے ، شبنم ہے
عاشقوں سے یہ اشارہ ہے تری مژگاں کا
اس صفِ جنگ میں جو کھیت رہا رستم ہے
وصلتِ حور کی حسرت نہ رہے گی آتش
خلد میراث سمجھ اپنی بنی آدم ہے

۵

[۱]خوشا وہ دل کہ ہو جس دل میں آرزو تیری
خوشا دماغ ، جسے تازہ رکھّے بو تیری
یقیں ہے اٹکے گی جاں اپنی آکے گردن میں
سنا ہے ، جا ہے قریبِ رگِ گلو تیری
وہ گل ہوں میں کہ ترا رنگ جس سے ظاہر ہے
وہ غنچہ ہوں کہ بغل میں ہے جس کی بو تیری
پھرے ہیں مشرق و مغرب سے تا جنوب و شمال
تلاش کی ہے صنم ہم نے چار سو تیری
شبِ فراق میں اک دم نہیں قرار آیا
خدا گواہ ہے ، شاہد ہے آرزو تیری
دماغ اپنا بھی اے گل بدن ! معطّر ہے
صبا ہی کے نہیں حصّے میں آئی بو تیری
پڑھا ہے ہم نے بھی قرآں ، قسم ہے قرآں کی !
جواب ہی نہیں رکھتی ہے گفتگو تیری

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۵۵ ، نول کشور قدیم ص ۱۴۳ ، جدید ص ۱۲۷ ، چمنِ بے نظیر ص ۲۰۴ -

مری طرف سے صبا کہیو میرے یوسف سے
نکل چلی ہے بہت پیرہن سے بو تیری
فرشتے بھی تجھے کہتے ہیں بیشتر شاعر
یقیں ہؤا ملک الموت میں ہے خو تیری
یہ گردشِ فلکِ پیر سے ہؤا ثابت
قوی ، ضعیف کو کرتی ہے جستجو تیری
شراب شرم و حیا و حجاب کھووے گی
دکھائے گا ہمیں کیفیتیں سبو تیری
رہا نہ شبہ ہمیں اس کے حلقہ ہونے سے
یہ عقدہ ناف نے کھولا ، کمر ہے مُو تیری
ہوا جو دست رس[1] اس کا بھی پائے قاتل تک
حنا بھلائے گا شوخی مِرا لہو تیری
شبِ فراق میں ، اے روزِ وصل ، تا دمِ صبح
چراغ ہاتھ میں ہے ، اور جستجو تیری
جو ابر گریہ کناں[2] ہے ، تو برق خندہ زناں
کسی میں خو ہے ہماری ، کسی میں خو تیری
یہ چاکِ جیب کے حق میں دعائے مجنوں ہے
نہ ہو وہ دن کہ درستی کرے رفو تیری
کسی طرف سے تو نکلے گا آخر اے شہِ حسن
فقیر دیکھتے ہیں راہ کُو بہ کُو تیری

---

۱ - چمن بے نظیر : ''جو ہووے دسترس ۔''

۲ - کلیات طبع علی بخش میں : ''گریہ کناں'' ۔ نول کشوری نسخوں میں : ''گریہ زناں'' ۔ چمن بے نظیر : ''جو ابر گریہ کناں ہے تو برق خنداں ہے ۔''

چمن میں صبح کو جاکر نہ منہ دکھانا تھا
برنگِ آئنہ حیراں ہے آبِ جو تیری
زمانے میں کوئی تجھ سا نہیں ہے سیف زباں
رہے گی معرکے میں آتش آبرو تیری

٦

[1]کوچۂ دلبر میں مَیں ، بلبل چمن میں مست ہے
ہر کوئی یاں اپنے اپنے پیرہن میں مست ہے
نشۂ دولت سے منعم پیرہن میں مست ہے
مردِ مفلس حالتِ رنج و محن میں مست ہے
دورِ گردوں ہے خداوندا ! کہ یہ دورِ شراب
دیکھتاہوں جس کو مَیں ، اِس انجمن میں مست ہے
آج تک دیکھا نہیں اُن آنکھوں نے روئے خمار
کون مجھ سا گنبدِ چرخِ کہن میں مست ہے
گردشِ چشمِ غزالاں ، گردشِ ساغر ہے یاں
خوش رہیں اہلِ وطن ، دیوانہ بن میں مست ہے
ہے جو حیرانِ صفائے رخ حلب میں آئنہ
بوئے زلفِ یار سے آہو ختن میں مست ہے
غافل و ہشیار ہیں اُس چشمِ میگوں کے خراب
زندہ زیرِ پیرہن ، مردہ کفن میں مست ہے
ایک ساغر دو جہاں کے غم کو کرتا ہے غلط
اے خوشا طالع جو شیخ و برہمن میں مست ہے

---

١ - کلیات طبع علی بخش ص ١٥٦ ، نول کشور قدیم ص ١٤٤ ، جدید ص ٢٢٨ -

وحشتِ مجنون و آتش میں ہے بس اِتنا ہی فرق
کوئی بَن میں مست ہے ، کوئی وطن میں مست ہے

۷

شوقِ وصلت میں ہے شغلِ اشک افشانی مجھے[1]
ہجر میں کرنا پڑا آخر لہو پانی مجھے
یاد میں آئینۂ رخ کے ہے حیرانی مجھے
زلف کے سودے میں رہتی ہے پریشانی مجھے
فی الحقیقت تُو ہے اے دلبر ! سزاوارِ سُجود
کوئی دکھلائی نہیں دیتا ترا ثانی مجھے
تنگ کرتا ہے گریباں ، کٹنے لگتا ہے گلا
موسمِ گل کی جو یاد آتی ہے عریانی مجھے
ہوں وہ دیوانہ کہ اپنا نام رٹنے کے لیے
اک پری نے دی ہے تسبیحِ سلیمانی مجھے
ایک حرف اس کی عبارت کا پڑھا جاتا نہیں
لکھ دیا کس خط میں ہے یہ خطِّ پیشانی مجھے
چشمہ ہائے چشم میں گریے سے ہے دریا کا جوش
غوطے کھلواتا ہے سیلِ اشک کا پانی مجھے
خواب سے بیدار وہ خورشید رُو آ کر کرے
ایسی اے آنکھو ! دکھاؤ صبحِ نورانی مجھے
ذبح ہی کرتے ، گلے لگنے نہ دیتی تھی جو شرم
عیدِ قرباں تھی ، سمجھتے آپ قربانی مجھے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۵۶ ، نول کشور قدیم ص ۱۴۴ ، جدید ص ۱۲۸ ، بہارستان سخن ص ۱۳۹ -

عشق میرا مہرباں ہے ، حسن بندہ یار کا
آئنہ سا رخ ملا ہے آن کو ، حیرانی مجھے

بوسے لیتا ہوں دہانِ ناپدیدِ یار کے
آشکارا ہو گیا ہے گنجِ پنہانی مجھے

کون سے گلشن میں بلبل چہچہے کرتا نہیں
یار کے کوچے میں زیبا ہے غزل خوانی مجھے

ساقیانِ ماہ پیکر پر کیا کرتا ہوں حکم
مے کدے میں عالمِ مستی ہے سلطانی مجھے

خشک رہتا ہے بہت شوقِ شہادت سے گلا
ہو سکے تو ہمدمو ! خنجر کا دو پانی مجھے

خاک میں ملوا رہا سودائے زلفِ یار ہے
مثلِ گردِ راہ ، رہتی ہے پریشانی مجھے

اے خیالِ یار ! کرتا ہوں ریاضت سے صفا
خانۂ دل میں ہے کرنی تیری مہمانی مجھے

حسن کے جلوے سے اس رخ کا اشارہ ہے یہی
کافری زلفوں کو زیبا ہے مسلمانی مجھے

شہرِ خوباں میں نہیں آتش مروت کا رواج
تشنہ لب مر جاؤں تو ممکن نہ ہو پانی مجھے

۸

اعشق اس کا جان کھوتا ہے برنا و پیر کی
اس شاہِ حسن کو یہ دعا ہے فقیر کی

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۵۷ ، نول کشور قدیم ص ۱۳۵ ، جدید ص ۱۲۹ -

بیہودہ گفتگو نہیں مرد فقیر کی
سیدھی ہے سمجھے تو اگر الٹی کبیر کی
صحرا سے لے چلا ہے ہمیں شہر کی طرف
گم ہو گئی ہے عقل جنوں سے مشیر کی
بے مانگے بوسہ عاشقِ مسکیں کو دیجیے
مولٰی مرے ! سوال ہے صورت فقیر کی
پیدا کرے گا یوسفِ گم گشتہ جذبِ عشق
تاثیر اس میں بھی ہے دعاے امیر کی
غافل نہ مثلِ برق ہو شادی سے خندہ زن
بارانِ غم سے ہے گِلِ آدم خمیر کی
زنجیر ہو گئی ہیں بدن کو مری رگیں
کھینچی ہے ناتوانی نے تصویر اسیر کی
دیوانہ کس کریم کے دروازے کا ہے دل
زنجیر میں ہماری صدا ہے فقیر کی
اللہ رے اس صنم کے بدن کی ملائمت
جامہ ہے جسم کا کہ قبا ہے حریر کی
خاکِ شہیدِ ناز سے بھی ہولی کھیلیے
رنگ اس میں ہے گلال کا ، بو ہے عبیر کی
دم بند اس کا زمزموں نے میرے کر دیا
آواز بیٹھ گئی ہم صفیر کی
وہ لعل لعل لب ہے مرے شاہِ حسن کا
سودے میں جس کے بکتی ہے گدڑی فقیر کی
دیکھا مشیرِ کار نہ دیوانے کا کوئی
اس بادشاہ کو نہیں حاجت وزیر کی

چھیڑا ہے میں نے جا کے برہمن کو دیر میں
لی ہے قسم بُتوں سے خدائے کبیر کی
جس تودے میں شریک ہوئی اپنی خاک ، آسے
حسرت ہی رہ گئی لبِ معشوقِ تیر کی
جیسا کہ شادماں ہوں میں روز وصال میں
شیعہ کو یہ خوشی نہ ہو عید غدیر کی
اس طفلِ شوخ کا جو لیا ہے زباں نے نام
بُو آتی ہے ہمارے دہن میں سے شیر کی
آ نکلے تھے کدھر سے ، کہاں یاں سے جائیں گے
اوّل کی کچھ خبر ہے ، نہ ہم کو اخیر کی
تیری زیادتی میں نہ ہوگی کبھی کمی
اے عشق ! خیر چاہیے حسن شریر کی
اس ماہِ چاردہ کو ہے حاصل کمال حسن
رخ میں صفا ہے سینۂ روشن ضمیر کی
تعریف تیرے حسنِ جوانی کی کیا کروں
طفلی میں تجھ پہ رال ٹپکتی تھی پیر کی
دیکھیے اگر مرا دلِ سودا زدہ وہ زلف
ہر مُو سے ہو بلند صدا داروگیر کی
اپنی شرارتوں سے نہ باز آئے آسماں
کودک مزاجی مجھ کو خوش آتی ہے پیر کی
سودائے راہِ یار کا اللہ رے اثر
جادہ بنی جو ہم نے زمیں پر لکیر کی
اس گوش و چشم سا نہ تو دیکھا ہے ، نے سنا
آتش قسم ہے ذاتِ سمیع و بصیر کی !

۹

'کب تک وہ زلف دیتی ہے آزار دیکھیے
کٹتی ہے کس طرح سے شبِ تار دیکھیے
بیمارِ عشق مرتے ہیں اِس اشتیاق میں
پی جائیے جو شربتِ دیدار دیکھیے
رغبت کی آنکھ ڈالیے ذروں کی طرح سے
روشن جو آفتاب سا رخسار دیکھیے
دل کو بغل میں مار کے لے تو چلے ہیں چوک
کہتی ہے کیا نگاہِ خریدار دیکھیے
بے موت روز مرتے ہیں عاشق ، خبر نہیں
اے شاہِ حسن ! پرچہٗ اخبار دیکھیے
جاتے ہیں کوے یار سے ہم ایسے ہو کے تنگ
کعبہ بھی ہو تو پھر کے نہ زنہار دیکھیے
آہستہ پاؤں رکھیے ، قیامت نہ کیجیے
ٹھوکر سے فتنے ہوتے ہیں بیدار دیکھیے
طاؤس و کبک کو ہے نکل چلنے کا خیال
چلتا ہے یار کون سی رفتار دیکھیے
بُلبُل کی طرح عشق جو ہم کو چمن سے ہو
سو جائیے تو خواب میں گلزار دیکھیے
قزّاق کی نگہ سے کم اپنی نگہ نہیں
کیا لوٹیے جو دولتِ دیدار دیکھیے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۵۸ ، نول کشور قدیم ص ۱۰۵ ، جدید ص ۲۳۰ -

چن چن کے قتل کیجیے ، انصاف شرط ہے
حاضر ہیں بے گناہ و گنہ گار دیکھیے

عاشق مسیح بھی تمھیں کہتے ہیں مہربان
حال اُس کا پوچھیے جسے بیمار دیکھیے

مشتاق دل ہے جنبشِ ابروے یار کا
چلتی ہے کس طرح سے یہ تلوار دیکھیے

دروازے میں سے چلیے سرائے حبیب میں
حسرت سے تا کجا پسِ دیوار دیکھیے

سودے میں ابروؤں کے ہوں وہ ماہ ڈھونڈھتا
جس میں کہ چاند دیکھ کے تلوار دیکھیے

عالم کی سیر کیجیے **آتش** ، ملے گا یار
یوسف جو چاہیں آپ تو بازار دیکھیے

۱۰

اکون سے دل میں محبّت نہیں جانی تیری
جس کو سنتا ہوں وہ کہتا ہے کہانی تیری

کچھ دہن ہی نہیں وہمِ شعرا کے نزدیک
مو سے باریک کمر بھی ہے کہانی تیری

جس کے آگے سے گزرتا ہے ، وہ کہتا ہے یہی
دیکھی ، اے روحِ رواں ! ہم نے روانی تیری

شیشۂ مے سے کوئی میری زبانی کہہ دے
خوش نہیں آتی ہے یہ پنبہ دہانی تیری

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۵۸ ، نول کشور قدیم ۱۰۶ ، جدید ص ۲۳۱ -

کیا تری شان ہے ، قربان ہوں اے عفوِ کریم !
آس رکھتا ہے ہر اک فاسق و زانی تیری

اس خرابی میں ترے واسطے پھرتے ہیں خراب
جستجو ہم کو ہے اے گنجِ نہانی ! تیری

عین احساں ہے ، مرے صفحۂ دل پر ، مجھ کو
ایک تصویر اگر کھینچ دے ، مانی تیری

صبح تک شام سے کرتی ہے زباں ذکرِ جمال
نیند آتی ہے کسے سن کے کہانی تیری

مثلِ گل ہنس کے کسی روز تو دل کو خوش کر
خوں رلاتی ہے ہمیں غنچہ دہانی تیری

ناز و انداز و ادا میں ہے ترقی دہ چند
فتنہ طفلی تھی ، قیامت ہے جوانی تیری

کون سے غلّے کا دانہ ہے ، تو اے دانۂ خال
ہم نے ارزانی میں بھی پائی گرانی تیری

گرم جوشی سے جلایا کرے کشت[1] و خرمن
برق ہو سکتی نہیں شوخی میں ثانی تیری

جان کی طرح سے رکھتا ہے عزیز اے گل رو !
داغِ دل لالہ نے سمجھا ہے نشانی تیری

مصرعِ تیغ ہے ہر مصرعِ موزوں آتش
دیکھ لی یار مرے سیف زبانی تیری

---

۱ - نول کشوری نسخوں میں : "کشف و خرمن" ہے -

۱۱

'مہندی سے تیرے ہاتھ کی گل ضرب دست کھائے
چوٹی کے فتح پیچ سے سنبل شکست کھائے
لبریز کر پیالے کو ساقی اس ابر میں
افیوں نہ تنگ ہو کے کوئی مے پرست کھائے
شیر و پلنگ و گُرگ سے باہر نہیں ہوں میں
جو چاہے ران کھائے ، جو چاہے سو دست کھائے
دل کو برشتگی سے ہو حاصل شگفتگی
دھوکا کبابِ مُرغ کا وہ چشمِ مست کھائے
ظالم کو سعی سے نہیں بحر جہاں میں نفع
ممکن نہیں کباب جو مچھلی کا شست کھائے
پھر خوشے آتریں ، پھر کھنچے انگور کی شراب
پھر شاخِ تاک پیچ سرِ داربست کھائے
طے کر چکوں کہیں میں نشیب و فرازِ دہر
تا چند ٹھوکریں یہ بلند اور پست کھائے
اس بندوبستِ جسم سے جاں کو نجات ہو
چھوٹے بری ، طلسم عناصر شکست کھائے
دھوکا نہ دے مجھے تری شوخی کی چال کا
بل تو کمر نہ چیتے کی ہنگامِ جست کھائے
برخاست ہو ہماری جو چُپ بیٹھتے ہیں آپ
غم کون دیکھ کر یہ تمھاری نشست کھائے

---

۱ ۔ کلیات طبع علی بخش ص ۱۵۹ ، نولکشور قدیم ص ۱۳۶ ، جدید ص ۲۳۲۔

جڑ سے اکھیڑ کر میں جلاؤں تمام تاک
میرے چمن میں دھوپ اگر داربست کھائے
اس لالہ رُو کے حسن کا جب سے ہوا ہے عشق
کھاتا ہوں داغ یوں میں ، گزک جیسے مست کھائے
کہنا "بلے" وہ بھولے نہ اے ساقیِ ازل
لغزش نہ پائے آتش مستِ الست کھائے

۱۲

اپیمبر "میں نہیں ، عاشق ہوں جانی !
رہے موسیٰ[۲] ہی سے یہ "لن ترانی"
سلیماں[۳] ہم ہیں اے محبوبِ جانی !
سمجھتے ہیں تجھے بلقیسِ ثانی
کھلا سودے میں ان زلفوں کے مر کر
پریشاں خواب تھی یہ زندگانی
یہ کون آتا ہے اُن سے قد کشی کو
گڑے جاتے ہیں سروِ بوستانی
وہی دے گا کبابِ نرگسی بھی
جو دیتا ہے شرابِ ارغوانی
رنگا ہے عشق نے کس دردِ سر سے
ہمارا جامۂ تن زعفرانی
مسافر کی طرح رہ خانہ بردوش
نہیں جائے اقامت دارِ فانی

۱- کلیات طبع علی بخش ص ۱۵۹ ، نول کشور قدیم ۱۴۷ ، جدید ص ۲۳۲ -

ترے کوچے کے مشتاقوں کے آگے
جہنم ہے بہشتِ آسمانی
وہ میکش ہوں دیا ہے قابلہ نے
جسے غسلِ شرابِ ارغوانی
یقیں ہے ، دیدۂ باریک بیں کو
کرے عینک طلب یہ ناتوانی
وہ خط ہے یادگارِ حسنِ رفتہ
وہ سبزہ ہے گلستاں کی نشانی
نکلتی منہ سے قاصد کے نہیں بات
مگر لایا ہے پیغامِ زبانی
یہ مشتِ خاک ہو مقبولِ درگاہ
صبا کی چاہتا ہوں مہربانی
لیے ہیں بوسۂ رخسارۂ صاف
پیا ہے ہم نے آئینے کا پانی
سفیدی مو کی ہو کافور ہر چند
کوئی مٹتا ہے یہ داغِ جوانی ؟
نہ خوش ہو فربہیِ تن سے غافل
سبک کرتی ہے مردے کو گرانی
موئے جو پیشتر مرنے سے وہ لوگ
کفن سمجھے قبائے زندگانی
جلاتی ہے دل آتش طور کی طرح
کسی پردہ نشیں کی لن ترانی

۱۳

[1]وہ افسوں ہے ہماری شعر خوانی
جو سنتا گنگ ہو جاتا فغانی

مبارک ابر کو دریا کا پانی
ہمیں دور[2] شرابِ ارغوانی

لہو سے اپنے لکھوں گر خطِ شوق
قلم بھولے سیاہی کی روانی

دلِ عالم ہو عشقِ حسن سے داغ
رہے ہر فرد پر تیری نشانی

فراقِ یار کو دل نوشِ جاں ہو
یہ یوسف[4] گرگ کی ہے میہمانی

وہ ترک آیا لگا اے آتشِ گل
کبابِ طائرانِ بوستانی

کریں گے یار کو عریاں شبِ وصل
عیاں ہو جائے گا رازِ نہانی

ہوا کوئی نہ حالِ دل سے آگاہ
رہی مشتاقِ گوش اپنی کہانی

بہیں گے مثلِ دریا دیدۂ تر
پییں گے ابر اِن چشموں کا پانی

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۶۰ ، نول کشور قدیم ص ۱۴۷ ، جدید ص ۲۳۳ -

۲ - کلیات طبع نول کشور جدید میں ایک نسخہ ہے : ''ہمیں دردِ شراب ارغوانی -''

اڑا دے گی صبا مثلِ پرِ کاہ
سلامت ہے جو اپنی ناتوانی
ہماری قبر پر وہ شمع رُو آئے
رہے روشن چراغِ مہربانی
رلاتا ہے وصالِ یار کا شوق
فراق اپنا لہو کرتا ہے پانی
خدا کے حکم سے ہے قوتِ نطق
کلام اپنا ہے ہاتف کی زبانی
کہوں ہرجائی تو بولے وہ کافر
نہیں مومن کو لازم بدگمانی
بڑھی ایڑی سے چوٹی اس پری کی
زمیں پکڑے بلائے آسمانی
نہیں دیتا وہ دلبر بوسۂ خال
مگر کالے تلوں کی ہے گرانی
نہیں واقف ہم اس بت کی کمر سے
خدا کے واسطے ہے غیب دانی
رلاتی ہے مثالِ ابرِ پیری
دکھا کر داغِ طاؤسِ جوانی
مرا دیواں ہے اے آتش! خزانہ
ہر اک بیت اس میں ہے گنجِ معانی

۱۴

صدمہ ہے دوش پر سر و گردن کے بوجھ سے
ہر ایک بوجھ بھاری ہے سو من کے بوجھ سے

۱ کلیات طبع علی بخش ص ۱۶۰ ، نولکشور قدیم ص ۱۴۸ ، جدید ص ۲۳۴ -

ہوش و خِرد ہے باعثِ تکلیفِ آدمی
دیوانہ آشنا نہیں دامن کے بوجھ سے
راحت طلب کو رنج کشوں کی خبر کہاں
آگاہ کیا سوار ہے توسن کے بوجھ سے
سازِ سفر کبھی نہ ہوا بارِ دوش یاں
سمجھا میں مال و جنس کو رہزن کے بوجھ سے
سختیِ بخت و عشقِ بتاں دونوں قہر ہیں
کم بوجھ سنگ کا نہیں آہن کے بوجھ سے
رندوں کو قید سبحہٴ زنّار کی نہیں
واقف نہیں میں شیخ و برہمن کے بوجھ سے
غمّاز اپنا ذکر نہ لاوے حضورِ دوست
گردن جھکے نہ منّتِ دشمن کے بوجھ سے
عاشق ملالِ خاطرِ اہلِ جہاں نہ ہوں
خم ہو نہ شاخ بلبلِ گلشن کے بوجھ سے
آتش یہ سارے رنج ہیں اس زندگی کے ساتھ
مُردے کو کیا خبر گلِ مدفن کے بوجھ سے

۱۵

[1] رنگ جو جو کچھ کہ چاہیں لائیں بن میں آبلے
پائے بوسی کو ترستے تھے وطن میں آبلے
چشم زخمِ خار سے یا رب بچانا تو انہیں
اک رفیقِ حال ہیں رنج و محن میں آبلے

---

۱ ۔ کلیات طبع علی بخش ص ۱٦۰ ، نولکشور قدیم ص ۱۴۸ ، جدید ۲۳۴ ۔

بدگمانی سے عبث پھرتا ہے گلچیں میرے ساتھ
ڈھونڈھتے آئے ہیں کانٹوں کو چمن میں آبلے
کون سر گرداں نہیں ہے جستجوے یار میں
پڑ گئے ہیں پاے شیخ و برہمن میں آبلے
آدمی کی بے شعوری ہے طلب راحت کی یاں
داغ ہیں یا[1] خانۂ چرخِ کہن میں آبلے
پاؤں کے چھالے تو نذرِ خارِ صحرا کر چکے
پھوڑیے اب چل کے دل کے انجمن میں آبلے
تیغِ شعلہ سے کیا تھا قتل قاتل نے مگر
دیکھتا ہوں اپنے زخموں کے دہن میں آبلے
خار بھی میرے نصیبوں کا بیاباں میں نہیں
کیا شریکِ حال ہوویں گے کفن میں آبلے
اِس قدر مجھ سے زمانے کی ہوا ہے برخلاف
کیا عجب بُوے حنا ڈالے بدن میں آبلے
حالتِ بد کا نہیں کوئی زمانے میں شریک
جسم ساں ممکن نہیں ، ہیں پیرہن میں آبلے
ایڑیاں رگڑیں نہ آتش پھوڑ کر سر مر گیا
مثلِ مجنوں تھے نہ پائے کوہ کن میں آبلے

۱٦

[2]رہ گیا چاک سے وحشت میں گریباں خالی
لے چلے خار سے ہم گوشۂ داماں خالی

---

۱ - علی بخش ”یا -“ نولکشوری نسخے ”یہ“ -
۲ - کلیات طبع علی بخش ص ۱٦۱ ، نولکشور قدیم ص ۱۴۸ ، جدید ص ۲۳۵ -

ایک بوسہ دہنِ یار سے حاصل نہ ہوا
اپنی تقدیر کا تھا چشمۂ حیواں خالی
وقتِ فرصت کو غنیمت سمجھ ، آنا ہے تو آ
اے اجل عالمِ تنہائی ہے ، میداں خالی
کوچۂ یار میں مشتاقِ رخ و قد آئے
ہو گئے بلبل و قمری سے گلستاں خالی
دلِ عاشق سے اشارہ ہے یہ اُن مژگاں کا
قلعہ کر لیتے ہیں یہ دستۂ تُرکاں خالی
چشمِ پروانہ سے دیکھا تو ہوا یہ روشن
جا تری دل میں ہے اے شمعِ شبستاں خالی
مرغِ دل سینے کو کھولے ہیں نشانے کی طرح
ترک چشم اُن کے کریں ترکشِ مژگاں خالی
باغِ عالم میں نہیں کوئی کسی کی سنتا
نہ دماغ اپنا کر اے مرغِ خوش الحاں خالی
قیدِ مذہب کی گرفتاری سے چھٹ جاتا ہے
ہو نہ دیوانہ ، تو ہے عقل سے انساں خالی
عہدِ پیری میں کہاں اب وہ جوانی کے رفیق
صاف پہلوے زباں کر گئے دنداں خالی
تیری درگہ کے فقیروں کے لیے اے محبوب
تخت پر اپنی جگہ کرتے ہیں سلطاں خالی
خالِ مُشکیں سے شکار اہلِ قلم کو کیجے
گل چلے شیر سے کرتے ہیں نیستاں خالی
بتِ کافر نہیں ہوتے جو ہم آغوش ، نہ ہوں
بغلِ گور میں ہے جاے مسلماں خالی

ہنستے ہنستے تو کیا قتل گنہ گاروں کو
رو دیا دیکھ کے جلّاد نے زنداں خالی
دل بے کینہ کدورت نہیں رکھتا آتش
خس و خاشاک سے ہے اپنا بیاباں خالی

۱۷

[1]بند نقابِ عارضِ دلدار توڑیے
باغِ مرادِ عشق کی دیوار توڑیے
وہ درد دوست ہیں ؛ جو خدا ہم کو زخم دے
سو بار ٹانکے کھائیے ، سو بار توڑیے
دیکھے ترا جو مصحفِ رو برہمن ، کہے
بت کو سلام کیجیے ، زنّار توڑیے
بے پر مجھے فلک نے کیا تو بجا کیا
لازم ہے بالِ مرغِ گرفتار توڑیے
مرغِ ترانہ سنج ہوں اُس بوستاں کا میں
خونِ بہار ٹپکے ، اگر خار توڑیے
اپنا کچھ اختیار شفا میں نہیں طبیب !
پرہیز سے نہ خاطرِ بیمار توڑیے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۶۱ ، نول کشور قدیم ص ۱۴۹ ، جدید ص ۲۳۶ ؛ بہارستان سخن ص ۲۱۷ - یہ غزل بھی ابتدائی زمانے کی ہے - مصحفی نے صرف مطلع لکھا ہے :

بندِ نقابِ عارضِ دلدار توڑیے
یعنی ریاضِ حسن کی دیوار توڑیے

ریاض الفصحاء ، ص ۸ -

فتراک صید زندہ ہے زلفِ سیاہِ یار
ٹوٹیں ہزار دل ، اگر اک تار توڑیے

گردن ہی اپنی دوش پر اپنے وبال ہے
کیا چھین کر حریف کی تلوار توڑیے

عاشق کی بے قراری سے اے بُت ! پناہ مانگ
ٹکرائیے جو سر کو تو کُہسار توڑیے

بوسے کسی کے چہرۂ رنگیں کے لیجیے
اک دن تو پھول باغ سے دو چار توڑیے

انساں کو پاسِ خاطرِ نازک ضرور ہے
شیشہ شراب کا بھی نہ زنہار توڑیے

یوسُف کے دیکھنے کا ہے آنکھوں کو اشتیاق
بندِ نقاب کو سرِ بازار توڑیے

سودائے دل نہ کیجیے گو لاکھ سر کا ہو
جب تک نہ خُوب ہائے خریدار توڑیے

نامرد آسماں سے گوارا ہے کس کو جنگ
آتش سِپر کو چِیریے ، تلوار توڑیے

۱۸

[1]حسرتِ جلوۂ دیدار لیے پھرتی ہے
پیشِ روزن پسِ دیوار لیے پھرتی ہے

اس مشقّت سے اسے خاک نہ ہوگا حاصل
جاں عبث جسم کی بیگار لیے پھرتی ہے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۶۲ ، نول کشور قدیم ص ۱۴۹ ، جدید ص ۲۳۶ -

دیکھنے دیتی نہیں اس کو مجھے بے ہوشی
ساتھ کیا اپنے یہ دیوار لیے پھرتی
کسی فاسق کے تو منہ کو نہ کرے گی کالا
کیوں سیاہی یہ شبِ تار لیے پھرتی ہے
تو نکلتا نہیں شمشیر بکف اے قاتل !
موت میرے لیے تلوار لیے پھرتی ہے
مالِ مفلس مجھے سمجھا ہے جنوں نے شاید
وحشتِ دل سرِ بازار لیے پھرتی ہے
کعبہ و دیر میں وہ خانہ برانداز کہاں
گردشِ کافر و دیندار لیے پھرتی ہے
رنج لکھا ہے نصیبوں میں مرے راحت سے
خواب میں بھی ہوسِ یار لیے پھرتی ہے
چال میں اس کی سراپا ہے کسی کی تقلید
کبک کو یار کی رفتار لیے پھرتی ہے
درِ یار آئے ٹھکانے لگے مٹی میری
دوش پر اپنے صبا بار لیے پھرتی ہے
ہنستے ہیں دیکھ کے مجنوں کو گلِ صحرائی
پا برہنہ طلبِ خار لیے پھرتی ہے
سایہ ساں حسن کے ہمراہ ہے عشقِ بے باک
ساتھ یہ جنس خریدار لیے پھرتی ہے
کسی صورت سے نہیں جاں کو قرار اے آتش
طپشِ دل مجھے لاچار لیے پھرتی ہے

۱۹

رفتگاں[1] کا بھی خیال اے اہلِ عالم کیجیے
عالمِ ارواح سے صحبت کوئی دم کیجیے

حالت غم کو نہ بھولا چاہیے شادی میں بھی
خندۂ گل دیکھ کر یاد اشکِ شبنم کیجیے

عیبِ الفت روز اول سے مری طینت میں ہے
داغ لالہ کے لیے کیا فکرِ مرہم کیجیے

اپنی راحت کے لیے کس کو گوارا ہے یہ رنج
گھر بنا کر گردنِ محراب کو خم کیجیے

عشق کہتا ہے مجھے رام آس بت وحشی کو کر
حسن کی غیرت اسے سمجھاتی ہے رم کیجیے

رات صحبت گل سے ، دن کو ہم بغل خورشید سے
رشک اگر کیجے تو رشکِ بختِ شبنم کیجیے

دیدہ و دل کو دکھایا چاہیے دیدارِ یار
حسن کے عالم سے آئینوں کو محرم کیجیے

شکلِ گل ہنس ہنس کے روزِ وصل کاٹے ہیں بہت
ہجر کی شب صبح رو کر مثلِ شبنم کیجیے

تھی سزا اپنی جو شادی مرگ قسمت نے کیا
ہجر میں کس نے کہا تھا وصل کا غم کیجیے

آپ کی نازک کمر پر بوجھ پڑتا ہے بہت
بڑھ چلے ہیں حد سے گیسو ، کچھ انھیں کم کیجیے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱٦۲ ، نول کشور قدیم ص ۱۴۹ ، جدید ص ۱۳۷ بہارستانِ سخن ص ۲۱۵ -

آٹھ گئی ہیں سامنے سے کیسی کیسی صورتیں
روئیے کس کے لیے ، کس کس کا ماتم کیجیے
روزِ مردم شب کیے دیتا ہے ، سرمہ پونچھیے
خون ہوتے ہیں بہت ، شوقِ حنا کم کیجیے
آئنے کو روبرو آنے نہ دیجے یار کے
شانے سے آتش مزاجِ زلف برہم کیجیے

۲۰

[۱]اثر رکھتی مئے گلگوں کی کیفیّت کا ہستی ہے
آبھرنے میں حبابِ بحر کے اک جوشِ مستی ہے
دکھائی[۲] دیتے ہیں ہندو ہی ہندو مجھ کو خالوں سے
رخِ محبوب ہے یا نا مسلمانوں کی بستی ہے
پسندِ طبعِ محبوباں دلِ عاشق نہیں ہوتا
نظر میں کب کسی کے چڑھتی ہے جو چیز سستی ہے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۶۳ ، نولکشور قدیم ص ۱۵۰ ، جدید ص ۲۳۸ -
یہ غزل چونکہ ریاض الفصحا ص ۲۳۸ پر اتی ہے ، اس لیے ۱۲۲۱ھ
کے قریب لکھی گئی ہے - مصحفی کے مطلع و مقطع سمیت نقل کردہ
اشعار کی تعداد نو ہے - مطلع یہ ہے :

حبابِ بحر دیوانوں کو اک زندانِ ہستی ہے
بہیں دشتِ عدم تک جا پہنچنا جوشِ مستی ہے
سرِ جاناں رکھا کب میں نے زانوے تصوّر میں
شبِ ہجر آہ کیوں چوٹی کی ناگن بن کے ڈستی ہے

۲ - اس مصرع کی ابتدائی صورت یہ ہے :
"برہمن زلف و مردم گبر و کافر خالِ ہندو ہے"

وہ دہقانِ غریبِ سرزمینِ عشق بازی ہوں
عوض باراں کے میری کشت پر آتش[1] برستی ہے
فرومایہ[2] کی گردن خم فلک سے بھی نہیں ہوتی
بھلا تیغِ گلی کو بھی کہیں دیکھا کہ کستی ہے ؟
غم و شادی کی حالت دیکھ عالم کے مرقّع میں
کوئی تصویر روتی ہے ، کوئی تصویر ہنستی ہے
نہیں معلوم لذّت کون سی رکھتا ہے زخم ایسی
نہایت روح آبِ تیغ کی خاطر ترستی ہے
غنیمت جان یار آوے لحد پر جان کھونے سے
مرادِ دل ملے کونین تک دے کر تو سستی ہے
نہیں رہتا مزاجِ سفلہ ہرگز ایک حالت پر
بلندی کا بگولے کی مآلِ کار پستی ہے
نہیں منظور بعد از مرگ پتّھر اس کی چھاتی پر
برہمن اس لیے مصروفِ کارِ بُت پرستی ہے

---

۱ - ریاض‌الفصحا : ''کشت پر آفت برستی ہے'' - پھر ایک اور شعر ہے جو یہاں نہیں ہے :

دلِ صاف اپنا کیوں کر نقشِ خوباں کا نہ طالب ہو
ازل سے کارِ لوحِ آئینہ ، صورت پرستی ہے

۲ - ریاض‌الفصحا میں اس کے بعد یہ شعر ہے :

مبارک باد خونِ حسرتِ نظارہ عاشق کو
ہمیشہ بازوے قاتل کو مشقِ تیز دستی ہے

[1]ستارہ اپنا گردش میں ہے ، **آتش** اُس کی گردش سے
فلک کی تنگ چشمی سے ہماری تنگ دستی ہے

۲۱

[2]کام ہمّت سے جواں مرد اگر لیتا ہے
سانپ کو مار کے گنجینۂ زر لیتا ہے

ناگوارا کو جو کرتا ہے گوارا انسان
زہر پی کر مزۂ شیر و شکر لیتا ہے

ہالے میں ماہ کا ہوتا ہے چکوروں کو یقیں
کبھی انگڑائی جو وہ رشکِ قمر لیتا ہے

وہ زبوں بخت شجر ہوں میں کہ دہقاں میرا
پیچھے بوتا ہے مجھے ، پہلے تبر لیتا ہے

منزلِ فقر و فنا جائے ادب ہے غافل
بادشہ تخت سے یاں اپنے اُتر لیتا ہے

گنجِ پنہاں ہے تصرّف میں بنی آدم کے
کان سے لعل یہ ، دریا سے گُہر لیتا ہے

ضبط کرتا ہے جو نالے کا شبِ فرقت میں
زخم پہلو میں نمک پیس کے دھر لیتا ہے

نظر آ جاتا ہے اے گل ! جسے رخسار ترا
پھولوں سے دامنِ نظّارہ وہ بھر لیتا ہے

---

۱ - ریاض الفصحا میں مقطع یوں ہے :
ہوائے سیر دشت و کوہ ہے تو کر سبک باری
کہ یکساں سائے کو آتش بلندی اور پستی ہے

۲ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۶۳ ، نول کشور قدیم ص ۱۵۰ ، جدید ص ۲۳۸ - بہارستانِ سخن ص۲۵۶ آخری غزل ہے -

رہِ پُر خوفِ محبّت میں جو رکھتا ہے قدم
گور میں گامِ نخستیں کو وہ دھر لیتا ہے

پیش کش گل سے طلب کرتے ہیں رنگیں مضموں
سرو سے باج مرا مصرعِ تر لیتا ہے

عقل کر دیتی ہے انساں کی جہالت زائل
موت سے جان چھپانے کو سپر لیتا ہے

نگہِ لطف کی حسرت ہے ہمیں وائے نصیب
کس طرح سرمہ گھر آن آنکھوں میں کر لیتا ہے

یاد رکھتا ہے عدم میں کوئی ساغر کش اسے
ہچکیاں شیشۂ مے ، شام و سحر لیتا ہے

روح و قالب کی جدائی ہے ، جدائی تیری
دم نکلتا ہے جو تُو نامِ سفر لیتا ہے

ہجر میں وصل کا ملتا ہے مزا عاشق کو
شوق کا مرتبہ جب حد سے گزر لیتا ہے

عزّتِ نالہ و فریاد نہ کھو اے آتش !
آشنا کوئی نہیں ، کون خبر لیتا ہے

۲۲

[۱] اللہ ری روشنی مرے سینے کے داغ کی
اندھیاری رات میں نہیں حاجت چراغ کی

ہستیِ چند روز نے تو تنگ ہی رکھا
خوابِ عدم میں دیکھیں گے صورت فراغ کی

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص۱۶۳ ، نولکشور قدیم ص ۱۵۱ ، جدید ص ۲۳۹ -

بے اعتبار نقش و نگارِ زمانہ ہے
اک رنگ پر ہوا نہیں رہتی ہے باغ کی
بختِ سیہ نے کام کیا بعدِ مرگ بھی
رنگیں مرے لہو سے ہے منقار زاغ کی
ظاہر ہوا مجھے یہ بلندیِ سرو سے
کرتی ہے کام خاک بھی عالی دماغ کی
سو تاڑ سے بلند کرے باغباں تو کیا
ہمّت کے آگے پست ہے دیوار باغ کی
اخگر کی طرح سے جو دہکتے ہیں داغِ عشق
سینے میں اپنے رہتی ہے گرمی اَجاغ[1] کی
رخ کیا ملائے گا رخِ رنگینِ یار سے
لالے کو کیا خبر نہیں ہے چار داغ کی
ابرِ کرم کے فیض نے ایسا کیا ہے سبز
مہندی کی ٹٹی ہو گئی دیوار باغ کی
شاعر ہوں ، بوے سیبِ زنخداں ہوں سونگھتا
اصلاح رہتی ہے مجھے اپنے دماغ کی
گم ہوں گے ایسے ڈھونڈھے بھی پائے نہ جائیں گے
کھو وے گی فکر ہم کو تمھارے سراغ کی
جلتی ہے شوقِ آتشِ رخسارِ یار میں
ہے شمع سوختہ آسی چشم و چراغ کی
پاتے نہیں زمانے میں آتش خوشی کا نام
عنقا ہے اپنے دور میں گردش ایاغ کی

---

۱ - اجاغ : چولھا ، انگیٹھی -

٢٣

حسنِ امرد کا بہت مائل دلِ بےباک ہے
گردِ راہ نےسواراں آخر اپنی خاک ہے
خطِ روے یار حجت بہرِ حسنِ پاک ہے
جانتے ہیں سب کہ کعبے کی سیہ پوشاک ہے
سرخ شادی سے رخِ ساغر کشِ بےباک ہے
زرد روے محتسب ہے ، سبز شاخِ تاک ہے
بانس کا رتبہ ہے پیشِ قدِ موزوں سرو کو
گل کو تیرے روبرو حکمِ خس و خاشاک ہے
قلبِ ماہیت سے جائے نفرتِ پاکاں نہ ہو
جوش کھاکر ، مئے ہوا انگور جب ، ناپاک ہے
مومن و کافر جگہ دیتے ہیں آنکھوں میں اسے
طور کا سرمہ کسی نقشِ قدم کی خاک ہے
جوش گریہ سے رواں رہتا ہے دریا گرد و پیش
اب پہنچتا ہے وہ مجھ تک جو کوئی تیراک ہے
بختِ یاور نے دیا انگور سا فرزند آسے
خانداں کا فخر اپنے سلسلے میں تاک ہے
دستِ وحشت پنجۂ مژگانِ اشک افشاں ہے یاں
آستیں میری گریباں کی طرح سے چاک ہے
کلفتِ ایام سے پردہ نہیں کچھ حسن کو
خوب رویوں کو مزینب ملگجی پوشاک ہے

---

١ ۔ کلیات طبع علی بخش ص ١٦٣ ، نول کشور قدیم ص ١٥١ ، جدید ص ٢٣٩ ، بہارستانِ سخن ص ٢٠١ : ''حسن ابرو کا بہت مائل ۔''

وہ گریباں گیر ہے تیرا ، میں دامن گیرِ یار
عشق یاں گستاخ ہے ، واں حسن اگر بیباک ہے

بہرہ‌ور دیدار سے یہ ، وصل کی حسرت اسے
شاد ہیں آنکھیں ہماری ، دل مگر غم ناک ہے

دورِ ساغر سے دگرگوں رنگ ہو جاتا ہے یاں
مے کدے میں لطف رکھتی گردشِ افلاک ہے

ڈھونڈھ لوں گا چار دن میں قاتل اپنے واسطے
دیکھتا ہوں آسماں کو ، کس قدر سفّاک ہے

نارسائی طالعِ بد کی بیاں کیا کیجیے
پاؤں شل ہو جائیں قاصد کے اگر چالاک ہے

کون سے صیّاد نے صید افگنی کی اختیار
حلقۂ گوشِ غزالاں حلقۂ فتراک ہے

مرد سے بہتر ہے نامِ مرد ، سچ ہے یہ مثل
پہلوانی ہے سو ہے رستم کی آتش دھاک ہے

۲۴

کبھی جو جذبِ محبّت سے کام ہوتا ہے
نقاب اٹھتا ہے ، دیدار عام ہوتا ہے

وہ صبحِ عید جو بالائے بام ہوتا ہے
مہِ صیام میں روزہ حرام ہوتا ہے

بلائے بزمِ جہاں ہے وہ چشم کی گردش
نگاہ پھرتی ہے دورہ تمام ہوتا ہے

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱٦۴ ، نول کشور قدیم ص ۱۵۲ ، جدید ص ۲۴۰ -

اٹھاؤں کس لیے احسانِ یار گردن پر
مرا تو اس کے تغافل سے کام ہوتا ہے
خدا کی یاد جوانی میں غافلو! کر لو
وگرنہ وقتِ فضیلت تمام ہوتا ہے
الٰہی کیوں نہیں خواہاں کوئی صنم اس کا
یہ دل تو شرطِ وفا پر غلام ہوتا ہے
کسی کو کیا کوئی گھر اپنے دل میں کرنے دے
نگیں سے دیکھ لے، برعکس نام ہوتا ہے
فرشتے سنتے ہیں آوازِ دورباش کا شور
کبھی ہمارا جو واں اہتمام ہوتا ہے
زیارت ان کی جو کرتے ہیں مومنیں آ کے
زبانِ حور میں ان سے کلام ہوتا ہے
ہزار لال ہوئے اخگروں سے داغِ جنوں
ہنوز پختہ ہے سودائے خام ہوتا ہے
کوئی زمانے سے جاتا ہے، کوئی ہے آتا
کسی کا کوچ، کسی کا مقام ہوتا ہے
پھنسا جو زلف میں اس گل کی مرغِ دل، بولا
نہ تھی خبر یہ کہ سنبل بھی دام ہوتا ہے
ہمارے حلقے میں کرتا ہے شیشہ دل خالی
ہمارے دور میں لبریز جام ہوتا ہے
کمندِ شوق ہو درگاہِ عشق کی رہبر
یہ آستانہ بلندی میں بام ہوتا ہے
وہ کون ہے جو نہیں ان کو دیکھنے آتا
نظارہ بازوں سے ایک اژدھام ہوتا ہے

ملازموں میں ہیں سلطانِ عشق کے ہم بھی
کبھی ہمارا بھی آتش سلام ہوتا ہے

۲۵

[1]جمالِ حور و پری پر ہے طعنہ زن مٹی
بلائے جاں ہوئی سرخ و سفید بن مٹی

قدم پڑے جو ترا اس پر اے گلِ رعنا
زمینِ شور کی ہو قابلِ چمن مٹی

خدا کے واسطے ، اے آسماں ! حوالے کر
دھرے دھرے نہ کہیں ہو مرا کفن مٹی

یہی جو تیشہ زنی ہے تو ایک دن سننا
کرے گا اینٹ کا گھر اپنا کوہ کن مٹی

جلا رقیب سیہ رو حسد سے ، میں سمجھا
ہوئی ہے گبر کے مردے کی شعلہ زن مٹی

ہمیشہ جھاڑتے ہیں گردِ پیرہن غافل
نہیں سمجھتے کہ ہے زیرِ پیرہن مٹی

زمانے میں کوئی غربت زدہ نہیں ہم سا
اڑی نہ اپنی کبھی جانبِ وطن مٹی

قبولِ خاطرِ مردم ہو توتیا کی طرح
عزیز تیری کریں شیخ و برہمن مٹی

ہوائے تند سے رہتا ہے بیمِ بربادی
تپِ دروں نے کیا ہے زبس بدن مٹی

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۶۵ ، نولکشور قدیم ص ۱۵۲ ، جدید ص ۲۴۱ -

نہ ہووے قالب خاکی غبار خاطر روح
قبول سینے کے اوپر ہزار من مٹی
نظارہ باز یہ در پردہ کون ہے اس کا
دکھاتی ہے کسے چشم و لب و دہن مٹی
زمیں سے ہووے گا اک آسمان نو پیدا
پس از فنا جو ہوئی اپنی چرخ زن مٹی
کسی کا یار برے وقت میں نہیں کوئی
نہ دیکھا روح کو ہوتے شریک تن مٹی
گڑے ہیں اس میں صباحت کے سیکڑوں کشتے
عجب نہیں ہے جو دے بوئے یاسمن مٹی
مآل کار کا اپنے نہیں خیال آتا
ملایا کرتے ہیں مٹی میں گورکن مٹی
کسی نے آف بھی نہ کی شمع جل کے خاک ہوئی
نہ ہووے گی مگر آتش یہ انجمن مٹی ؟

۲۶

آبلوں[۱] سے خار صحرا ہی نہیں سر کھینچتے
بید کے پتے بھی مجنوں پر ہیں خنجر کھینچتے
کیمیاگر روغن گوگرد احمر کھینچتے
ہم تری زلفوں کو دھو کر عطر عنبر کھینچتے
ناتوانی کا برا ہو ، گو اثر ہوتا نہ کچھ
آزمانے کو تو نالے ہم مقرر کھینچتے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۶۵ ، نول کشور قدیم ص ۱۵۳ ، جدید ص ۲۴۲ -

ٹھوکریں کھائی ہیں جو ہم نے بتوں کے عشق میں
آب ہو جاتے ، جو یہ آزار پتّھر کھینچتے

شاعروں نے تیرے قد سے دی ہے جو تشبیہ یار
قمریوں کو سرو ہیں سولی کے اوپر کھینچتے

دیکھ کر وہ خالِ رخ ملتے ہیں روغن ساز ہاتھ
ان تلوں کا تیل کھنچتا تو مقرّر کھینچتے

فکرِ معنی خیز صفحے کو بناتی صید گہ
دام ہو کر مرغِ مضموں تارِ مسطر کھینچتے

رعشۂ پیری ہے وہ جوشِ جوانی کا عوض
اپنی بد مستی کا خمیارہ نہ کیوں کر کھینچتے

بوالہوس عاشق کے جیتے جی نہیں شایانِ قتل
دوست تھے میرے تو دشمن پر نہ خنجر کھینچتے

جنبشِ مژگاں سے چل جاتے ہیں آرے جان پر
دل شکنجے میں ہیں گیسوے معنبر کھینچتے

یاد کرتے ہیں تجھے تنہائی میں اے نازنیں !
معتکف رہتے ہیں ہم ، چلّے ہیں اکثر کھینچتے

ہجر کی شب میں ہے روزِ وصل کا آنکھوں کو شوق
دسترس ہوتا تو ہم دامانِ محشر کھینچتے

جب سے دیکھا ہے تجھے آنکھوں نے اے بالا بلند!
قد کے سودے میں ہیں تصویرِ صنوبر کھینچتے

زندگی میں سیرِ جنّت کا جو ہوتا دل کو شوق
ہم تجھے اپنی طرف اے حور پیکر کھینچتے

میں اڑا دیتا ہوں اُن کو دے کے اک اک خطِ شوق
دام میں صیّاد ہیں جو جو کبوتر کھینچتے

ٹیڑھی صورت آئنہ کرتا جو اُس محبوب سے
قبر سے مُردہ ترا ہم اے سکندر کھینچتے
روشنیِ حُسن کرتے آتش اپنی گور پر
شمع رُویوں کو شبِ آدینہ مر کر کھینچتے

۲۷

اے رخِ یار مجھے جان سے بیزاری تھی
چاندنی رات نہ تھی ، گور کی اندھیاری تھی
کام ہی ہو گیا اُمیدِ شفا میں آخر
دل کی بیماری تھی یا چشم کی بیماری تھی
کیا مزا کالبدِ خاک میں اے روح ملا
یا نکلتی ہی نہیں ، یا تو وہ بیزاری تھی
یاں مرے پاؤں میں زنجیر تھی ، واں گردن میں
یار سے میں نے بدی شرطِ وفاداری تھی
نہ مُوا میں تو ہے قسمت کا قصور اے قاتل !
ہاتھ کمزور ، نہ تلوار تری بھاری تھی
نالہ کرنے سے نہ کم ظرف کبھو جلّادو
ضبط فریاد بس اب آگے دل آزاری تھی
وائے قسمت کبھی پہنچے بھی جو ہم کم طالع
میلے سے میدنی کے پھرنے کی تیّاری تھی
بوسۂ لعلِ لبِ یار کی حسرت ہی رہی
مردِ مفلس کو جواہر کی خریداری تھی

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۶۶ ، نول کشور قدیم ص ۱۵۳ ، جدید ص ۲۴۲ -

طور جس برق تجلی نے کیا خاک سیاہ
تیرے آتش کدۂ حسن کی چنگاری تھی
گاہ روتا ، کبھی ہنستا تھا نصیبوں پر میں
خواب بد میرے لیے حالت بیداری تھی
چھوٹ کر عشق کے پھندے سے ہوں تنگ اے آتش
مجھ کو آزادی سے بہتر وہ گرفتاری تھی

۲۸

[1]ایڑیوں تک تری چوٹی کی رسائی ہوتی
کل جو آنی تھی بلا ، آج ہی آئی ہوتی
روز ہجراں شب تاریک جدائی ہوتی
مرض عشق و طبیعت سے لڑائی ہوتی
قدِ موزوں رخِ رنگیں جو دکھاتا تو انھیں
سرو و قمری ، گل و بلبل میں جدائی ہوتی
دست محبوب کا مرجاں نے دیا تھا دھوکا
پنجہ جیسا تھا جو ویسی ہی کلائی ہوتی
چھین کر دل کو لیا ، خوب کیا اے شہِ حسن
مانگ کر ہم سے جو لیتا تو گدائی ہوتی
دولت اللہ سے کرتے جو طلب دیوانے
نقرئی طوق ، تو زنجیر طلائی ہوتی
بزمِ رنگیں میں تری سبز قدم رہنے نہ پائیں
گھاس اکھڑتی جو چمن سے تو صفائی ہوتی

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱٦٦ ، نولکشور قدیم ص ۱۵۳ ، جدید ص ۲۴۳ -

ذاتِ باری کو کیا ظلمِ بُتاں نے ثابت
عدل کرتے یہ اگر اِن کی خدائی ہوتی

چھوٹتے بند محبّت کے گرفتار اگر
طوق سے گردنِ قمری کی رہائی ہوتی

عیش ہوتا کچھ اگر غم کدۂ دنیا میں
روح قالب میں خوشی سے نہ سمائی ہوتی

گھر گرایا جو مِرا سیلِ حوادث نے تو کیا
چار دیوار عناصر کی گرائی ہوتی

توڑتے آبلے دیوانۂ دستِ رنگیں
خار پر تہمتِ انگشتِ حنائی ہوتی

غیر گھورے نگہِ بد سے تجھے، حیف ہے یار
آنکھ ہم سے جو لڑاتا تو لڑائی ہوتی

اُن عذاروں کی جو پاتی یہ صباحت آتش
یاسمیں باغ میں پھولے نہ سمائی ہوتی

۲۹

پیرہن تیرے شہیدوں کے گلستاں ہو گئے
زخمِ خنداں غیرتِ گل ہائے خنداں ہو گئے

آرزوے دل رہی نا آشناے گوشِ یار
حرفِ مطلب اپنے منہ تک آ کے دنداں ہو گئے

حسن وہ شے ہے کہ پتّھر میں بھی کرتا ہے اثر
چشمِ عاشق کی طرح آئینے حیراں ہو گئے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۶۷، نولکشور قدیم ص ۱۵۴، جدید ص ۲۴۴، بہارستانِ سخن ص ۲۳۲ -

منزلِ دل کی خرابی کا الم کیا کیجیے
کیسے کیسے خانۂ آباد ویراں ہو گئے

سیرِ نیرنگِ جہاں دیکھا کیے رندانِ عشق
شیعہ سنّی ہو گئے ، ہندو مسلماں ہو گئے

عاشقوں سے ٹیڑھے رہنے کی سزا آخر ملی
چشم سے برگشتہ تیرے موے مژگاں ہو گئے

کیا نفاق انگیز چلتی ہے زمانے میں ہوا
سیکڑوں مجموعۂ صحبت پریشاں ہو گئے

آہ بر لب ، داغ بر دل ، بسکہ عبرت نے کیا
شمع و گل ہم بر سرِ گورِ غریباں ہو گئے

موسمِ گل کر دیا اُن کی قباے سرخ نے
چاک تا دامن ہزاروں ہی گریباں ہو گئے

زخم کھانے کا مزا دل کو ملے گا وقتِ قتل
ابروے قاتل بھی جو دو تیغ عریاں ہو گئے

دل نے جب سمجھا ہمارے یادگارِ رفتگاں
یوسف اپنی آنکھ میں داغِ عزیزاں ہو گئے

جو چلن چاہیں چلیں آتش بُتانِ بے وفا
حسن جب پیدا ہوا سب عیب پنہاں ہو گئے

۳۰

[1]کوے جاناں چمن سے بہتر ہے
اُس کا کتّا ہرن سے بہتر ہے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱٦۷ ، نول کشور قدیم ص ۱۵۴ ، جدید ص ۴۴۲ -

گل قبا پر ہو جامے سے باہر
کب ترے پیرہن سے بہتر ہے
گور میں بھاگ اہلِ دنیا سے
خلوت اِس انجمن سے بہتر ہے
چمنِ دہر کا ہے ہر گل خوب
نسترن ، یاسمن سے بہتر ہے
ہنسنے والا نہیں ہے رونے پر
ہم کو غربت وطن سے بہتر ہے
ترکِ دنیا سمجھ جواں مردی
نفرت اس پیرزن سے بہتر ہے
بازو آس کا مکاں فکم آس کا
دھکدکی نو رتن سے بہتر ہے
نہیں کھلتا کسی طرح سے پھر
عیب پوشی کفن سے بہتر ہے
سیب ہے یہ تو پھر بہی ہے وہ
غبغب اے دل ذقن سے بہتر ہے
مانگیے کیا خدا سے چشمۂ خضر
کیا صنم کے دہن سے بہتر ہے ؟
دشمنِ جاں اجل کو جان آتش
دوستی گورکن سے بہتر ہے

۳۱

[1]کون سی شب ہے جو رو رو کے نہیں کٹتی ہے
شام ہوتی ہے اُدھر ، چھاتی اِدھر پھٹتی ہے

صورتِ شمع ہوں ہر چند فروغِ محفل
بات کرنے نہیں پاتا کہ زباں کٹتی ہے

دردِ دل سے کبھی نالہ جو کر اٹھتا ہوں میں
آسماں چرخ میں آتا ہے ، زمیں پھٹتی ہے

کس کی دیوار کے سایے کا میں دیوانہ ہوں
میری پرچھائیں سے دیوار پرے ہٹتی ہے

لاش پر لاش نکلتی ہے ترے کوچے میں
کیا تماشا ہے کہ پھر بھیڑ نہیں چھٹتی ہے

بینیِ یار سے دعویٰ ہے گلِ زنبق[2] کو
بے حیائی سے مگر ناک نہیں کٹتی ہے !

حسن سے اپنے وہ نادان ہوا ہے آگاہ
آرسی سامنے سے اُس کے نہیں ہٹتی ہے

بوسے کا اُس لبِ شیریں کے زباں نام نہ لے
جان جاتی ہے ، مٹھائی نہیں کچھ بٹتی ہے

عشقِ محبوب میں غم ہے کسے مر جانے کا
جان جاتی نہیں ، عاشق کی بلا کٹتی ہے

طلب آرام کی بے جا ہے گرفتاری میں
کب بھلا خانۂ زنجیر میں چھت پٹتی ہے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۶۷ . نول کشور قدیم ص ۱۵۴ ، جدید ص ۲۴۵ -
۲ - ایک قسم کا لمبا سفید پھول - مرہم زخم کا بھی ایک جزو ہے -

شبِ ہجراں کی درازی کا گلا کیا کیجے
خضر کی عمر بھی دو چار گھڑی گھٹتی ہے
گوش وہ ہے جو سنا کرتا ہے افسانۂ حسن
وہ زباں ہے جو صنم نام ترا رٹتی ہے
سائلِ دولتِ دنیا ہوں میں اے آتش کیا
گنجِ قاروں سے بھی اوقات نہیں کٹتی ہے

۳۲

[1] آنکھ پڑتے ہی قرار و صبر و طاقت لے گئے
خالِ مشکیں دلبری میں گوے سبقت لے گئے
خاک چھانی ہم سبک روحوں نے مثلِ گردباد
وادیِ پُر خار سے تلوے سلامت لے گئے
زہر کھا کر اک شکر لب پر مُوا ہوں دیکھنا
قبر پر دشمن گھڑے بھر بھر کے شربت لے گئے
عالمِ اسباب سے حاصل ہوا آخر کفن
چلتے چلتے آسماں سے ہم بھی خلعت لے گئے
ناتوانی سے فشارِ قبر کی طاقت نہ تھی
گور میں بھی تیرے عاشق کو امانت لے گئے
تیرہ بختی کے اثر نے شام سے گل کر دیا
صبح کو کتوے اٹھا کر شمعِ تربت لے گئے
دیدۂ دل نے گھسیٹا کوچۂ محبوب میں
کھینچ کر مجھ کو فرشتے سوے جنّت لے گئے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۶۸ ، نول کشور قدیم ص ۱۵۵ ، جدید ص ۲۴۵ -

باغِ عالم میں ہے نا فہموں کو بے برگی کا غم
سبز پتے اس چمن سے زرد صورت لے گئے
کوئی مومن ہو نہ ِگل در ِگل النہی بعد مرگ
وائے برحال اُن کے جو دل میں کدورت لے گئے
گردشِ چشمِ غزالاں نے ستایا دشت میں
ساتھ اپنے ہر جگہ ہم اپنی قسمت لے گئے
مصحفِ[1] رخسار کے مضمون سوا مضمون نہیں
سب کے مضمون پر مرے مضمون فضیلت لے گئے
دیکھ سکتے تھے کہاں کافر مسلماں کی نمود
کھود کر بت ساز آتش سنگِ تربت لے گئے

۳۳

ہے[2] یہ اُمّیدِ قوی زلفِ رسائے یار سے
گنج چھینے ، مُہرہ اُگلائے دہانِ مار سے
سامنا جب اس مسیحا کا ہوا بیمار سے
بھر دیے آنکھوں کے کاسے شربتِ دیدار سے
نازک اندامی میں کیا نسبت کسی کو یار سے
بندھیاں پڑتی ہیں اس گل کے بدن پر ہار سے
کم ہے ایذا ہو جو کچھ عاشق کو زلفِ یار سے
یہ بلائے بد زیادہ ہے شبِ بیمار سے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش میں یہ نواں شعر ہے -
۲ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۶۸ ، نول کشور قدیم ص ۱۵۵ ، جدید ص ۲۴۵ ، بہارستان سخن ص ۲۰۳ -

چاہیے لے کر جواب نامہ قاصد ہو پھرا
بالِ ہُدہُد کی ہوا آتی ہے کُوے یار سے
بعدِ مُردن بھی رہے گا دل کو شوقِ قصرِ یار
سایہ بن کر روح لپٹے گی مری دیوار سے
عاشقوں کے دل کو پیسا کرتی ہے مشقِ خرام
رہتی ہے پازیب نالاں یار کی رفتار سے
وجدِ اہلِ حال سے یہ منکشف ہم کو ہوا
پردے کی آواز سن لیتے ہیں موسیقار سے
بادشاہ حسن نے خلعت دیا ہے عشق کا
یہ علاقہ ہے ہمارے نام پر سرکار سے
مُشتریِ حسن مجھ سا دوسرا عاشق نہیں
بوے یوسفؑ آتی ہے گھر میں مرے بازار سے
کر دیا ہے عشقِ زلفِ یار نے خوش ذائقہ
شہد کا ہم کو مزا ملتا ہے زہرِ مار سے
جان سودے میں تمھارے خالِ رخ کے جائے گی
رکھتی ہے پرہیز یہ حَبِّ شفا بیمار سے
دامنِ نظّارہ لب‌ریزِ جواہر کیجیے
ہنس کے دکھلا دیجیے دنداں دُرِ شہوار سے
شب کی شب میں ہو گئی اس مرتبہ دل بستگی
صبح کو روتی ہوئی شبنم گئی گلزار سے
دم فنا ہوتے ہیں دیکھے سے تمھارا بانک پن
قتل کرتی ہے یہ شملے کی لٹک دستار سے
غیر سے احوال ہُرمی یار کرتا ہے مری
گوشِ گل بُلبُل کی سنتا ہے زبانِ خار سے

دل کو داغِ عشق حسن آیا زمانے میں پسند
یہ شگوفہ لے چلے آ کر ہم اِس گلزار سے

بے سبب مشقِ خرامِ ناز صاحب کی نہیں
کبک کو سیدھا کرو گے پائے کج رفتار سے

حسن سے ساق کے حاصل ہوگی کیفیّاتِ عشق
مست ہو کر جائیں گے ہم خانۂ خمّار سے

آرزومندِ شہادت ہوں ، ارادہ ہے یہی
بھیک مانگوں زخم اے قاتل تری تلوار سے

کی نہ جن آنکھوں نے بُلبُل کی نگہ سے سیرِ باغ
ہم نے یہ جانا کہ نابینا گئیں گلزار سے

لوٹ لینے کا ارادہ مردمِ دیدہ کا ہے
سامنا تو ہو نگہ کا دولتِ دیدار سے

حشر کی گرمی میں تو یاد آئے گا اے قصرِ یار
دھوپ بچ جاتی ہے تیرے سایۂ دیوار سے

خارِ خارِ دل سے جاتی ہے ہماری جان ، یار !
دور کر یہ غنچہ سا گھونگھٹ گلِ رخسار سے

آنکھ رغبت کی اگر میری طرح سے ڈالتا
پھانسی دلواتا برہمن کو وہ بت زنّار سے

نیند آتی ہے کسے آتش فراقِ یار میں
خواب کو نفرت ہے اپنے دیدۂ بیدار سے

۳۴

[1]کوچۂ یار میں چلیے تو غزل خواں چلیے
بُلبُلِ مست کی صورت سے گلستاں چلیے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۶۹ ، نولکشور قدیم ص ۱۵٦ ، جدیدص ۲۴۷ -

دن کو ملتا نہیں وہ ماہ ، نہیں تو کہتا
رات بھر کے لیے گھر میں مرے مہماں چلیے
پاؤں میں تا رہے رفتار کی طاقت باقی
پیچھے پیچھے ترے اے عمرِ گریزاں چلیے
زلف میں لعل لبِ یار کا مشتاق ہے دل
ہند سے کوچ جو کیجے تو بدخشاں چلیے
شوق صحرا کا جو ہوتا ہے تو کہتا ہے جنوں
تیغ کی طرح سے میدان میں عریاں چلیے
دم فنا کیجیے اپنا نفسِ سرو کے ساتھ
ٹھنڈے ٹھنڈے طرفِ گورِ غریباں چلیے
کافرِ عشق فرشتے کی نہیں سنتے ہیں
کس سے کہتا ہے وہ غارت گرِ ایماں ، چلیے
ہاتھ سے ہاتھ چھڑا کر وہ گئے ہیں جب سے
قصہ رہتا ہے یہی پاؤں کو یاں ، واں چلیے
رہنما جوشِ جنوں سا ہے بہارِ گل میں
طوق و زنجیر پہن لیجیے ، زنداں چلیے
زلف کے سودے میں اک عمر بسر کی آتش
بس بہت دیکھ چکے خوابِ پریشاں ، چلیے !

۳۵

ابرنگِ آئنہ انساں کی قسمت ہے اگر سیدھی
موافق ہے زمانہ ، دوست دشمن کی نظر سیدھی

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۶۹ ، نول کشور قدیم ص ۱۵٦ ، جدید ص ۲۴۸ -

زمیں پر پاؤں رکھ کر آسماں پر ناز کرتا ہے
مگر ٹھوکر سے چرخِ پیر کی ہوگی کمر سیدھی
سرِ مغرور کو جمعیّتِ دنیا جھکاتی ہے
نہیں دیکھی چمن میں ہم نے شاخِ بارور سیدھی
نہ پستی و بلندی ہے ، نہ ایسے پھیر کے رستے
عدم کی راہ سب راہوں سے ہے اے بیخبر سیدھی
نہیں زور آوری میں بازوے قاتل کی شک ہرگز
کرے گی صاف دو ٹکڑے پڑی تلوار اگر سیدھی
پس از مُردن بھی حسرت باقی رہتی ہے جوانی کی
لحد میں کرتے ہیں پیرانِ خم گشتہ کمر سیدھی
اثر کرتی نہیں تعلیمِ تیرہ روزگاروں کو
اِدھر ٹیڑھی ہوئی شانے نے کی وہ زلف اُدھر سیدھی
کرے گی صاف چیں اُن ابروؤں کی گرمیِ صہبا
کماں رخ کر گئی جب پھر وہ ہوگی آگ پر سیدھی
محبّت ہے ہمیشہ کاملوں کو راست بازوں سے
کمر میں رکھتے ہیں تلوار راوت[1] بیشتر سیدھی
غریب آزار کا انجامِ کار اچھا نہیں ہوتا
بس اب اے آہ چرخِ پیر پر برچھی نہ کر سیدھی
جو منہ میں یار کی آتا ہے بک جاتا ہے اے آتش
نہ اُلٹی ہی سمجھتا ہے ، نہ وہ رشکِ قمر سیدھی

---

۱ - بہادر سپاہی - راجپوت بانکا -

۳٦

[1]کوچہ تیرا عیش باغ[2] اے یار! بے تاویل ہے
چشمِ اشک آلودِ عاشق اُس میں موتی جھیل ہے

آفتِ جاں سامنا اُس کا ہے انساں کے لیے
خوب صورت جس کو کہتے ہیں وہ عزرائیل ہے

معنیِ توریت موسائی سمجھتے ہیں تجھے
واسطے عیسائیوں کے مطلب انجیل ہے

بلبل و قُمری ہیں نالاں راہِ کوے یار میں
گل جو ہے سنگِ نشاں ہے سرو جو ہے میل ہے

گِرد رہتے ہیں ستارے رات بھر پروانہ وار
ماہِ تاباں کون سے دروازے کی قندیل ہے

جلوۂ قربانیانِ عشق کس دن واں نہیں
روز اُس یوسف کے کُو میں عیدِ اسماعیل ہے

کیا سمجھ کر بلبلوں کو حسن سے اُس کے ہے عشق
چار دن میں رنگِ رخسارِ چمن تبدیل ہے

عشق بازی میں ہمیں فرہاد و مجنوں سے ہے فوق
لیلیٰ و شیریں سے تم کو حسن میں تفضیل ہے

بے سر و پائی نے پایا ہے یہ عالم میں رواج
پا جو ہے بے کفش ہے، سر ہے سو بے مندیل ہے

۱- کلیات طبع علی بخش ص ۱۷۰، نول کشور قدیم ص ۱۵۷، جدید ص ۲۴۸ -

۲ - لکھنؤ میں 'عیش باغ' اور 'موتی جھیل' عہدِ آصف الدولہ کے دو خوب صورت تفریحی مقام تھے جن کے نام باقی ہیں مگر نشان مٹ چکے -

بادشاہِ وقت اُس کے شیفتہ ہیں اے صنم
گیسوؤں کا تیرے سودا ہند کی تحصیل ہے
شعر الہامی یہ پہنچاتی ہے وہ لاتا تھا وحی
فکرِ عالی منزلت بھی ہمرہِ جبریل ہے
راہ پر لاتے ہیں جب گمرہ ہوا ہے آسماں
بیشتر ہم نے بنایا ہے جو بگڑا نیل ہے
جو کہ دیوانہ ہے حاضر ہووے بازی گاہ میں
لڑکوں کو چھٹی ہے، روزِ جمعہ ہے، تعطیل ہے
عشق کے غم سے کوئی نعمت نہیں لذت سرشت
نوش کیجے اس غذا کو جس قدر تحلیل ہے
منتظر ہے چشم روزِ وعدۂ دیدار کی
گوش مشتاقِ صدائے صورِ اسرافیل ہے
بیشۂ عشق و جنوں کی سیر کے قابل ہے تو
[۱]شیر کے مانند آتش تجھ میں زورِ فیل ہے

۳۷

[۲]کیفِ مے نے سرخ وہ رخ کر دیا عناب سے
آتشِ گل کس مزے کے ساتھ بھڑکی آب سے
تیرے سودے میں کھلونا بن گیا ہے اے پری!
کھیلنے آتے ہیں طفل اپنے دلِ بے تاب سے

---

۱ - علی بخش کے نسخے میں یہ مصرع غلط چھپا ہے:
"شیر کی سی دلیر آتش تجھ میں -"
۲ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۷۰، نول کشور قدیم ص ۱۵۷، جدید ص ۲۶۹، بہارستانِ سخن ص ۲۲۳ -

باغِ عالم میں ہو تسکیں خاک مجھ بیمار کو
اک زنخداں سیب سا ، دو لب نہیں عناب سے
سامنا ہوتا ہے بے تیرے جو اے آرامِ جاں !
مردمِ دیدہ چرا لیتے ہیں آنکھیں خواب سے
دیکھتے ہیں زور اپنے ہاتھ کا وہ آج کل
خونِ عاشق مَل کے پنجہ کرتے ہیں قصّاب سے
تم اندھیری رات میں اُلٹو جو چہرے سے نقاب
روے رشکِ مہر ذروں کو جگا دے خواب سے
رعشۂ پیری تھا تن کو گریۂ طفلی سے قہر
زلزلے سے ڈھے گیا بچ کر یہ گھر سیلاب سے
چاہتا ہوں یار کو پیشِ نظر آٹھوں پہر
مانگتا ہوں رات پروانے سے ، دن سُرخاب سے
کیمیا گر دیکھ کر کہتے ہیں خطِ سبزِ یار
کُشتہ اس بُوٹی سے ہوں گے سیکڑوں سیماب سے
حلقے اُن آنکھوں کے ہیں یوں ابروؤں سے خوش نما
خوب صورت جیسے ہو جاتا ہے دَر محراب سے
جسمِ خاکی ہو گیا داخل گڑھے میں گور کے
کھنچ گئی آخر یہ کشتی جذبۂ گرداب سے
حسن اگر چلنے لگے عاشق نوازی کا چلن
کبکِ مردہ کا کفن ہو چادرِ مہتاب سے
جان بچتی عشق بازی میں نظر آتی نہیں
دوستی رکھتا ہے دل اک دشمنِ احباب سے
بوسہ دینے کا نہیں ہرگز زنخداں کا وہ شوخ
تشنہ لب محروم پھرتا ہے چہِ بے آب سے

یار کے رخسارِ روشن پر ہے افشاں کا عجب
کیونکر انجم پیش آئے مہرِ عالم تاب سے
دل نے اے آتش کیا داغِ محبّت کو پسند
ساتھ جاوے گی یہ شے اس عالمِ اسباب سے

۳۸

[1]گل سے افزوں مری آنکھوں میں ہیں دل جو کانٹے
پھول رکھتے ہیں[2] تری بو، تو تری خو کانٹے
شیفتہ سبزۂ خط کا نہ ہو اے دل! ہرگز
بے شعور اپنے لیے آپ نہ بو تو کانٹے
ہم نشیں دل نہیں، اک آبلہ سا پکتا ہے
جی میں آتا ہے بھروں چیر کے پہلو کانٹے
نہ تو بلبل نظر آتا ہے چمن میں نہ تو گل
اک طرف برگِ خزاں ڈھیر ہیں، اک سو کانٹے
کام اک آبلے کا آن سے نہیں ہوتا ہے
نہیں معلوم ہیں کس درد کی دارو کانٹے
بد سرشتوں کو نہ نیکوں کا اثر ہو ہرگز
صحبتِ گل سے نہ ہوویں کبھی خوش‌بو کانٹے
گرم رفتاری سے ہر آبلہ اک اخگر ہے
پاؤں سے میرے تہی کرتے ہیں پہلو کانٹے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۷۱، نول کشور قدیم ص ۱۵۷، جدید ص ۲۵۰ -
۲ - علی بخش کے نسخے میں دوسرے مصرع کی صورت یہ ہے:
"پھول رکھتا ہے تری بو تو تری خو کانٹے"

زاہدِ خشک کے ایماں کا یقیں ہو کیونکر
نہ مسلماں ہیں ثابت ، نہ تو ہندو کانٹے
پا خراشی ہے مری کوہ کنی سے افزوں
پہلے پیدا تو کریں قوتِ بازو کانٹے
باغِ عالم میں جو راحت ہے تو پھر رنج بھی ہے
تا کمر گل ہیں تو یاں تا سرِ زانو کانٹے
ایک دن دعوتِ جنازۂ لیلٰی ہوگی
اس لیے بیچ میں مجنوں ہے یہ ہر سو کانٹے
دیکھتے ہی انھیں تلوے مرے کھجلاتے ہیں
اے جنوں ! جانتے ہیں کیا کوئی جادو کانٹے ؟
خار خارِ غمِ الفت کا اثر کیا کہیے
نکلے آخر مرے تن پر عوضِ مُو کانٹے
کیا سمجھ کر انھیں خوش چشموں سے نسبت دیجیے
پھول یہ سونگھتے ہیں ، کھاتے ہیں آہو کانٹے
جو نہ دے رنج کسی کو اسے ہوتا نہیں رنج
پاؤں پر میرے نہیں پانے کے قابو کانٹے
یارو اغیار کو روپوشی ہے مجھ سے آتش
گل ہی یاں سامنے آتا ہے ، نہ بر رو کانٹے

۳۹

[1]وہم سا اک اے بتِ مغرور ! پیراہن میں ہے
نام کو میرا تنِ رنجور پیراہن میں ہے

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۷۱ ، نول کشور قدیم ص ۱۵۸ ،
جدید ص ۲۵۰ -

شمعِ ایمن وہ سراپا نور پیراہن میں ہے
داغِ سینہ یاں چراغِ طور پیراہن میں ہے
جسم کے جامے کو بھی دیکھا تو ہے زندانِ تنگ
سخت دیوانہ ہے جو مسرور پیراہن میں ہے
موجِ عنبر ہے کہ سیلی ہے شکم پر یار کے
ناف ہے یا چشمۂ کافور پیراہن میں ہے
نیش سی لگتی ہے ٹھنڈی سانس ہجرِ یار میں
روح قالب میں نہیں ، زنبور پیراہن میں ہے
عطر کیا ملتا ہے غافل ، آخر کار ایک دن
بوے آبِ سدرہ و کافور پیراہن میں ہے
یار کی تصویر کھنچواؤں تو کہتا ہے وہ شوخ
قالبِ بے جاں کسے منظور پیراہن میں ہے
چار دیوارِ چمن ہے یاں لباسِ خستہ تن
داغ کا گل زخم کا انگور پیراہن میں ہے
شبہ ہو جاتا ہے مجھ کو شمع کا فانوس میں
نور کا عالم ترے اے حور پیراہن میں ہے
ناتوانی سے ہے یکساں ظاہر و باطن مرا
تار پیراہن ، تنِ رنجور پیراہن میں ہے
عالمِ نیرنگ ہے دنیا ، طبائع مختلف
تنگ ہے غنچہ تو گل مسرور پیراہن میں ہے
مصرعِ رقّت کو پڑھیے ، کپڑے آتش پھاڑیے
"ہے قبا میں عقرب اور زنبور پیراہن میں ہے"

۴۰

اپیری میں آئے وہ رخِ روشن نظر مجھے
دکھلائے آفتاب کی صورت سحر مجھے
خالِ رخِ صبیح ہے مدِ نظر مجھے
یوسف[۴] سے بھی عزیز ہے زنگی پسر مجھے
اے نونہال ! تو بھی دکھا چشمِ نرگسی
دکھلا رہے ہیں اپنے شگوفے شجر مجھے
جاتا ہوں اڑ کے شہر سے صحرا بہار میں
جوشِ جنوں پری کے لگاتا ہے پر مجھے
بے قصرِ یار میں گئے آیا نہیں قرار
دیوار پھاندی ، بند ملا ہے جو در مجھے
گم ہوں خیال میں دہنِ ناپدید کے
رکھتی ہے پیچ و تاب میں نازک کمر مجھے
قاصد کی طرح قتل جو کرتے تو عید تھی
ہونا تھا خطِ شوق کا خود نامہ بر مجھے
کانوں نے میری یاد[۲] ، مرے ہوش اڑا دیے
تیری خبر سنا کے کیا بے خبر مجھے
رسوا چکور سے ہوں سوا اس کے عشق میں
پہچانتا ہے خوب وہ رشکِ قمر مجھے
لب بند ہو گئے لبِ شیریں کے وصف میں
میرا دہن ہوا گرہِ نیشکر مجھے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۷۲ ، نول کشور قدیم ص ۱۵۸ ، جدید ص ۲۵۱ ، بہارستان سخن ص ۲۳۰ -
۲ - نولکشور : ''میرے یار میرے ہوش'' اصل مطابق نسخہ علی بخش ہے۔

کس مست کا خیال ہوں ، پیرانِ پارسا
عینک کی طرح رکھتے ہیں پیشِ نظر مجھے
پیری میں چب سکی جو نہ روٹی تو آئی یاد
دانتوں سے کھولنی گرہِ نیشکر مجھے
برسوں سے میں خراب ہوں دل کی تلاش میں
رکھتا ہے شوقِ کعبہ میانِ سفر مجھے
سودے میں تیغِ ابروے خم دارِ یار کے
گردن وبال ہو گئی ہے ، بوجھ سر مجھے
دونوں جہاں کے کام کا رکھّا نہ عشق نے
دنیا و آخرت سے کیا بےخبر مجھے
واماندگی سے میری نہ نالاں ہو اے جرس !
منزل میں سب سے دیکھیو تُو پیشتر مجھے
معشوق تھے ، غرور سزاوار تھا تمھیں
شکوہ نہیں ہے ، تم نے نہ پوچھا اگر مجھے
حلقوں سے زلفِ یار کے تھرّا رہا ہوں میں
پھانسی نہ دیں کہیں ، یہی رہتا ہے ڈر مجھے
ملتا نہیں ہے دل سے بھی میرے مرا مزاج
صحبت کا تیری یار ہوا ہے اثر مجھے
طالب نہیں ہے دولتِ دنیا کا دل مرا
اس سیم تن کا وصل ہے تحصیلِ زر مجھے
جب دیکھتا ہے یار تو ہے دانت پیستا
ڈوبوں گا میں ، ڈبوئے گا آبِ گُہر مجھے
شمشیرِ خارجی نہیں ہونے کی کارگر
حُبِّ علیؑ کی کافی ہے آتش سپر مجھے

۴۱

'چمن کا رنگ تجھ بن اپنی آنکھوں میں مبدّل ہے
چراغِ لالہ چشمِ غول ہے ، گلزار جنگل ہے
شب تاریک مرقد دیکھتے ہی یار کو دیکھے
دمِ آخر ہمارا ، عاشقی کا روزِ اول ہے
ہزاروں حسرتوں کے روز و شب ہوتے ہیں خوں اس میں
نہیں معلوم دل ہے یا مرے پہلو میں مقتل ہے
بدن سے یار کے نرمی میں کچھ نسبت نہیں اس کو
جو مخمل وہ شکم تا ناف ہے تو ٹاٹ مخمل ہے
قدم رکھتے تو گل درِ گل رقیبِ روسیہ ہووے
گلی میں یار کی ایسی مرے اشکوں سے دلدل ہے
سوا تیرے کسی کا دھیان آتا ہو تو کافر ہوں
دوئی جس دل میں ہے وہ دل نہیں ہے چشمِ احول ہے
بنایا ہے اسے شاید کہ دودہ روغنِ گل سے
ہزاروں گل پھلاتا یار کی آنکھوں کا کاجل ہے
جو عالم حسن رکھتا ہے تو حالت عشقِ غارت گر
کہیں زلفِ مسلسل ہے ، کہیں اشکِ مسلسل ہے
جو روتا ہوں تو دو دو دن مرے آنسو نہیں تھمتے
ہجومِ یاس سے ابرِ مژہ ساون کا بادل ہے
فروغِ ظاہری کرتا ہے کیا ، باطن کو روشن کر
طلائی گو کہ ہو ، مطلب سے خارج خطِ جدول ہے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۷۳ ، نول کشور قدیم ص ۱۵۹ ، جدید ص ۲۵۲ -

پہنچتی ہے مجھے ہر صبح بے کوشش مری روزی
توکل آدمی کے واسطے گویا موکل ہے

وہی عالم ہے اب تک خاکساران محبت کا
وہی نقش قدم کی خاک پیشانی کا صندل ہے

ہوا ہے آج مجنوں عشق میں لیلیٰ کے دیوانہ
یہ زنجیر اس کی گردن میں مری طفلی کی ہیکل ہے

اندھیری رات میں دیتی ہے دھوکا روشنی مجھ کو
فروغ حسن سے کس کا رخ پر نور مشعل ہے

بہار آئی ہے، ہنگام جنوں ہے، کپڑے پھٹتے ہیں
مسلسل ہوں میں دیوانہ، در زنداں مقفل ہے

تفاوت ہے بڑا آئینۂ و آئینہ رو میں
یہ صیقل کا نہیں محتاج، وہ محتاج صیقل ہے

فقیری جس نے کی گویا کہ اس نے بادشاہی کی
جسے ظل ہما کہتے ہیں، درویشوں کا کمبل ہے

کتابی چہرے پر زلف پریشاں ہے وہ مجموعہ
کہ جس کے سامنے اک مختصر نسخہ مطول[1] ہے

لب نان جوین خشک، رکھتا ہے دہن شیریں
قناعت شہد ہے آتش، ہوا و حرص حنظل ہے

---

۱ - ''تلخیص المفتاح'' کی دو شرحیں : ''مختصر المعانی'' اور ''المطوّل ۔''
یہ علم معانی و بیان و بدیع میں شیخ سعدالدین تفتازانی کی یہ مشہور کتابیں ہیں ۔

۴۲

[1]ہاتھ مشتاقِ گریباں ہے ، جنوں کا جوش ہے
پیرہن تن پر مرے گرمی میں بالا پوش ہے

دور ہوں یک جائی پر بھی صورتِ فانوس و شمع
ہے بغل میں یار ، پر خالی مرا آغوش ہے

کشورِ خوباں میں مرگ و زیست دونوں ہیں خراب
بارِ خاطر زندہ ہے ، مُردہ وبالِ دوش ہے

جان جاتی ہے ولیکن آہ دل کرتا نہیں
ناقۂ لیلیٰ رواں ہے پر جرس خاموش ہے

کوچہ و بازار میں رسوا نہ کر عاشق کو تو
اے صنم ! اللہ کو سنتے ہیں پردہ پوش ہے

عاقل اتنے تو بکارِ خویش ہم دیوانے ہیں
موسمِ گل تک گریباں پھاڑنے کا ہوش ہے

حالِ دل سن کر وہ چپکا ہو رہا ، میں خوش ہوا
نیم راضی کا نشاں ، یعنی لبِ خاموش ہے

روتے روتے پانی ہو کر بہہ گیا آخر کو میں
قصرِ تن کے ڈھانے کو سیلابِ دل کا جوش ہے

ضعفِ پیری سے نہیں ہوتا ہے قد انساں کا خم
توڑتی آخر کمر کو حسرتِ آغوش ہے

دردِ دل کہنے کی خو مجھ کو ، نہ سننے کی اسے
عہد میں میرے زباں نایاب و عنقا گوش ہے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۷۳ ، نول کشور قدیم ص ۱۵۹ ، جدید ص ۲۵۳ -

ہوں وہ دیوانہ ، گرفتاری ہے جس کو زندگی
طوق کا حلقہ پری کا حلقۂ آغوش ہے

موت کا سامان ہے بے یار سامانِ نشاط
لب تو ساغر نوش ہیں پر دل مرا خوں نوش ہے

گور میں کیوں کر قوی ہووے نہ اُمّیدِ وصال
رات اندھیری ہے ، چراغِ خانہ تک خاموش ہے

ناگوار آتش ہے اپنی ہمّتِ مردانہ کو
باندھنا مضمونِ غیر آتری ہوئی پاپوش ہے

۴۳

[1]فصلِ گل ہے خون . . . [2]دختِ رز کا جوش ہے
گردنِ قاضی میں دستِ رندِ ساغر نوش ہے

یار سے دست و بغل ہونا ہے عنقا کا شکار
تنگ اُس گل کی قبا سے بھی مرا آغوش ہے

حالِ دل ہوتے ہیں حسرت کی نگاہوں سے عیاں
میری اُس کی گفتگو میں اب زباں خاموش ہے

پشت بر دیوارِ حیرت ہیں ہزاروں صورتیں
صاحبِ آئینہ خانہ آج تک رو پوش ہے

جامۂ ہستی جنوں میں مثلِ گل پُرزے اڑا
سنگ یاں بہرِ شکستِ شیشہ ، مے کا جوش ہے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۷۳ ، نول کشور قدیم ص ۱۶۰ ، جدید ص ۲۵۳ ، بہارستانِ سخن ص ۲۴۸ -

۲ - یہاں سے ایک لفظ بر بنائے کثافت حذف ہے -

موسم سرما میں رُلواتا ہے پہلوے تہی
اب کفِ دریا بدن پر میرے بالاپوش ہے

وصل کی شب کھوئی شادی مرگ ہو کر جانِ زار
تنگ مردے پر ہماری گور کا آغوش ہے

فرطِ الفت کا مآلِ کار ہے عاشق کو موت
جب شرابی کو زیادہ نشہ ہو ، بیہوش ہے

مردہ کس بے کس کا دریا میں بہایا جائے گا
جس حبابِ بحر کو دیکھا سراپا دوش ہے

گفتگوے اہلِ غفلت کی حقیقت کچھ نہیں
خواب میں چِلّائے ہر چند آدمی ، خاموش ہے

اہلِ دنیا حالِ ہم دیگر سے کیا ہوں مطّلع
مجلسِ تصویر میں کس کو کسی کا ہوش ہے

یار سرگرمِ خرامِ ناز ، میں محوِ جمال
گوہرِ جانِ گرامی صدقۂ پاپوش ہے

کنجِ تنہائی میں بھی چِلّا کے رو سکتا نہیں
لوگ کہتے ہیں در و دیوار کے بھی گوش ہے

گل ہر اک ساغر بکف ، بُلبُل ہر اک نغمہ طراز
سیرِ باغ آتش مجھے ایماے ناؤ نوش ہے

۴۴

[1]پاس رسوائی سے دل پر مردے کا سا جبر ہے
ضبطِ نالہ ہجر کی شب میں فشارِ قبر ہے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۷۴ ، نول کشور قدیم ۱۶۰ ، جدید ص ۲۵۴ -

صاف میرے آنسوؤں کا تار ہے آس کی جھڑی
دیدۂ تر کا کسی عاشق کے رومال ابر ہے
پہلے پروانے سے مغزِ شمع میں لگتی ہے آگ
بے تامّل حسن بھی ہے، عشق اگر بے صبر ہے
کوچۂ محبوب میں مَیں، خانۂ کعبہ میں شیخ
بُت کدے میں برہمن، آتش کدے میں گبر ہے
مصحفِ رخ[۱] کی تلاوت میں ہوا ہے دم فنا
نور سے ایمان کے روشن ہماری قبر ہے
کان کھولے رکھتے ہیں، سن رکھا اسے اے وصلِ یار
اختیار آگے ترا اب ہجر ہم کو جبر ہے
شغلِ مے خواری چمن میں چل کے آتش کیجیے
فرش سبزے کا لبِ جُو ہے، ہوا ہے، ابر ہے

۴۵

[۲]خوں تیغ زنوں کے دمِ شمشیر سے ٹپکے
کیا کیا نہ کماں دار! ترے تیر سے ٹپکے
وہ حسن جوانی ہے ترا طفل کے مانند
دیکھے سے جسے رال لبِ پیر سے ٹپکے
دیواں میں ہمارے ہے مرقّع کا سا عالم
مضموں ہے زبس چاند سی تصویر سے ٹپکے
شب باش ہوں سایے تلے جس کے میں بلا کش
شبنم سی وہ چھت، شامتِ تقدیر سے ٹپکے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش: ''مصحفِ رُو۔''
۲ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۷۴، نول کشور قدیم ص ۱۶۱، جدید ص ۲۵۴ -

بے رنگی رہی مدِّ نظر گو سحر و شام
رنگِ شفق اس سقفِ زمیں گیر سے ٹپکے

کٹواتی ہے سر شمع جو ثابت قدمی سے
آنسو بھی نہ اندیشۂ گل گیر سے ٹپکے

وصفِ لبِ شیریں وہ کرے اپنی زباں سے
یوں شیرۂ جاں جس کی کہ تقریر سے ٹپکے

آہن کو کیا آب تپِ حارِ جنوں نے
قطرے ہوئے دانے، مری زنجیر سے ٹپکے

غصّے سے بھی کر لیجیے سرخ آنکھوں کو صاحب
خوں بھی مژۂ عاشقِ دل گیر سے ٹپکے

پونچھے نہ بھووں پر سے جو رومال پسینہ
آب ابروے خم دار کی شمشیر سے ٹپکے

جس نے کہ لکھا اس کو نہایت ہی وہ رویا
آنسو مرے حالات کی تحریر سے ٹپکے

کٹوائے جو بشّاشی سے سر میری طرح شمع
نادم ہو پسینہ ، رخِ گل گیر سے ٹپکے

دیکھے نگہِ بد سے جو عیسیٰ نفسوں کو
کوڑھی کی طرح شومیِ تقدیر سے ٹپکے

مے ہم سے غریبوں نے نہ پی ، سیکڑوں مہوے[1]
اس تابشِ خورشید کی تاثیر سے ٹپکے

اس مست کے ہو تیرِ نگہ کا جو نشانہ
مے چشمِ کبابِ دلِ نخچیر سے ٹپکے

---

۱ - مہوا : ایک پھل ہے جس کا پانی نشہ آور ہوتا ہے -

مثلِ شفقِ چرخ وہ مِہر آئے لبِ بام
رنگِ اثر اس نالۂ شب گیر سے ٹپکے
گر ابرِ سیہ جھومتا آتا ہے تو برسے
یہ فیلِ سیہ مستی کی تاثیر سے ٹپکے
بے رنگ زمیں ہو تو اسے کیا کرے شاعر
رینی[۱] ہو تو رنگ ریز کی تدبیر سے ٹپکے
مضموں کہو آتش اِنھیں یا آم اِنھیں سمجھو
ہاتھ آئے ہیں دو چار یہ تقدیر سے ٹپکے

۴۶

[۲]تیرہ و تار جہاں ہو دلِ روشن ٹوٹے
خاطرِ دوست نہ یاں خاطرِ دشمن ٹوٹے
آہ کھینچوں جو پیالے کو کبھی ٹھیس لگے
سر کو پھوڑوں میں صراحی کی جو گردن ٹوٹے
مُصحفِ رُو سے ترے کفر کی بنیاد مٹی
مسجدیں بننے لگیں، دَیرِ برہمن ٹوٹے
اثرِ سنگ کیا بادِ خزاں نے پیدا
شیشۂ رنگِ گل و لالہ و سوسن ٹوٹے
فکرِ درماں جو کروں دردِ دگر پیدا ہو
مُتّفق خار سے ہو، پاؤں میں سوزن ٹوٹے

---

۱ - رینی: کسم کے کپڑے کو پانی میں رکھ کر پانی کے ذریعے رنگ چُرانا -
۲ - کلیات طبع علی بخش ص۱۷۵، نولکشور قدیم ص۱۶۱؛ جدید ص ۲۵۵ -

ہوں میں وہ کشت بچے برق سے باراں میں اگر
لشکرِ مور پڑے غارتِ خرمن ٹوٹے

شاہدِ حسن کی بے داد گری سے ہے یقیں
پائے بت کو جو چھوئے دستِ برہمن ٹوٹے

حائلِ منزلِ مقصود سیہ بختی ہے
یا الٰہی ! کمرِ افعیِ رہزن ٹوٹے

اڑ چکے پُرزے جو اڑنے تھے گریباں بے مہر
پائے بت کو جو چھوئے ، دستِ برہمن ٹوٹے

سایہ ساں لگ چلی دیوار سے تیری جو نگاہ
بجلی بن بن کے ہر اک ذرۂ روزن ٹوٹے

پشت پاسنگ کو لگ جائے تو تھرّا جاوے
سر پٹکیے تو درِ قلعۂ آہن ٹوٹے

جلوۂ یار سے داغِ دلِ بے تاب ہوں دور
کشت پر یاس کے برقِ شرر افگن ٹوٹے

کوچۂ یار کی زینت ہے مری چشمِ پُر آب
رونقِ باغ کہاں ، جب چہِ گلشن ٹوٹے

اہلِ دنیا کی خرابی ہوئی ظاہر مجھ کو
نظر آئے جو کہیں گنبدِ مدفن ٹوٹے

اس رہِ سخت میں لائی ہے پیادہ قسمت
گر سوار آئے یقیں ہے سُمِ توسن ٹوٹے

آرزو ہے یہی **آتش** کی خدا سے اے دوست !
تیری پاپوش سے اک دن سرِ دشمن ٹوٹے

۴۷

اچلی ہے ایسی زمانے میں کچھ ہوا الٹی
کہ سیدھی بات سمجھتے ہیں آشنا الٹی

بیانِ حالتِ دل پیشِ یار ہو نہ سکا
زباں کبھی نہ دمِ عرضِ مدّعا الٹی

نہ روزِ ہجر ہی کچھ خوب ہے ، نہ شامِ فراق
گلیمِ بختِ سیہ سیدھی ہووے یا الٹی

نگاہِ نازبھی ترچھی کچھ اس صنم کی نہیں
خلافِ عشوہ و انداز ، ہے ادا الٹی

ہمارے خوں سے ہوئے دست و پائے قاتل سرخ
نصیب اپنے پھرے ، قسمتِ حنا الٹی

کسی طرح سے نہ ٹوٹا طلسمِ حسرت و یاس
درِ قبول سے ٹکرا کے سر ، دعا الٹی

خلافِ وضع ہے انساں کے واسطے معیوب
بدن کی زیب نہ ہووے کبھی قبا الٹی

شبِ فراق میں مَیں نے جو منہ لپیٹا ہے
خیالِ وصل میں پھروں نہیں ردا الٹی

گلہ ہے حشر کے دن ہم کو سخت جانی سے
ہزار بار پھری آن کر قضا الٹی

نگہِ یار کے پھرتے ہی ہم سے اے **آتش**
زمانہ پھر گیا ، چلنے لگی ہوا الٹی

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۷۵ ، نول کشور قدیم ص ۱۶۲ ، جدید ص ۲۵۲ -

۴۸

سر[1] شمع ساں کٹائیے ، پر دم نہ ماریے
منزل ہزار سخت ہو ، ہمت نہ ہاریے
مقسوم کا جو ہے سو وہ پہنچے گا آپ سے
پھیلائیے نہ ہاتھ ، نہ دامن پساریے
طالب کو اپنے رکھتی ہے دنیا ذلیل و خوار
زر کی طمع سے چھانتے ہیں خاک نیاریے
برہم نہ ہو مزاج کسی وقت آپ کا
ابتر ہوئی ہیں زلفیں نہایت ، سنواریے
بے وجہ رنگِ زرد نے دی تہمتِ طلا
اک عمر میری خاک کو چھانیں[2] نیاریے
نرگس کو صدقہ کیجیے بیمار چشم کے
زلفِ سیاہ پر تری ، سنبل کو واریے
تنہائی ہے ، غریبی ہے ، صحرا ہے ، خار ہے
کون آشنائے حال ہے ، کس کو پکاریے
ایمائے ناز ہے یہی اس شاہِ حسن کو
چینِ جبیں کو قتلِ جہاں پر ابھاریے
تبدیل روزِ وصل سے فرقت کی شب ہوئی
آئی ہوئی بلا ٹلی ، صدقہ اتاریے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۷۶ ، نول کشور قدیم ص ۱۶۲ ، جدید ص ۲۵۷ -

۲ - کلیات علی بخش : "اک عمر میری خاک کو چھانیں گے نیاریے" -

تم فاتحہ بھی پڑھ چکے ، ہم دفن بھی ہوئے
بس خاک میں ملا چکے ، چلیے ، سدھاریے
دکھلائی دے جو آنکھوں کو یوسف کا کارواں
چلّائیے ، جرس کی طرح سے پکاریے
نازک دلوں کو شرط ہے آتش خیالِ یار
شیشہ خدا جو دے تو پری کو اتاریے

۴۹

[1]یار قاتل ہے تو کس کو موت سے پرہیز ہے
سر تصدّق ہے ، اگر مژگاں کا خنجر تیز ہے
توڑیے زنجیرِ ہستی مثلِ تارِ عنکبوت
آج کل جوشِ جنوں کا اپنے لوہا تیز ہے
طولِ عمرِ خضر دے تم کو خدا اے مغبچو !
چشمۂ حیواں ہمیں پیمانۂ لبریز ہے
روئیے جس جا ، یقیں ہے واں سے پیدا ہو چنار
آتشِ پنہاں اس آبِ اشک میں آمیز ہے
زندگی کی کون سی صورت فراقِ یار میں
فتنہ انگیز آہ ہے ، نالہ بلا انگیز ہے
سر کو لے کر ہاتھ پر رکھ ، کوچۂ قاتل میں پاؤں
آسماں سے بھی سوا یاں کی زمیں خوں ریز ہے
افعیِ رہزن ہے سنبل حسن کے گلزار کا
کہنہ گُرگ اس بوستاں کا سبزۂ نوخیز ہے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۷۶ ، نول کشور قدیم ص ۱۶۲ ، جدید ص ۲۵۷ -

کاتبِ قدرت سے اپنی گفتگو ہے روزِ حشر
خطِ پیشانی ہمارے پاس دست آویز ہے
پرزے اڑتے ہیں ہمارے خط کے کوے یار میں
خونِ قاصد سے در و دیوار رنگ آمیز ہے
یارِ بن ساقی قیامت ہے مجھے ساغر کشی
قلقلِ مینا نہیں ہے ، شورِ رستا خیز ہے
زہر کھانا ہے ، نہ پینا اب شرابِ شوق کا
وصل کی شب ہے ، پیالہ ہجر کا لب ریز ہے
غیرِ رسوائی کبھی ان سے نہ کچھ حاصل ہوا
عشق سے نفرت ہے مجھ کو ، حسن سے پرہیز ہے
منزلِ مقصود تک اللہ پہنچائے ہمیں
وقتِ شب ہے ، ابر ہے ، صحراے آفت خیز ہے
عشق کی نیرنگ سازی کا بیاں کیا کیجیے
کوہ کن اس پر مرے جو کشتۂ پرویز ہے
ظلم کرتے ہیں بتانِ سنگ دل بہرِ نمود
شہرۂ آفاق خونِ خلق سے چنگیز ہے
فکر کی دقت سے یاں طبعِ رواں آگہ نہیں
توسنِ چالاک کو کیا حاجتِ مہمیز ہے
بلبلِ بستاں کے نالے سے یہ آتی ہے صدا
گوشِ گل نا آشناے حرفِ شوق آمیز ہے
اشک کے شامل ہے خونِ نابِ دل پر داغ بھی
الحذر اے آستیں ، یہ آبِ آتش بیز ہے
تختہ پارے کی طرح ہے حالِ دل آتش تباہ
بےقراری لجۂ دریاے طوفاں خیز ہے

۵۰

[1]کوچۂ یار کے نظّارے میں اغیار الجھے
سیرِ گلزار میں دامن سے مرے خار الجھے

پائے قاتل پہ الٰہی سرِ مغرور جھکے
رگِ گردن سے مری خنجرِ خوں خوار الجھے

چیں جبیں پر نہ ہو ، ہرچند وہ ابرو کج ہوں
بھوں نہ ٹیڑھی ہو ، جو زلفِ سیہ یار الجھے

فرصتِ وقت ہے تدبیر کی خاطر لازم
پھر سلجھتے نہیں جب آنسوؤں کے تار الجھے

باغبانوں سے ترے شیفتۂ زلف اے گل !
سنبل الطّیب کے ہو ہو کے خریدار الجھے

جوش اشکوں کا یہی ہے تو یقیں ہے دل کو
دامنِ سیل سے خارِ سرِ دیوار الجھے

ناتوانی نے یہ دم بند کیا تارِ نفس
سینے میں صورتِ موئے سرِ بیمار الجھے

کفر و اسلام سے آزاد ہوں ، بے قید ہوں میں
مجھ سے کافر ہی نہ جھگڑے ، نہ تو دیں‌دار الجھے

روئے رنگیں سے ترے باغ میں وا ہو جو نقاب
صحبتِ گل سے دلِ بلبلِ گلزار الجھے

کوچۂ یار میں ہنگامہ رہا غیروں سے
دن کو دو چار رکے ، رات کو دو چار الجھے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۷۷ ، نول کشور قدیم ص ۱۶۳ ، جدید ص ۲۵۸ ۔

حسن کو ایک طرح پر نہیں اِک لحظہ قرار
صاف سو بار وہ گیسو ہوئے، سو بار اُلجھے
شیشہ گر کرتے ہیں بند اپنی دکانیں آتش
کس کے دیوانے سے لڑکے سرِ بازار اُلجھے

۵۱

[1]منزلِ گور اب مجھے اے آسماں ! درکار ہے
مردمِ بیمار کو نقلِ مکاں درکار ہے
ہجر کی شب میں کہانی سے کوئی آتی ہے نیند ؟
قصہ خواں کے بدلے یاں یاسین خواں درکار ہے
ساحلِ دریائے ہستی[2] ہے کنارہ گور کا
کشتیِ تن کے لیے بھی بادباں درکار ہے
دیکھیے[3] کس کس نظارہ باز کا دل ڈوب جائے
یار کو پیراہنِ آبِ رواں درکار ہے
کچھ علاجِ وحشتِ عاشق نہیں جز خوابِ مرگ
ایسے دیوانے کو زنجیرِ گراں درکار ہے
آدمی کے واسطے کچھ اور ہووے یا نہ ہو
ساقی و مے، سبزہ و آبِ رواں درکار ہے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۷۷ ، نولکشور قدیم ص ۱۶۳ ، جدید ص ۲۵۹ - ریاض الفصحا ص ۷ میں یہ غزل موجود ہے - لیکن صرف چھ شعر ہیں - مطلع بلا اختلاف ہے - چار شعر مشترک ہیں ، باقی میں کچھ اختلاف ہے -

۲ - ریاض : ساحلِ مقصود عاشق ہے کنارا گور کا
تختۂ میت کو میرے بادباں درکار ہے

۳ - ریاض بلا اختلاف - اس کے بعد پانچویں شعر کا دوسرا مصرع بدلا ہوا ہے : بہرِ فیلِ مست زنجیرِ گراں درکار ہے

سیرِ بامِ عرش کی دکھلاتی ہے دل کی تڑپ
صاحبِ تاثیر کو کیا نردباں درکار ہے

قیمتِ دل ان بتوں سے کیا سمجھ کر مانگیے
رہزنوں کو مفت مالِ کارواں درکار ہے

خالی ہاتھ آئے ہیں ، خالی ہاتھ عاشق جائیں گے
واں نہ کچھ منظور تھا ہم کو ، نہ یاں درکار ہے

ابرو و مژگاں معمّا ہے جو تُو سمجھے اسے
تُرکِ حُسنِ یار کو تیر و کماں درکار ہے

شہر و صحرا میں پھرا کرتا ہوں اس اُمّید پر
وہ جگہ دیکھوں ، مری مٹّی جہاں درکار ہے

میری پامالی اگر مقصود ہے اے آسماں !
کہہ خدا سے مجھ کو اک سروِ رواں درکار ہے

سبزۂ خط کے تماشے سے مجھے ظاہر ہوا
حسن کو رشکِ بہارِ گل ، خزاں درکار ہے

چاہے سگ کو دے اسے ، چاہے ہما کو دے اسے
آسماں لے لے جو مشتِ استخواں درکار ہے

---

۱ - ریاض الفصحا میں 'خزاں' کا قافیہ یوں درج ہے :
ہے ہوائے مرہم اپنے سینۂ پر داغ کو
پھولوں کو شاید سپر کی بھی خزاں درکار ہے
ریاض الفصحا کے یہ دو شعر کلیات میں نہیں ہیں :
طالبِ زلفِ معنبر کو ہے دل سودا زدہ
چغد کو بالِ ہما کا آشیاں درکار ہے
شاعرِ جاں‌باز ہے آتش خداوندا ! اسے
ذوالفقارِ حیدری جائے زباں درکار ہے

بیشتر بندھتے ہیں مضمونِ ہم آغوشیٔ یار
بہرِ فکرِ شعر اک تنہا مکاں درکار ہے
نالۂ بلبل کو سن کر اُف نہیں کرتا کبھی
گوشِ گل کے واسطے آتش زباں درکار ہے

۵۲

[1]شبِ برات جو زلفِ سیاہِ یار ہوئی
جبیں سے صبحِ مہِ عید آشکار ہوئی
یہ سرخ نشّے میں چشمِ سیاہِ یار ہوئی
زیادہ تر شفقِ شام سے بہار ہوئی
تپِ دروں نے نہ رکھّا نشان تک باقی
ہمیں حرارتِ قلب آتشِ چنار ہوئی
گزر ہوا جو کبھی مرقدِ غریباں پر
گھٹائیں پھوٹ بہیں، برق بے قرار ہوئی
شبِ فراق کی ظلمت جو آئی گور میں یاد
سفیدہ صبح کا تاریکیِ مزار ہوئی
پیادہ پا جو چمن میں بہار کو دیکھا
ہوا کے گھوڑے کے اوپر خزاں سوار ہوئی
بڑی خرابی و جاں کاہی سے اسے کاٹا
شبِ فراق مجھے فیل کا شکار ہوئی
زمیں کو زلزلہ آئے گا، چرخ کو چکّر
ہماری روح لحد میں جو بے قرار ہوئی

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۷۷ ، نول کشور قدیم ص ۱۶۴ ، جدید ص ۱۵۹ -

شبِ فراق کے صدموں سے جان بچ جاتی
عنانِ مرگ نہ انساں کے اختیار ہوئی

وہ کوہ ہوں میں ، پرِ کاہ ہے گراں جس کو
وہ کاہ ہوں ، کمرِ کوہ پر جو بار ہوئی

بھری ہے دل میں زبس آرزو شہادت کی
تڑپ گیا میں ، جو تلوار آبدار ہوئی

یہ کیسا تیشے سے فرہاد نے اسے کاٹا
بلند و پست بہت راہِ کوہسار ہوئی

وفا سرشت ہوں ، شیوہ ہے دوستی میرا
نہ کی وہ بات جو دشمن کو ناگوار ہوئی

سنا ہے قصۂ مجنون و وامق و فرہاد
کسی کو عاشقی آتش نہ سازوار ہوئی

۵۳

[1]غم نہیں ، کوے بتاں میں جو نہیں جا خالی
باغِ فردوس میں ہے پہلوے حورا خالی

اے صنم ! مہر و وفا سے نہیں دنیا خالی
کون سا دل ہے ، نہیں جس میں تری جا خالی

نیچی نظروں سے ہوا اُس کی زمانہ پامال
آنکھ اٹھائی تو کیا عالمِ بالا خالی

شبِ تنہائی میں کیا گرم ہو پہلو اس سے
ناز و انداز سے ہے صورتِ زیبا خالی

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۷۸ ، نول کشور قدیم ص ۱۶۳ ، جدید ص ۲۶۰ -

دیکھ کر جان نکلتے ہوئے بھاگے اغیار
میں نے مر کر بھی کیا یاروں کا پالا خالی
گردشِ چشم کہاں ، گردشِ ساغر بھی نہیں
نظر آیا یہ مجھے گنبدِ مینا خالی
نکلے پہلو میں ہر اک نام کے ستّر ستر
نہ ملی بعدِ فنا گور میں بھی جا خالی
سر بکف کوچہ' جلّاد میں حاضر ہوں میں
فتنہ سمجھے نہ مرے عہد میں دنیا خالی
پیاس بجھتی نہیں مستسقیِ[۱] اُلفت کی ترے
سوکھ جاتے ہیں کنویں ، ہوتے ہیں دریا خالی
گردشِ چشم نہیں گردشِ افلاک سے کم
گھر کے گھر کرتی ہے وہ نرگسِ شہلا خالی
شکر کس منہ سے کروں گوشہ' تنہائی کا
مجھ کو دل کھول کے رونے کو ملی جا خالی
جوش کھایا جو مرے خوں نے ، نہیں رہنے کی
پائے محبوب میں جائے کفکِ پا خالی
سمجھے آتش نہ کوئی آدمِ خاکی کو حقیر
نہیں اسرار سے یہ خاک کا پُتلا خالی

---

۱ - مستسقی : استسقا کا مریض جس میں پانی پیتے پیتے پیٹ پھول جاتا ہے مگر پیاس نہیں بجھتی -

۵۴

^۱^موت مانگوں تو رہے آرزوے خواب مجھے
ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے

میری ایذا کے لیے مردے میں جان آتی ہے
کاٹنے دوڑتی ہے ماہیِ بے آب مجھے

دہنِ گرگ سے جیتا جو بچوں صحرا میں
ذبح کرنے کے لیے مول لے قصّاب مجھے

ہوں تصوّر میں صفاے بدنِ یار کے غرق
حلقۂ ناف ہوا حلقۂ گرداب مجھے

مردمِ دیدۂ قربانی ہوں میں دیوانہ
آئے دروازہ کھلے بِن نہ کبھی خواب مجھے

اے فلک رہنے دے عریاں ہی پس از مرگ بھی تو
سونپتا کیا ہے کفن دزد کا اسباب مجھے

نہیں رکھتے ہیں امیری کی ہوس مردِ فقیر
شیر کی کھال ہی ہے قاقم و سنجاب مجھے

جوش سے اشکوں کے بھر جائے گا سر بھر پانی
کھینچ لے جائے گا دریا میں یہ سیلاب مجھے

دیر و کعبہ میں اُن آنکھوں سے نہیں حلقۂ در
کوئی ابرو سے دکھاتا نہیں محراب مجھے

فرقتِ یار میں کرتی ہے قیامت برپا
روزِ محشر سے نہیں کم، شبِ مہتاب مجھے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۲۸، نول کشور قدیم ص ۱۶۴،
جدید ص ۲۶۱، بہارستانِ سخن ص ۱۹۳ -

مرضِ عشق سے بچ جاؤں جو تم دلوا دو
صدقہ اپنے لبِ جاں بخش کا عنّاب مجھے
چین لینے نہ دیا دردِ جدائی نے کبھی
کب میں سویا کہ جگایا نہیں بدخواب مجھے
نہیں بھولا ہے جنوں میں وہ حواس اُڑ جانا
یاد ہے برہمیٔ صحبتِ احباب مجھے
نام کو میرے بھی احباب میں اپنے لکھتے
ذرّہ[1] سمجھے رہے وہ مہرِ جہاں تاب مجھے
دل غنی چاہیے گو ہوں میں فقیر اے آتش
شیر کی کھال ہی ہے قاقم و سنجاب مجھے

۵۵

[2]برق بے پردہ اگر چہرۂ نورانی ہے
پردہ پوشی تری تلوار کی عریانی ہے
ایک عالم ہے صنم بس کہ ترا فریادی
عرصۂ حشر جلوخانۂ سلطانی ہے
دل کے خوں ہونے سے اے جان! نہ اتنا گھبرا
ایک دن تُو بھی غمِ یار کی مہمانی ہے
یار جلادی میں یکتائے زمانہ ہے اگر
واجب‌القتل نہیں کوئی مِرا ثانی ہے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش: ''ذرہ سمجھا رہے۔''
۲ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۷۹ ، نول کشور قدیم ص ۱۶۵ ، جدید ص ۲۶۱ ، بہارستان سخن ص ۲۱۲ -

حال پر اپنے کسی وقت تو کر چشم کو تر
ہے پھر اندھا وہ کنواں جس میں نہیں پانی ہے
صورتِ غنچۂ گل ہے دلِ بستہ میرا
مجھ کو واشد کی طلب فکرِ پریشانی ہے
سر نگوں خاک میں ملوا کے ہوا مجھ کو فلک
کارِ بد کردہ کا انجام پشیمانی ہے
بے تمیزی سے ہے اپنے مجھے اُمّیدِ نجات
باعثِ بے گنہی طفل کی نادانی ہے
ہونٹھ چٹواتا ہے تاحال محبّت کا مزا
زخمِ دل پر وہی اب تک نمک افشانی ہے
زندگانی میں ہوں مَیں مردہ سے بدتر آتش
نقش تعویذ لحد کا خطِ پیشانی ہے

۵۶

[1]روے خورشید سے روشن رخِ نورانی ہے
صبحِ صادق سے کشادہ تری پیشانی ہے
بابِ نظّارہ کہاں اور کہاں دیدۂ شوق
صورتِ یار میں آئینے کو حیرانی ہے
شام ہوتے ہی نہ معلوم ہوئی پھر شبِ وصل
عمرِ کوتہ سے وفا چاہنی نادانی ہے
ٹھوکریں رہگزرِ یار میں کھاتا ہوں مَیں
عاشقِ نقشِ کفِ پا مری پیشانی ہے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص۱۷۹ ، نولکشور قدیم ص ۱۶۵ ، جدید ص ۲۶۲ ۔

تا دمِ مرگ رہا منتظرِ قاتل میں
شاہدِ حال، مرا دیدۂ قربانی ہے

صورتِ یار میں اٹکے گا دمِ باز پسیں
حالتِ نزع سے مشکل مری آسانی ہے

نیم جاں چھوڑ کے نادم نہ ہوا ہوگا یار
سر جھکا کر جو ہوئی مجھ کو پشیمانی ہے

آئنہ دیکھ ہوا یار غریقِ حیرت
منزلِ خوف شناور کو بندھا پانی ہے

دل سا دشمن ہے شب و روز عزیزِ پہلو
اپنے قاتل سے مجھے اُلفتِ روحانی ہے

وعدہ ہوتا نہیں تا چند برابر میرا
اے اجل! دیکھوں تو کب تک یہ نگہبانی ہے

نوجوانی میں غمِ عشق نہ بڑھنا معلوم
شبِ کوتاہ ہے، افسانۂ طُولانی ہے

دشمنی ہے عوضِ دوستی یاں اے آتش
دردِ سر ہی سببِ صندلِ پیشانی ہے

۵۷

[1]کیا کیا نہ رنگ تیرے طلب گار لا چکے
مستوں کو جوش، صوفیوں کو حال آ چکے

ہستی کو مثلِ نقشِ کفِ پا مٹا چکے
عاشق نقابِ شاہدِ مقصود اٹھا چکے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۷۹، نول کشور قدیم ۱۶۵، جدید ص ۲۶۲ -

کعبے سے دیر ، دیر سے کعبے کو جا چکے
کیا کیا نہ اس دوراہے میں ہم پھیر کھا چکے

گستاخ ہاتھ طوقِ کمر یار کے ہوئے
حدِ ادب سے پاؤں کو آگے بڑھا چکے

کنعاں سے شہرِ مصر میں یوسف[۳] کو لے گئے
بازار میں بھی حسن کو آخر دکھا چکے

پہنچے تڑپ تڑپ کے بھی جلاد تک نہ ہم
طاقت سے ہاتھ پاؤں زیادہ ہلا چکے

ہوتی ہے تن میں روح پیامِ اجل سے شاد
دن وعدۂ وصال کے نزدیک آ چکے

پیمانہ میری عمر کا لبریز ہو کہیں
ساقی مجھے بھی اب تو پیالہ پلا چکے

دیوانہ جانتے ہیں ترا ہوشیار انھیں
جامے کو جسم کے بھی جو پُرزے اڑا چکے

بے وجہ ہردم آئنہ پیشِ نظر نہیں
سمجھے ہم آپ آنکھوں میں اپنی سما چکے

اِس دل ربا سے وصل ہوا دے کے جان کو
یوسف کو مول لے چکے ، قیمت چکا چکے

اٹّھا نقاب چہرۂ زیبائے یار سے
دیوار درمیاں جو تھی ، ہم اس کو ڈھا چکے

زیرِ زمیں بھی تڑپیں گے اے آسمانِ حسن !
بے تاب تیرے گور میں بھی تاب لا چکے

آرائشِ جمال بلا کا نزول ہے
اندھیر کر دیا جو وہ مِسّی لگا چکے

دو ابرو اور دو لبِ جاں بخش یار کے
زندوں کو قتل کر چکے ، مردے جلا چکے
مجبور کر دیا ہے محبّت نے یار کی
باہر ہم اختیار سے ہیں اپنے جا چکے
صدموں نے عشق و حسن کے دم کر دیا فنا
آتش سزا گناہِ محبّت کی پا چکے

۵۸

[1]زلزلہ گاہ ، کہیے چشمہ خوں جاری ہے
گور پر بھی مرے مردے کا قدم بھاری ہے
دور اتنا بھی بس اے منزلِ مقصود! نہ کھینچ
تھک گیا لاکھ میں ، ہمّت تو نہیں ہاری ہے
شاق کیوں کر نہ ہو عاشق کو جدائی تیری
کون ہے وہ کہ جسے جان نہیں پیاری ہے
غمِ کونین فراموش ہوا الفت میں
لاکھ آزادی یہ اک دل کی گرفتاری ہے
رات آرام سے کٹتی ہے ، نہ دن راحت سے
زندگانیِ دو روزہ مجھے بیماری ہے
نہ کر اے بادِ بہاری ! مجھے تکلیفِ شراب
آگے ہی گٹھری گناہوں کی مرے بھاری ہے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۸۰ ، نول کشور قدیم ص ۱٦٦ ، جدید ص ۲۳٦ -

وصل میں ہجر کا دھڑکا ہے بجا عاشق کو
چار دن چاندنی ہے ، چار دن اندھیاری ہے
سایۂ دامنِ جلّاد میں ٹھنڈا ہو لوں
منزلِ سخت ہے ، پشتارہ بہت بھاری ہے
نسبت اے پردہ نشیں تجھ سے نہیں یوسف کو
قدر اس کی نہیں جو حسن کہ بازاری ہے
دل کا گاہک وہ ہلاکو ہے ، خدا خیر کرے
بد بلا حاکمِ ظالم کی خریداری ہے
نہیں معشوق جو آتش نہیں میرا مطلوب
سکّۂ عشق مرے نام پر اب جاری ہے

۵۹

[1]دیدۂ مشتاق کو منظور تو عالم میں ہے
دم ترا بھرتے ہیں دم جب تک کہ اپنے دم میں ہے
خوش قدی کا تجھ سے دعویٰ کر کے اس تقصیر پر
سرو دن بھر دھوپ میں ہے، رات بھر شبنم میں ہے
اک نہ اک دن یار ہوگا مہرباں ، کام آئے گا
سو ہنر سے بہتر اک عیبِ محبت ہم میں ہے
خندہ زن دشمن ، نہ گریاں دوست میرے حال پر
رتبۂ موتائے بے وارث مجھے عالم میں ہے
اس قدر پیٹے ، حنائی ہوگئے یاروں کے ہاتھ
صرفِ سینہ پنجۂ مرجاں مرے ماتم میں ہے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۸۰ ، نولکشور قدیم ص ۱۶۶ ، جدید ص ۲۶۴ -

آئنہ دل کا ریاضت سے اگر ہو جائے صاف
پھر تماشا ہے وہی ممکن جو جامِ جم میں ہے

آنکھ رغبت کی نہیں بے وجہ ذرے ڈالتے
روشنی اُس رُخ کی کچھ کچھ نیرِ اعظم میں ہے

توڑتا ہے کس طرح دستِ جنوں زنجیر و طوق
دیکھتا ہوں میں بھی کتنا زور اُس رستم میں ہے

گرد پھرنا تیرے اے بُت عاشقوں کو ہے طواف
عالمِ محرابِ کعبہ ابروؤں کے خم میں ہے

دشمنِ جاں سنتے تھے ، مہر و محبت کا مزا
چکھ کے دیکھا تو حلاوت شہد کی اس سم میں ہے

ایک بوسہ بھی غنیمت ہے لبِ جاں بخش کا
وہ کرے تکرار، حجت جس کو بیش و کم میں ہے

غیرِ عاشق دیکھ سکتا ہے تجھے کون اے حسیں !
ایسی یارائے نظر کب چشمِ نامحرم میں ہے

قیدِ عفت میں ہے وہ محبوب عاشق جاں بلب
نزع میں بیمار عیسیٰؑ دامنِ مریم میں ہے

کھینچ لائے یار کو ، بھر دے مرا زخمِ فراق
وہ اثر ہو جذبِ دل میں ، جو اثر مرہم میں ہے

قالبِ خاکی کو تو سنتے ہیں آتش زیرِ خاک
کچھ نہیں معلوم ہم کو ، روح کس عالم میں ہے

۶۰

[1]الٰہی افعیِ گیسوے دلستاں کاٹے
اجل کہیں مرے پاؤں کی بیڑیاں کاٹے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۸۱ ، نولکشور قدیم ص ۱۶۷ ، جدید ص ۲۶۴ -

بہ رنگِ غنچۂ پژمردہ دل گرفتہ چلے
شگفتہ ہو کے نہ دو دن بھی ہم نے یاں کاٹے
لگائے پہلے ہی تیشے کو اپنے سر پر کاش
بڑا پہاڑ یہ فرہادِ خستہ جاں کاٹے
کہے گا اس سے پیامِ زبانی کیا قاصد
جو ذکر سے مرے غمّاز کی زباں کاٹے
منہ آئنے میں جو دیکھے وہ غیرتِ یوسف
اِدھر یہ اور اُدھر عکس انگلیاں کاٹے
ہزار بار اگر زندہ ہوں نئے سر سے
تو پھر بھی سر وہ مرا بہرِ امتحاں کاٹے
نکل چلا ہے حسینوں کے قدِّ موزوں سے
درختِ سرو کو تھوڑا سا باغباں کاٹے
خدا کے واسطے اک وار اور بھی قاتل
تڑپ تڑپ کے کہاں تک یہ نیم جاں کاٹے
تبر لگا کے گیا تھا وہ تُرک گلشن میں
شہیدِ ناز جو یاد آئے ارغواں کاٹے
قیامت آتی ہے ، اس عُمرِ چند روزہ کو
زمیں کی طرح غریبی سے آسماں کاٹے
بناتا ہے خطِ گل چہرہ یار یوں حجّام
چمن کی گھاس کو جس طرح باغباں کاٹے
زباں چلتی ہے قینچی کی طرح سے ہر بار
یقیں ہے بات کو پیروں کی وہ جواں کاٹے
سزا ضعیف کا ایذا دہندہ پاتا ہے
وہ زرد ہوتا ہے جو کشت زعفراں کاٹے

ملاؤں خاک میں اہلِ سخن کے دشمن کو
آکھیڑوں جڑ سے میں وہ دانت جو زبان کاٹے
کسی کا ہو رہے آتش، کسی کو کر رکھے
دو روزہ زیست کو انسان نہ رائگاں کاٹے

۶۱

۱مردمِ دیدہ رہے سایۂ مژگاں کے تلے
زیست کا لطف ملا خنجرِ بُرّاں کے تلے
عیب لگتا ہے کسے جامۂ عریانی سے
اے جنوں! داغ نہیں اپنے گریباں کے تلے
دستِ یارانِ وطن سے نہیں مٹی درکار
دب مروں گا میں کہیں ریگِ بیاباں کے تلے
شجرِ خشک ہوں، رہتا ہوں گرفتارِ بلا
ارہ کے نیچے سے جاتا ہوں میں سوہاں کے تلے
لے چلے وحشتِ دل اب کی جو صحرا کی طرف
فرش آنکھوں کو کروں پائے غزالاں کے تلے
نیند آتی نہیں اک دم اسے بے گل تکیے
تکیہ دیکھا تھا مرے یار نے قرآں کے تلے
اس قدر دانت مرے قتل پر اے یار! نہ پیس
سودہ الماس کا آ جائے گا دنداں کے تلے
آسماں میری طرف سے نہ عداوت رکھے
روند ڈالے قدمِ گبر و مسلماں کے تلے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۸۱، نول کشور قدیم ص ۱٦۷، جدید ص ۲٦۵ -

رنجِ دنیا سے زیادہ ہے عذابِ مرقد
جائے آرام نہیں گنبدِ گرداں کے تلے

حسرتِ بوسہ سے ہونٹوں کو چباتا ہوں میں
زہر بنتی ہے مٹھائی مرے دنداں کے تلے

دستخطِ فرد تو قسمت کی ہوئی ہے لیکن
بھولے سے رہ گئی ہے مسندِ سلطاں کے تلے

بوجھ شانے کا نہ اس پر پڑے اے مشاطہ
کمرِ یار بھی ہے زلفِ پریشاں کے تلے

بد بلا لعلِ لبِ یار کے اوپر مِسّی
سرمہ آسیب پری سایہٗ مژگاں کے تلے

لاکھ نعمت کے برابر ہے کلامِ شیریں
ذائقہ بس ہے زباں کا مرے دنداں کے تلے

بخت بد نے مجھے ہرچند مٹایا **آتش**
رہ گیا نام مرا گنبدِ گرداں کے تلے

٦٢

[1]اب کی زندہ ہم اگر یار کے در تک پہنچے
مردہ بھی اٹھ کے یقیں ہے کہ نہ گھر تک پہنچے

شعلہٗ حسن نے کی ہے یہ حرارت پیدا
آگ لگ اٹھے جو پردہ کبھی در تک پہنچے

حسرتِ بوسہ سے پانی مرے منہ میں بھر آئے
دہنِ مور اگر تنگ شکر تک پہنچے

دمِ آخر ہی وہ کاش آئے ، گلہ کچھ نہیں پھر
دوست رخصت کو جو ہنگامِ سفر تک پہنچے

---

١ - کلیات طبع علی بخش ص ١٨٢، نولکشور قدیم ص ١٦٨ ، جدید ٢٦٦ -

منّت سفلہ اٹھائیں نہ کبھی عالی جاہ
اڑ کے کافور کہاں داغِ قمر تک پہنچے
گرم جوشی نہ کر اے یار ! کسی سے یہ نہ ہو
آگ لگ کر مرے گھر غیر کے گھر تک پہنچے
موت ہی آئے جو آنسو نہیں تھمتے یا رب !
دامنِ خاک ہی اس دیدۂ تر تک پہنچے
صورتِ آئنہ حیرت سے ہوئے ہیں بے خود
سامنے سے ترے پھر کر ہیں جو گھر تک پہنچے
دل خوں‌خوار سے ہوتی ہے کدورت کوئی دور
زنگِ شمشیر نہ نکلے جو جگر تک پہنچے
آئنہ آپ نے دیکھا ہے تو توڑیں اس کو
تم سے منہ پھیر کے ثابت نہ یہ گھر تک پہنچے
جان بچنے کی خوشی ایسی ہو نوبت رکھوں
نوبتِ شامِ جدائی جو سحر تک پہنچے
رگِ گل کہتے ہیں شاعر ، کبھی تارِ سنبل
دستِ فکر ان کے نہیں تیری کمر تک پہنچے
خدمتِ یار میں ہو اپنی رسائی یا رب !
مہر تک ذرہ ، چکور اڑ کے قمر تک پہنچے
حسن و خوبی کا ہوا نصف جہاں سودائی
اے پری ! بال ترے سر کے کمر تک پہنچے
تیغِ ابرو کی محبّت میں گل اس پر کھائے
پھول بارے مرے سینے کی سپر تک پہنچے
وائے قسمت ہمیں حسرت رہی سرگوشی کی
کان تک یار کے یاقوت و گُہر تک پہنچے

جسمِ خاکی کی تمنّا ہے یہی بعدِ فنا
مُشتِ خاک اپنی تری راہ گزر تک پہنچے
آبِ شمشیر جو یہ تا کمرِ قاتل ہے
جوش میں آ کے الٰہی مرے سر تک پہنچے
مشقِ[1] طفلاں ہے خطِ شوق ہمارا آتش
پڑھ سکے یار نہ ہرچند نظر تک پہنچے

٦٣

[2]ابلیس حسد سے رہے تدبیر میں میری
تدبیر کو کیا دخل ہے تقدیر میں مری
خالِ رخِ محبوب کے مضمون میں یک لخت
نقطے کی جگہ اب نہیں تحریر میں میری
معشوق بھی کوئی نظر آتا ہے تو ٹھنڈا
اوقات بسر ہوتی ہے کشمیر میں میری
دنیا میں محبّت کا کہیں نام نہیں ہے
گم عقل ہے ربطِ شکر و شیر میں میری
ہر لحظہ ہے یاں وردِ زباں ذکرِ الٰہی
دم مارنے کی جا نہیں تقریر میں میری
دل کو نہیں اس گوشۂ ابرو کے سوا چین
آسودگی ہے سایۂ شمشیر میں میری

---

۱ - کلیات طبع نول کشور لکھنؤ و لاہور میں ''عشق طفلاں'' غلط ہے۔
۲ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۸۲ ، نول کشور قدیم ۱۶۸ ، جدید ص ۲۶۶ -

ہر لحظہ دگرگوں ہے مرا حالِ پریشاں
صورت نہیں ملتی مری تصویر میں میری
اس رعشۂ پیری سے تو موت آنی ہے بہتر
دن رات ہے اک زلزلہ تعمیر میں میری
پھر بھی چُکے شمشیر گلے پر کہیں آتش
جلّاد کو شک آتا ہے تقصیر میں میری

۶۴

[1]زاہد فریفتہ ہیں مرے نونہال کے
عاشق بزرگ لوگ ہیں اس خُورد سال کے
ہر شب شبِ برات ہے ، ہر روز عید ہے
سوتا ہوں ہاتھ گردنِ مینا میں ڈال کے
مضمونِ رفتگاں ہے طبیعت کو اپنی تنگ
گاہک نہ ہوویں ہم کبھی مردے کے مال کے
شان و شکوہ نے ہمیں برباد کر دیا
مثلِ حباب اڑ گئے خیمہ نکال کے
رنجِ خمار اٹھانے کی طاقت نہیں مجھے
پیتا ہوں میں شراب میں بھی لُون ڈال کے
بے عشق لوگ کہتے ہیں ماہِ چہاردہ
سن کر مُقر ہوئے ہیں تمھارے کمال کے

---

۱ - کلیات آتش طبع علی بخش ص ۱۸۳ میں شیرازے کے قریب لکھا ہے : ''۵ محرّم ، حیدری'' شاید حیدری کاتب کا مختصر نام ہے اور ۵ محرم ۱۳٦۷ ھجری کو کتابت اس منزل میں تھی - یہ بھی ممکن ہے کہ یہ الفاظ سنگ ساز نے لکھے ہوں - نول کشور قدیم ص ۱٦۸، جدید ص ۲٦۷ ، بہارستان سخن ص ۱۹۵ -

اُس ُترک کی نگہ جو کرے ناوک افگنی
تودے لگائے خاکِ شہیداں کلال کے

سرمہ نہیں ہوا ہے تجلّی سے ُطور ہی
ہم بھی ہیں سوختہ تری برقِ جمال کے

شامِ شبِ فراق سے پہلے موے جو لوگ
آئی ہوئی بَلا گئے سر پر سے ٹال کے

اُس شمع ُرو کا واہ رے جسمِ گداز و صاف
اللہ نے بنایا ہے سانچے میں ڈھال کے

افعی ہے زلف ، خال ہے افعی کی مُردمک
عقدے کھلے یہ فکر سے اُس زلف و خال کے

آنکھوں میں اپنی رکھتے ہیں اہلِ نظر اُنھیں
سرمہ ہوئے ہیں پِستے ہوئے تیری چال کے

اِخوانِ دہر سے عجب اس کا نہ جانیے
یوسفؑ کی فکر میں جو پھریں گُرگ پال کے

معنی کے شوق میں جو ہوا دل کو میلِ فکر
تصویرِ شعر بن گئے ُپتلے خیال کے

سودائی جان کر تری چشمِ سیاہ کا
ڈھیلے لگاتے ہیں مجھے دیدے غزال کے

شک ہوتا تیرے ہاتھ کا ہوتے جو اے صنم !
پنجے میں آفتاب کے ناخن ہلال کے

آئینے سے کلام کو کیوں کر کیا ہے صاف
حیرانِ کار ہم بھی ہیں **آتش** کے حال کے

٦۵

رخصت یار کا جس وقت خیال آتا ہے
عمرِ رفتہ کو مجھے یاد دلا جاتا ہے
آتشِ گل سے کیا ہے مری طینت کا خمیر
دامنِ بادِ بہاری مجھے بھڑکاتا ہے
اے ہما! منہ نہ لگانا تو مری ہڈیوں کو
سگِ دیوانہ مجھے کاٹ کے مر جاتا ہے
ذرے اس کوچے میں جا سکتے نہیں روزن تک
سایہ دیوار سے لگ چلنے نہیں پاتا ہے
گوش زد یار کے ہوتی نہیں فریادِ دلا!
عالمِ خواب میں گویا کہ تو بسراتا ہے
خار سے خشک ہوں گو ہجر میں اس گلرو کے
پر وہ کانٹا ہوں جو دامن نہیں الجھاتا ہے
خس و خاشاک کا رتبہ ہے مجھے عالم میں
پہلے پھنکتا ہوں میں جو آگ کو سلگاتا ہے
امتحاں عاشقِ صادق کا سزاوار نہیں
زرِ خالص کو بھی اے یار کوئی تاتا ہے ؟
مشتِ خاک اپنی ہوں گردوں کے حوالے کرتا
دامنِ گورِ مرے سامنے پھیلاتا ہے
جان کھوتا ہے عبث عشقِ بتاں میں **آتش**
سر کو ناداں کوئی کہسار سے ٹکراتا ہے ؟

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۸۳ ، نول کشور قدیم ص ۱٦۹ ، جدید ص ۲٦۸ -

٦٦

[1]میری قسمت میں لکھی موت جو تلوار کی تھی
شیرِ دایہ میں حلاوت نئی ہر دھار کی تھی

آبِ شمشیر دوا عشق کے بیمار کی تھی
چاشنی اس میں مگر شربتِ دیدار کی تھی

جائے ہر موئے تن اے کاش میں گردن رکھتا
آب ابرو کی ہر اک بال میں تلوار کی تھی

آرزو رہ گئی اس کوچے میں پامالی کی
دھوم ہی دھوم فقط چرخِ جفا کار کی تھی

دلِ دیوانہ زبس عشقِ صنم رکھتا تھا
ہر نفس کاٹنی منزل مجھے کہسار کی تھی

کیا بناتا ہے شکستہ قفسوں[2] کو صیّاد
فکر لازم دلِ مرغانِ گرفتار کی تھی

گرم جوشی سے تپِ عشق کی کیوں کر بچتا
نبض اول ہی سے دودی ترے بیمار کی تھی

پا بہ گل بے خودیِ شوق سے میں رہتا تھا
کوچۂ یار میں حالت مری دیوار کی تھی

حسنِ یوسف ہے وہی رونقِ بازار اب تک
وہی کثرت ہے جو کثرت کہ خریدار کی تھی

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۸۴ ، نولکشور قدیم ص ۱٦۹ ، جدید ص ۲٦۸ ، بہارستانِ سخن ص ۲۰۸ -

۲ - کلیات طبع علی بخش : ''شکستہ قفسوں ـ'' مطبوعہ نولکشور و لاہور : ''شکستہ نفسوں'' ـ

ایڑیاں راہ میں رگڑا کیے ہم واماندے
پہنچے منزل میں وہ طاقت جنھیں رفتار کی تھی

چہچہے کنجِ قفس میں بھی وہی باغ کے ہیں
سرِ بُلبل میں ہوا تھی وہ جو گلزار کی تھی

تیغِ ابرو سے مجھے قتل کیا قاتل نے
وہ سزا دی جو محبّت کے گنہ‌گار کی تھی

مصلحت تھی وہی جو کچھ کہ کیا جس سے سلوک
دل جو تھا یار کا تھا ، جان جو تھی یار کی تھی

راہِ صحرا میں جنوں کیوں نہ رکھے سرگشتہ
جستجو آبلہ پایوں کو ترے خار کی تھی

شب جو تھی پیشِ نظر صورتِ زیبائے حبیب
روشنی گھر میں مرے چاند سے رخسار کی تھی

طرّہ سمجھا کیے مضمون کو اُس کے شاعر
چست اس طرح کی بندش تری دستار کی تھی

جو محبّت کی نظر سے تجھے خریدار اے یار !
پھونک دیتی اُنھیں گرمی ترے بازار کی تھی

طُور پر کیجیو آتش کو عزیزو ! تم دفن
آرزو اُس کو بہت جلوۂ دیدار کی تھی

٦۷

[1]ہردم تفِ دروں سے ہم آفت طلب رہے
ہے دشمنِ حیات جگر میں جو تب رہے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۸۴ ، نول کشور قدیم ص ۱۷۰ ، جدید ص ۲٦۹ ، بہارستانِ سخن ص ۱۸٦ - اس غزل کے سات شعر (بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

جا کی ہے تو نے منزلِ دل میں تو اے صنم!
آنکھوں کا بھی حجاب یہ ہم سے نہ اب رہے
دامانِ دوست کی ہے سکندر کو آرزو
باہر کفن سے ہاتھ نہیں بے سبب رہے
اللہ رے بے نیازیِ محبوب ، آفریں!
دل سے قریب ہو کے کوئی دور جب رہے
معدوم جوشِ گریہ سے کیا ہو بخارِ دل
کچھ گرد تو نہیں جو یہ باراں سے دب رہے
مانع تھا عرضِ حال کا از بسکہ رعبِ حسن
منہ دیکھتے ہی یار کا محفل میں سب رہے
رو پوشیِ[۱] حبیب کا کشتہ ہوں ، چاہیے
مردہ بھی بے چراغ مرا شب کی شب رہے
[۲]عزلت گزیں کو عیب لگاتی ہے سر کشی
دنداں وہ بدنما ہے ، نہ جو زیرِ لب رہے
آتش ظہورِ مہدیِ[۳] دیں ہو خدا کرے
تا چند بے چراغ یہ معمورہ اب رہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)
ریاض الفصحا میں موجود ہیں یعنی شعر ۱ ، ۲ ، ۳ ، ۴ ، ۵ ، ۷ ، ۹ -
ساتواں شعر کلیات میں موجود نہیں ہے :
رکھے قدم رقیب نہ کوئے حبیب میں
بیشے میں شیر کے نہ سگِ بے ادب رہے

۱ - ریاض الفصحا میں اس مصرع کی شکل یہ ہے :
روپوش اک حبیب کا کشتہ ہوں ، چاہیے

۶۸

اعاشقِ روئے کتابی اگر انساں ہووے
اُس سے بہتر ہے جو یہ حافظِ قرآں ہووے

میرے مرنے کی خبر ہو نہ کسی کو معلوم
دوست گریاں ، نہ تو دشمن کوئی خنداں ہووے

نفسِ سرد سے یہ روح کو آتی ہے صدا
ٹھنڈے ٹھنڈے وہ سدھارے کہ جو مہماں ہووے

قدرت اللہ کی اے بُت ! ہے ترا حسن و جمال
کافرِ عشق ، عجب کیا ، جو مسلماں ہووے

کون سا بال ہے اُس زلف کا بکھرا جو نہیں
کوئی مجموعہ نہ اتنا بھی پریشاں ہووے

دوربیں دل ہو صفا سے تو تماشا دکھلائے
آشکارا ہو وہ آنکھوں سے جو پنہاں ہووے

چاندنی چھٹکے اندھیرے میں تم الٹو جو نقاب
حُسن کی جوت سے کارِ مہِ تاباں ہووے

جی میں آتا ہے کہ یاسین سنوں عیسیٰ سے
دلِ بیمار کی مشکل کہیں آساں ہووے

جان بھی جائے تو نکلے نہ زباں سے کبھی آہ
چاہیے سینہ ترا گورِ غریباں ہووے

بے حجابی ہے حیا سے بھی تمھاری قاتل
تشنۂ خوں ہے وہ شمشیر جو عریاں ہووے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۸۳ ، نول کشور قدیم ص ۱۷۰ ، جدید ص ۲۶۹ -

رخِ رنگیں رہے منظورِ نظر اے آنکھو !
دیکھیے اس کا تماشا جو گلستاں ہووے
عاشقوں کا تجھے لازم ہے خیال اے شہِ حسن !
بے خبر ہو نہ رعیّت سے جو سلطاں ہووے
موسمِ گل میں اڑا دے گی ہوا صحرا کی
باغ ہرچند کہ دیوانوں کا زنداں ہووے
حسنِ بے عیب خدا نے وہ دیا ہے تم کو
مدّعی ہو کے جو دیکھے وہ پشیماں ہووے
کفر و اسلام کی کچھ قید نہیں اے آتش !
شیخ ہو یا کہ برہمن ہو ، پر انساں ہووے

۶۹

[1]رشکِ پنجۂ مرجاں پنجۂ حنائی ہے
صاف ہیرے کی ترشی یار کی کلائی ہے
کیا چمن شگفتہ ہیں ، کیا بہار آئی ہے
کیا دماغِ بلبل میں بوئے گل سمائی ہے
اشتیاقِ وصلت میں جان لب تک آئی ہے
عشق نے ستایا ہے ، حسن کی دہائی ہے
دیر سے نہیں واقف ، بے خبر ہیں کعبے سے
قصرِ یار کے در پر شوقِ جبہہ سائی ہے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۸۵ ، نول کشور قدیم ص ۱۷۰ ، جدید ص ۲۷۰ -

عرش سے بھی عالی ہے بام یار کا پایہ
آہ کی کمندوں کو عذرِ نارسائی ہے
مر بھی دیکھیے، شاید گور پر وہ شوخ آوے
یہ بھی آخری اپنی قسمت آزمائی ہے
عشق ہے مرے دل کو حسن کے نظارے کا
آنکھ کے پیالے سے حسرتِ گدائی ہے
پھر رہا ہے آنکھوں میں حسنِ پردہ سوز ان کا
بے نقاب یوسفؑ سے ہم سے آشنائی ہے
جس قدر بڑھیں ان کو چند روز بڑھنے دو
دیکھیے تو زلفوں کی کس قدر رسائی ہے
زندگی ہے وابستہ اس مسیح کے دم سے
مژدۂ فنا ہم کو یار سے جدائی ہے
سامنے سے تیرے ہے رنگِ مدّعی اڑتا
ماہ تاب کے منہ پر چھوٹتی ہوائی ہے
اور کچھ نہیں رکھتے ہیں پری کے دیوانے
سرِ برہنگی ہے یاں، یا برہنہ پائی ہے
مرغِ روح قیدی ہے جسم کے تعلق سے
صورتِ قفس چھوڑا جب اسے رہائی ہے
جانِ زار پاتی ہے لطفِ یار سے تسکیں
دل شکستہ عاشق کے حق میں مومیائی ہے
دل فریبِ عالم ہے حسن اے صنم تیرا
دم تری محبّت کا بھر رہی خدائی ہے
رُو سیاہ زاہد ہے سجدۂ ریائی سے
اس کے ماتھے کا گٹّھا داغِ پارسائی ہے

بھاگتے ہیں وہ آتش اُن سے ہم لپٹتے ہیں
واں وہی کدورت ہے ، یاں وہی صفائی ہے

۷۰

[1]دیوانہ اک پری کا ہے رکھتی ہوا مجھے
زنداں سے تنگ تر ہے یہ وحشت سرا مجھے
ہوتا ہے لقمہ میرے دہن کا نصیبِ غیر
کم بختی نے کیا ہے سفالِ گدا مجھے
ظاہر میں گرچہ کاہ ہوں ، باطن میں کوہ ہوں
اپنی طرف نہ کھینچ سکے کہربا مجھے
ہے اتحاد میرا[2] ترا موج و آب کا
اے بحرِ حسن ! اپنا سمجھ آشنا مجھے
نازک حبابِ جو سے بھی میرا مزاج تھا
راس آئی اس چمن کی نہ آب و ہوا مجھے
کافر سے بھی نہ ہو سکے کرتا جو کچھ کہ فعل
بندہ جو ان بتوں کا بناتا خدا مجھے
کب سے ہوں اشتیاق میں، قاتل کے جاں بلب
یادش بخیر ، بھول گئی ہے قضا مجھے
پیتا ہوں میں ہنوز چھپا کر شراب کو
تا حال رند جانتے ہیں پارسا مجھے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۵۸ ، نولکشور قدیم ص ۱۷۱ ، جدید ص ۲۷۱ -
۲ - کلیات علی بخش : ”ہے اتحاد میرے ترے موج -“

ناز و نیاز کی ہے ترقی وہی ہنوز
صد آفریں ہے یار تجھے ! مرحبا مجھے !
دل مثلِ غنچہ خوں نہ کیا مجھ برہنہ نے
کیا لطف تھا جو ملتی پھٹی اک قبا مجھے
دانے کی طرح رنج ضعیف و قوی سے ہے
ہے کامِ مور بھی دہنِ آسیا مجھے
افشاں چھڑا کے چہرے سے، تم نے دکھا دیا
ذروں کا آفتاب سے ہونا جدا مجھے
صوتِ[1] حزیں نصیبِ گلوے بریدہ ہے
آتش حلال کرتی ہے بانگِ درا مجھے

۷۱

[2]گوشِ گل کو نالۂ مرغِ خوش الحان چاہیے
ناقۂ لیلیٰ کو مجنوں سا حدی خواں چاہیے
روح کو تن میں خیالِ باغِ رضواں چاہیے
تا قفس میں بند ہے، شوقِ گلستاں چاہیے
چہرۂ محبوب پھیکا ہے جو خال اس میں نہ ہو
خوانِ نعمت پر مقرر اک نمک‌داں چاہیے
روزِ محشر تو بھلا سر کو جھکا کر میں چلوں
تیغِ قاتل کا مری گردن پہ احساں چاہیے

---

۱ - کلیات کے مطبوعہ نسخوں میں ''صوتِ حزیں'' کے بجائے غلطی سے ''صورتِ حزیں'' چھپا ہے -

۲ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۸٦ ، نول کشور قدیم ص ۱۷۱ ، جدید ص ۲۰۲ ، بہارستان سخن ص ۱۹۰ -

چاہتا ہوں اُس پری پیکر سے دست آویزِ وصل
عہد نامے پر مگر مُہرِ سلیماں چاہیے
عشق میں اللہ کے ہوں ہوگیا دیوانہ میں
کعبے کے نقشے کا مجھ مجنوں کا زنداں چاہیے
دشنۂ قصّاب سے ہے تیز ہر موئے مژہ
روزمرہ تم کو شغلِ عیدِ قرباں چاہیے
اے جنوں! دیوانۂ دستِ حنائی ہوں، مجھے
پنجۂ مرجاں پئے چاکِ گریباں چاہیے
کچھ سوا اس کے علاجِ وحشتِ عاشق نہیں
موت سی زنجیر یا مرقد سا زنداں چاہیے
گل چراغ زندگی کرنے کا ہے دل کو خیال
جامہ زیبوں کی قبا سے بادِ داماں چاہیے
بادشاہِ حُسن بھی کہتے ہیں عاشق پیار سے
چیں جبیں پر آپ کی مانندِ سلطاں چاہیے
کہتے ہیں بیمارِ حسن اُس نونہالِ حسن سے
سونگھ لینے کے لیے سیبِ زنخداں چاہیے
دل کو لازم ہے خیالِ چہرۂ پُر نورِ یار
چودھویں کے چاند سا اک گھر میں مہماں چاہیے
زلف کا اُس غیرتِ لیلیٰ کے سودا ہو جسے
بیدِ مجنوں کی طرح سے مُو پریشاں چاہیے
موسمِ گل کی ہوا ہے یہ اشارہ کر رہی
ان دنوں جامے سے باہر اپنے انساں چاہیے
اس خرابے کو کیا کرتے ہو تم زیر و زبر
آشکارا ہووے آتش گنجِ پنہاں چاہیے

۸۲

[1]تری ابروے پیوستہ کا عالم میں فسانہ ہے
کسی اُستاد شاعر کی یہ بیتِ عاشقانہ ہے

کفن دزدوں میں قبرِ اہلِ دولت کا فسانہ ہے
تمامی کی ہے چادر ، بادلے کا شامیانہ ہے

جو دیوانہ ہے صحرا میں وہ بھاگے میرے سایے سے
سوارِ شیر میں مجنوں ہوں ، افعی تازیانہ ہے

گریباں پھاڑ کر دیوانے نے زنجیر کیوں پہنی
کرے کیا عقل دخل اس میں ، جنوں کا کارخانہ ہے

کبھی کچھ ہے تلوّن سے ، کبھی کچھ ہے تلوّن سے
مزاجِ یار بھی نیرنگ سازی میں زمانہ ہے

کہا مجنوں نے دنیا سے گزرنا سن کے لیلیٰ کا
کوئی آگے روانہ ہے ، کوئی پیچھے روانہ ہے

نظر آتی نہیں آنکھوں کو باریکی کے باعث سے
کمر سے یار کی ہم کو محبّت غائبانہ ہے

صفا کا اُس رخِ زیبا کی ہے حیران آئینہ
لٹک پر گیسوؤں کی پیستا دانت اپنے شانہ ہے

سمندِ حسن کو وہ ترک اُڑا دے جس قدر چاہے
مژہ مہمیز ہے ، گیسوے مشکیں تازیانہ ہے

پھراتا ہے عبث واعظ سر اپنا بک کے رندوں سے
تکلّف برطرف ، یاں لاآبالی کارخانہ ہے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۶۶ ، نول کشور قدیم ص ۱۵۳ ، جدید ص ۲۴۲ -

سیاہی دور کر دل کی تو پیدا نورِ عرفاں ہو
سرِ افعی کو کچلا جس نے، مال اس کا خزانہ ہے

بلند اختر، بلند اقبال، قصرِ یار کو کہیے
ہوائے بام رکھتا ہے وہ عالی آستانہ ہے

چمن کی سیر میں لطفِ شکار آنکھوں کو اٹھنے گا
ترے تیرِ نگہ کا بلبلِ اے گل‌رو نشانہ ہے

گلے میں اپنے باہیں ہنستے ہنستے ڈال سکتے ہو
کرم ڈھونڈھے تمھارا تو بہانہ ہی بہانہ ہے

وبالِ جاں ہوا ہے جسمِ خاکی ضعفِ پیری سے
قفس سے تنگ بلبل کو خزاں میں آشیانہ ہے

نہیں معلوم ان آنکھوں نے آنکھوں میں ہے کیا پھونکا
دمِ بیگانگی بھرتا مرے دل سا یگانہ ہے

نہ مطلب کشت سے رکھیے، نہ خرمن سے غرض آتش
سمجھ لے اپنے منہ میں مور جو قسمت کا دانہ ہے

۷۳

[1] اے جنوں ہوتے ہیں صحرا پر آتارے شہر سے
فصلِ گل آئی کہ دیوانے سدھارے شہر سے

خوب روئے حال پر اپنے وطن کا سن کے حال
کوئی غربت میں جو آ نکلا ہمارے شہر سے

جان دوں گا میں اسیر اے دوستو! چپکے رہو
ذکر کیا اس کا کہ دیوانہ سدھارے شہر سے

موسمِ گل میں رہا زنداں میں اور آئی نہ موت
سامنے ہوتی نہیں ہے آنکھ سارے شہر سے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۸۷، نولکشور قدیم ص ۱۷۲، جدید ص ۱۷۳ -

جوشِ وحشت میں جو لی زنداں سے میں نے راہِ دشت
کودکاں مجھ کو خدا حافظ پکارے شہر سے
پاؤں میں مجنوں کے تو طاقت نہیں اے کودکو!
موسمِ گل کی ہوا تم کو ابھارے شہر سے
اک نظر للہ ہم کو صورتِ زیبا دکھاؤ
تشنۂ دیدار جاتے ہیں تمہارے شہر سے
دشت گردی کی نہیں دیوانے کو کچھ احتیاج
جامے سے باہر جو ہے باہر ہے سارے شہر سے
چوٹ سی لگتی ہے، دل جنگل سے ہوتا ہے اُچاٹ
سنگِ طفلاں کرتے ہیں مجھ کو اشارے شہر سے
جوشِ وحشت سے نہیں پہنچا میں صحرا تک ہنوز
جانے والے گور کے پہنچے کنارے شہر سے
موسمِ گل آئے، نیّت سیر دیوانوں کی ہو
میوۂ صحرائی ہر ہیں منہ پسارے شہر سے
اب تو آزردہ ہے تو لیکن ملے گا ہاتھ پھر
جس گھڑی آتش نکل جاوے گا پیارے شہر سے

۷۴

[1]دل کو گھر اس گل کی اُلفت کا بنایا چاہیے
بوے یوسف سے یہ پیراہن بسایا چاہیے
نرگسِ جادو کو اس گل کی دکھایا چاہیے
سامری کافر کو گوسالہ بنایا چاہیے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۸۷ پر پہلا مصرع یوں ہے :
(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

روزنِ دیوار چشموں کو بنایا چاہیے
خانگی معشوق سے آنکھیں لڑایا چاہیے

اُس کے کوچے کے تصوّر میں غش آیا ہے مجھے
آستانِ یار کی مٹّی سنگھایا چاہیے

وعدۂ دیدار آتا ہے ، اُلٹتا ہے نقاب
ٹکٹکی باندھیں ، یہ آنکھوں کو سجھایا چاہیے

کوچۂ گیسو کے سودے میں فنا ہوتی ہے روح
خانۂ زنجیر میں اے دل در آیا چاہیے

بھولی ہے بلبل خزاں کے جور سے لطفِ بہار
پھر 'گلستاں' چند روز اُس کو پڑھایا چاہیے

برہمن کہتے ہیں تیرا مصحفِ رو دیکھ کر
کفر سے باز آئیے ، ایمان لایا چاہیے

گفتگو اللہ نے موسیٰؑ سے کی ہے اے صنم
ہم کو بھی آواز پردے سے سنایا چاہیے

ساعدِ زیبا تو ہیں الماس کے ترشے ہوئے
اک نظر ساقِ بلوریں بھی دکھایا چاہیے

دل کڑھاتی ہے نہایت نرگسِ بیمار یار
صدقے کر کے مرغِ روح اُس پر اُڑایا چاہیے

ایک راہِ اتحاد ، اے دل یہ ہے ، جو ہو سکے
یاد میں اُس کی دو عالم بھول جایا چاہیے

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

''دل کو گھر اس گل کے آنے کا بنایا چاہیے''

متن مطابقِ نول کشور قدیم ص ۱۷۳ ، جدید ص ۲۷۴ -

عاشقِ بے خود کو بوسہ دیجیے مولا مِرے
بندۂ مسکیں کے اوپر رحم کھایا چاہیے
آسماں شمس و قمر پر اپنے نازاں ہے کمال
تاجِ زریں کج کلاہوں کے دکھایا چاہیے
سیرِ دریا نشے کے عالم میں دیکھے گا وہ شوخ
کشتیِ مے گھاٹ پر ساقی لگایا چاہیے
سر پھرا میرا نہ میں بیدار ہوں اے نفخِ صور
بے خبر سوتے جو ہوں اُن کو جگایا چاہیے
گیسوے مشکیں کی دکھلا کر لٹک کہتا ہے دل
آتش اس افعی کے اوپر زہر کھایا چاہیے

۷۵

'عاشق ہوں میں نفرت ہے مرے رنگ کو رو سے
پیوند نہیں چاکِ گریباں کو رفو سے
دامن مرے قاتل کا نہ رنگیں ہو لہو سے
ہرچند کہ نزدیک ہو رگ ہاے گلو سے
گلزارِ جہاں پر نہ پڑی آنکھ ہماری
کوتاہ تھی عمر اپنی حبابِ لبِ جو سے
پیشانیِ بت پر آسے مَلتا ہے برہمن
آتی ہے جو خاک اُڑ کے مری یار کے کو سے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۸۸ ، نول کشور قدیم ص ۱۷۳ ، جدید ص ۲۷۴ -

کرتا ہے وہ سفّاک خطِ شوق کے پرزے
مہندی مَلی جاتی ہے کبوتر کے لہو سے
منہ پھیرتے ہی یار کو صورت بھی گئی بھول
ہم چشمِ وفا رکھتے تھے اس آئنہ رُو سے
عاشق ہوں مگر کرتے ہیں معشوق خوشامد
نازک ہے طبیعت مری بیمار کی خو سے
زلفوں سے پھنسایا دل نالاں کو صنم نے
طوطی کو گرفتار کیا حلقۂ مو سے
دیوانہ شرابی ہوں خراباتِ مغاں میں
ہے سنگ سے الفت تو مجھے عشق سبو سے
تھی اس میں زبس کاکلِ مشکیں کی سیاہی
نیند آگئی مجھ کو بغلِ گور کی بو سے
آ رہتا ہے خود یار بغل میں مری ہر شب
درباں سے نہ جھگڑا ، نہ خلش یاں سگِ کو سے
کافر کو نہ ہو میل کبھی جانبِ مصحف
زلفِ سیہِ یار پھری رہتی ہے رو سے
ہوں نزع کی حالت میں جو میں منتظرِ یار
رک رک کے مری جان نکلتی ہے گلو سے
عاشق ہوں برابر مجھے اندیشۂ جاں ہے
بل کھاتے ہوئے سانپ سے ، بکھرے ہوئے مو سے
از بس کہ سمجھتا ہوں اسے دشمنِ جاں میں
ہوتا ہے مجھے مرتبۂ عشق عدو سے
کشتہ ہوں میں بیزاریِ جلّاد کا آتش
تلوار نہیں رنگ پکڑتی ہے لہو سے

۷۶

'یہ وصیّت مِری ساقی نہ فراموش کرے
کاسۂ سر کو خمِ بادہ کا سرپوش کرے

کشتۂ عالمِ عریانیِ خُوباں ہوں ، فلک
ہے سزاوار جو مجھ کو نہ کفن پوش کرے

گردشِ چشمِ بُتاں سے نہ ہو کیونکر دل غش
ٹھگ مسافر کو یقیں ہے یہ کہ بے ہوش کرے

صورتِ قطرۂ شبنم ہوں عزیزِ ہر دل
کھینچے خورشید تو گل مجھ کو دُرِ گوش کرے

عاشقوں سے ہے اشارہ یہی آن مژگاں کا
نشتروں سے ہیں بھرے گنج ، لہو جوش کرے

ہو کبھی تو سببِ خیر عدو اپنا بھی
نشۂ حسن ، الٰہی ! اسے مدہوش کرے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۸۸ ، نولکشور قدیم ص۱۷۳ ، جدید ص ۲۷۵ - ریاض‌الفصحا میں غزل کی ابتدائی صورت موجود ہے - نہ معلوم آتش نے ان اشعار پر نظر ثانی کی ہے یا براہ راست نئے شعر لکھے - بہرحال شعر ۲ و ۳ بلا تغیر اور مقطع ذرا سی تبدیلی کے ساتھ موجود ہے -
یہ پانچ شعر کلیات میں شریکِ اشاعت نہیں ہیں :

یاد بھولے سے تو وہ سرو قباپوش کرے
خاطرِ دوست کسی کو نہ فراموش کرے

آرزو ہے جو لحد پر مری روشن ہو چراغ
کسی محبوب کا دامن اسے خاموش کرے

قتل کرتی ہے عبث مجھ کو حنائے کفِ یار
بے گناہوں کا غضب ہے جو لہو جوش کرے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

اس گزر گاہ میں لازم ہے گنہ سے پرہیز
راہ رو چاہیے اپنا نہ گراں دوش[1] کرے

داغِ دل ہوویں چراغوں کی طرح سے معدوم
جلوہ فرمائی جو وہ صبحِ بناگوش کرے

اس تماشے کی ہیں مشتاق ہماری آنکھیں
کبک ٹیڑھا چلے ، سیدھا تری پاپوش کرے

دشمنِ جاں بھی تغافل کا نہ ہووے کشتہ
خاطرِ دوست کسی کو نہ فراموش کرے

آرزو ہے یہی آتش کی خدا سے[2] زاہد
تجھ کو غم نوش کرے ، مجھ کو قدح نوش کرے

۷۷

[3]یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے
ہم اور بلبلِ بے تاب گفتگو کرتے

پیام بر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا
زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے

(صفحہ گزشتہ کا بقیہ حاشیہ)

بارِ خاطر نہ کسی کے ہوں کبھی سوختہ دل
شمعِ کشتہ کا جنازہ نہ گراں دوش کرے
یار سے تو نہ بغل گیر کیا گردوں نے
گور ہی سے مجھے جلاد ہم آغوش کرے
آرزو ہے یہی آتش کہ خدا ، اے زاہد !
تجھ کو غم نوش کرے ، مجھ کو قدح نوش کرے

۱ - نول کشور طبع جدید : ''گراں گوش کرے ۔'' متن مطابقِ علی بخش ۔
۲ - نول کشور جدید : ''خدا ، اے زاہد'' اور ''غم کو غم ۔''
۳ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۸۹ ، نولکشور قدیم ص ۱۷۴ ، جدید ص ۲۷۶ ۔

مری طرح سے مہ و مہر بھی ہیں آوارہ
کسی حبیب کی یہ بھی ہیں جستجو کرتے ؟
ہمیشہ رنگِ زمانہ بدلتا رہتا ہے
سفید رنگ ہیں آخر سیاہ مو کرتے
لٹاتے دولتِ دنیا کو مے کدے میں ہم
طلائی ساغرِ مے ، نقرئی سبو کرتے
ہمیشہ میں نے گریباں کو چاک چاک کیا
تمام عمر رفو گر رہے رفو کرتے
جو دیکھتے تری زنجیرِ زلف کا عالم
اسیر ہونے کی آزاد ، آرزو کرتے
بیاضِ گردنِ جاناں کو صبح کہتے جو ہم
ستارۂ سحری تکمۂ گلو کرتے
یہ کعبے سے نہیں بے وجہ نسبتِ رخِ یار
یہ بے سبب نہیں مردے کو قبلہ رُو کرتے
سکھاتے نالۂ شب گیر کو در اندازی
غمِ فراق کا اس چرخ کو عدو کرتے
وہ جانِ جاں نہیں آتا تو موت ہی آتی
دل و جگر کو کہاں تک بھلا لہو کرتے
نہ پوچھ عالمِ برگشتہ طالعی آتش
برستی آگ ، جو باراں کی آرزو کرتے

۷۸

[1]خاک ہونے سے درِ دلدار نے جا دی مجھے
ہو گئی اقبال آخر میری بربادی مجھے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۸۹ ، نول کشور قدیم ص ۱۷۴ ، جدید
(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

ایک[1] دم میں منزلِ ہستی سے جا پہنچا عدم
راہزن سنتا تھا جس کو، ہو گیا ہادی مجھے

کم[2] نصیب ایسا ہوں، گر ہو خرّمی کو اذنِ عام
ہو نہ شادی مرگ ہونے کے سوا شادی مجھے

ترک[3] کرنا جامۂ تن کا ہے یاں ترکِ لباس
روح کی قالب سے آزادی ہے آزادی مجھے

یاد[4] دلوا کر لڑکپن یار کا بسمل کیا
تیغِ چوبیں بھی ہوئی شمشیرِ فولادی مجھے

تلخ[5] کامی شہد ہے سودائے زلفِ یار میں
عشق افعی نے کیا ہے زہر سے عادی مجھے

پا بہ گل[6] جب فرقۂ آزاد پایا، مثلِ سرو
ہو گئی بدتر گرفتاری سے آزادی مجھے

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

ص ۲۷۶، ریاض الفصحا ص ٦ -

ریاض الفصحا میں اس غزل کے بارہ شعر ہیں، لیکن کلیات میں اس کی صورت اتنی بدلی ہوئی ہے جیسے آتش نے یہ پوری غزل دوبارہ لکھی ہے - مثلاً پہلا مصرع مصحفی نے یوں لکھا ہے :

''خاک ہوتے ہی ہر اک دامان نے جا دی مجھے''

۱ - ''ایک دم میں کٹ گئی یہ منزلِ دورِ عدم - راہزن کہتے تھے جس کو'' (ریاض الفصحا) ''ایک دن میں'' کلیات آتش، نول کشور ۱۹۲۹ع -

۲، ۳ - یہ شعر مصحفی نے بھی اسی طرح نقل کیا ہے -

۴، ۵ - ریاض الفصحا میں یہ شعر نہیں ہے -

٦ - اس شعر کا دوسرا مصرع ریاض الفصحا میں یوں ہے :

''ہو گیا گالی سے بدتر نامِ آزادی مجھے''

'روز و شب رہتی ہے مرغانِ مضامیں کی تلاش
فکر سے کرنا پڑا ہے کار صیّادی مجھے
کس[۲] قدر آدم کو تھی وابستگی حوّا کے ساتھ
حسنِ عالم گیر سے ہے عشقِ بنیادی مجھے
یہ[۳] عروسِ فاحشہ آتی نہیں دل کو پسند
زالِ دنیا کی نہیں منظور دامادی مجھے
اے[۴] بتو! تیغِ تغافل سے نہ چھوڑو نیم جاں
سامنے اللہ کے بھیجو نہ فریادی مجھے
حسنِ[۵] قاتل سے ازل سے دل کو عشقِ پاک ہے
خوبصورت کی پسند آتی ہے جلّادی مجھے

---

۱ - یہ شعر بالکل بدل دیا ہے - پہلے اس کی صورت یہ تھی :
ہر نفس ہے سعیِ تن کی پرورش کے واسطے
آپ ہی کرنا پڑی ہے اپنی صیّادی مجھے
۲ - مصحفی نے یہ شعر نہیں لکھا ہے -
۳ - طبع علی بخش میں دوسرا مصرع یوں ہے :
''یہ عروسِ فاحشہ دل کو نہیں آتی پسند''
اور مجمع‌الفصحا میں اس مصرع کی صورت یہ ہے :
''جان دے کر مہر میں دیتا ہوں میں اس کو طلاق''
۴ - 'فریادی' کا قافیہ مصحفی کی روایت میں یوں ہے :
طاقِ ابروے صنم کی یاد میں نالاں رہا
برہمن سمجھے در کعبہ کا فریادی مجھے
۵ - 'جلادی' کا قافیہ بھی پہلے یوں نظم ہوا تھا : (ریاض‌الفصحا)
ہر نفس شمشیر ہے یاں بہرِ قتلِ آرزو
خاکساری نے دیا ہے حکمِ جلادی مجھے

'دل گزرگاہِ حسیناں تھا ، تصّور سے کبھی
یاد اُس ویرانے کی آتی ہے آبادی مجھے
میں' نے فنّ ِ شعر اے آتش پڑھایا ہے تجھے
تجھ کو شاگردی ہے زیبا ، اور استادی مجھے

---

۱ - 'آبادی' کا قافیہ ریاض الفصحا میں یوں ہے :
تالیاں لڑکے بجاتے ہیں مری آواز پر
اے جنوں تو نے بنایا جغدِ آبادی مجھے

ترتیبِ ریاض الفصحا کے لحاظ سے چوتھا اور گیارھواں شعر کلیات میں نہیں ہے :
ہے تصّور میں مرے ہر کوہ ، رشکِ کوہ ُطور
وادیِ ایمن کی عزّت ہے ہر اک وادی مجھے
ہر نفس شمشیر ہے یاں بہرِ قتلِ آرزو
خاکساری نے دیا ہے حکمِ جلادی مجھے

۲ - مقطع بالکل بدلا ہوا ہے - ریاض الفصحا میں ہے :
قصرِ تن کی بےثباتی کا غم آتش تا کجا
خانہ بربادی حباب آسا ہے بنیادی مجھے

(الف) ''میں نے فنِ شعر اے آتش سکھایا ہے تجھے'' بہت بڑا طنز اور بہت سخت حملہ ہے ، معلوم نہیں یہ خطاب کس سے ہے -

(ب) ریاض الفصحا میں اس غزل کا ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ شعر ۱۲۲۱ھ/۱۸۰٦ع کے لگ بھگ لکھے گئے ہیں -

(ج) مصحفی نے اس غزل کے بارہ شعر لکھے ہیں ، کلیات میں ۱۴ شعر ہیں - گویا آتش نے غزل پر نظر ثانی کی ہے -

۷۹

[1]مرغِ دل کو ہدفِ ناوکِ مژگاں کرتے
کسی ابرو کی کماں پر اسے قرباں کرتے

دلِ پُر داغ کو مدفونِ بیاباں کرتے
کسی ویرانے میں اس گنج کو پنہاں کرتے

کنجِ تنہائی میں رہتا ہے نہایت دل تنگ
چار دیوار گرا کر اسے میداں کرتے

اور کوئی طلب ابنائے زمانہ سے نہیں
مجھ پر احساں جو نہ کرتے تو یہ احساں کرتے

بے وفائی کا اگر عیب نہ ہوتا تم میں
اے بتو! سجدہ خدا کو نہ مسلماں کرتے

قامتِ یار کا عالم اسے دکھلاتے ہم
منکرِ روزِ قیامت کو پشیماں کرتے

یار سے وعدۂ فردا ہے، جو ممکن ہوتا
شام سے صبح کا ہم چاک گریباں کرتے

موج زن رہتے جو دریا نہ مرے اشکوں کے
سفرِ آب نہ ہندو نہ مسلماں کرتے

اس پری رُو نے سنی ایک نہ دیوانوں کی
غل رہے خانۂ زنجیر کے مہماں کرتے

دل میں رکھتے ہیں محبّت جو تری پوشیدہ
حسنِ یوسف سے ہیں روشن وہی زنداں کرتے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۹۰ ، نول کشور قدیم ص ۱۷۵ ، جدید ص ۲۷۷ -

مرغِ دل سیکڑوں ہی لٹکے ہوئے پاتا ہوں
پیچشِ دام ہیں وہ گیسوے پیچاں کرتے
شربتِ وصل تو ناممکن و ناپیدا ہے
زہر ملتا تو علاجِ تپِ ہجراں کرتے
دل کو یوسف سے نہ کیوں داغِ محبّت ہو عزیز
صاحبِ خانہ ہیں ، کیا خاطرِ مہماں کرتے
گیسوؤں کو نہ ہوا سے انھیں اُلجھانا تھا
اپنے سودائیوں کے دل نہ پریشاں کرتے
دم فنا کرتے چمک اپنی دکھا کر آتش
کارِ الماس وہ الماس سے دنداں کرتے

۸۰

اظاہر ہے یہ اے یار تری کم سخنی سے
لب بند ہوئے جاتے ہیں شیریں دہنی سے
اخواں کی عداوت سے ہوا شہرۂ یوسف
کچھ پیش نہیں جاتی ہے قسمت کے دھنی سے
بوسے سے لبِ یار کے کھوتی ہے تپِ غم
یہ آگ بجھاتی ہے عقیقِ یمنی سے
افسانے سے بدتر ہے ، جو ہو راز ہویدا
اظہارِ فقیری نہیں بہتر کفنی سے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۹۰ ، نول کشور قدیم ص ۱۷۵ ، جدید ص ۳۷۸ -

روتا ہے ادھر ابر ، اُدھر ہنس رہی ہے برق
گریے سے کوئی خوش ہے ، کوئی خندہ زنی سے
طفلی میں اشارہ تھا یہ اُس چشمِ سیہ کا
ہم آنکھ لڑا دیں گے غزالِ خُتنی سے
وہ صدمے اُٹھائے ہیں تپِ عشق سے میں نے
اندیشہ نہیں نزع کی اعضا شکنی سے
گردوں سے نہ ہو دولتِ دنیا کا طلب گار
کب فیض کو پہنچا ہے کوئی سالِ دنی سے
افسوس کہ فرہاد کو پہلے ہی نہ سوجھی
سر پھوڑ کے مر جائیے اس تیشہ زنی سے
اللہ رے مغرور! زمیں پر نہ رکھا پاؤں
پھولے نہ سمائے کبھی گل پیرہنی سے
کیا چیز ہے اے آہ ترے سامنے گردوں
فولادی سپر ٹوٹی ہے برچھی کی انی سے
کرتے ہیں عبث یار ملامت مجھے آتش
مجبور ہے یہ خاک کا پُتلا شُدنی سے

۸۱

دمِ شمشیر کی موجِ نفس میں یاں روانی ہے
گلے تک حسرتِ جلّاد میں لوہے کا پانی ہے
چمن میں جا کے کن آنکھوں سے دیکھوں داغ لالہ کا
یہ میرا داغِ دل ، ہے داغ لالہ کی نشانی ہے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۹۰ ، نول کشور قدیم ۱۷۶ ، جدید ص ۲۷۸ -

دلِ نازک نہیں تابِ جمالِ یار لائے گا
مجھے پردے میں عزرائیل کو صورت دکھانی ہے
نسیمِ صبح سے مرجھایا جاتا ہوں ، وہ غنچہ ہوں
وہ گل ہوں میں ، جسے شبنم بلائے آسمانی ہے
عبث کرتا ہے واعظ میرے آگے ذکر حوروں کا
سنی میں نے بہت تریا چرتر کی کہانی ہے
خرابی سے ارادہ ہے مکاں تعمیر کرنے کا
گرا کر قصرِ تن کو گور کی منزل اٹھانی ہے
شبِ فرقت نہیں یہ واسطے شبنم بچانے کے
سیہ بختی نے کملی میرے سر پر لا کے تانی ہے
الٰہی طولِ عمرِ خضر دے بادِ بہاری کو
مزارِ بے کساں پر پھولوں کی چادر چڑھانی ہے
نہیں یہ بے جہت موباف چوٹی میں تمامی کا
تجھے ابرِ سیہ سے اے پری بجلی گرانی ہے
ارادہ عرشِ اعظم کا ہے آہِ صبح گاہی کو
درِ فریاد رس پر چل کے اب دھونی لگانی ہے
کوئی ویرانہ آتش ، کوئی آبادی نہیں باقی
تلاشِ گوہرِ مقصود میں کیا خاک چھانی ہے

۸۲

[1] سینے پر سنگِ ملامت جو گراں جاں روکے
گرزِ رستم کو یقیں ہے کہ وہ انساں روکے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۹۱ ، نول کشور قدیم ص ۱۲۶ ، جدید ص ۲۷۹ -

عرصۂ روے زمیں صحنِ گلستاں روکے
چار دیوارِ چمن سارا یہ میداں روکے

نکہتِ گل ہوں میں ، کیا مجھ کو گلستاں روکے
بوے پیراہنِ یوسف کو نہ زنداں روکے

برق رفتار ہوں ، منزل ہے مرے زیرِ قدم
ابر گھیرے مجھے ، ہرچند کہ باراں روکے

جو خلش آبلوں سے ہونا ہو ، صحرا ہی میں ہو
راستے میں نہ مجھے خارِ مغیلاں روکے

حشر کے روز وہ نامرد ہے گردن زدنی
ڈھال پر تیری سروہی کو جو انساں روکے

کوچۂ تنگ میں ملتا ہے تو کہتا ہے وہ شوخ
مرد ہے وہ کہ جو ہم کو سرِ میداں روکے

بلبلوں کے لیے ہے دامِ رگِ گل کافی
جال پھیلا کے نہ صیاد گلستاں روکے

لذتِ زخم سے محروم نہ رکھنے قاتل
ہاتھ کو اپنے نہ خیرات سے انساں روکے

انگلیاں پانچوں ترا دستِ نگاریں توڑے
ایک زور اس کا اگر پنجۂ مرجاں روکے

شوق سے لٹکے کمر پر ، ہمیں کچھ کام نہیں
سامنا رخ کا نہ وہ زلفِ پریشاں روکے

دوڑواتا ہوں جلو میں انھیں میں دیوانہ
زعم میں اپنے مجھے لشکرِ طفلاں روکے

غیرتِ عشق عطا شہپرِ توفیق کرے
اے چکور اڑ کے تو راہِ مہِ تاباں روکے

دھجّیاں کر کے رہ ِ دامن ِ صحرا لوں گا
تنگ مجھ کو نہ کرے ، دم نہ گریباں روکے
حافظ اللہ ہے ہم بے سر و سامانوں کا
اوس جس کملی سے چھنتی ہے وہ باراں روکے
شوق ِ صحرا سے نہیں پاؤں زمیں پر پڑتے
کس کو ٹھہرائے اُلجھ کر ، کسے داماں روکے
دل میں اُس بت کے الٰہی ہو مِرا گھر ایسا
ہر طرف اُس کو کرے ، مجھ کو جو درباں روکے
چار دن موسم ِ گل میں تو رہوں دشت نورد
راہ کھوٹی نہ کرے ، مجھ کو نہ زنداں روکے
ہنستے ہیں گل کی طرح اہل ِ جہاں کیا آتش
مثل ِ شبنم گئے اس باغ سے مہماں رو کے

۸۳

پوجنا بُت کا نماز ِ زاہد ِ سالوس ہے
نعرۂ اللہ اکبر نعرۂ ناقوس ہے
زلف و رُخ سے تیرے وابستہ جو ہے مایوس ہے
چشم ِ حیرت آئنہ ، شانہ کف ِ افسوس ہے
قدر ِ نعمت بعد نعمت کے ہے کرتا آدمی
عہد ِ پیری میں جوانی کا مجھے افسوس ہے
زُلف کے سودے کو اپنے سر میں جس نے دی جگہ
یہ سمجھ لے خانۂ زنجیر میں محبوس ہے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۹۱ ، نول کشور قدیم ص ۱۷۶ ، جدید ص ۲۷۹ ، بہارستان ِ سخن ص ۲۱۰ -

یہ صدا دیتی ہے خلخال آن کی ہنگامِ خرام
خاک میں مل جائے جس کو حسرتِ پابوس ہے
حسنِ بے پردہ سے کیا کیا نوجوان ہوتے ہیں قتل
شمع بھی شمشیرِ عریاں ہے جو بے فانوس ہے
خوش نما ہے یار کے اندام پر یوں پیرہن
رُوح کو جیسے مُزینّب جسم کا ملبوس ہے
آہِ سرد و اشکِ گرم و رنگِ زرد و دردِ عشق
دے جو اس معجون کو ترکیب ، جالینوس ہے
بخشے جاویں گے گنہ گارِ محبّت اے صنم !
رحمتِ اللہ سے ، کافر ہے ، جو مایوس ہے
دیکھیے آغازِ اُلفت کا ہو کیا انجامِ کار
بے وفا محبوب سے ، خاطر مری مانوس ہے
باغ میں دکھلا رہی ہے اپنی نیرنگی بہار
کثرتِ گل سے جو بُوٹا ہے دُمِ طاؤس ہے
بادشاہِ وقت ہے ، لیلیٰ کا دیوانہ نہیں
غلغلہ زنجیرِ مجنوں کا صدائے کوس ہے
محوِ حیرت کر دیا ہے اُس صنم کے حسن نے
دل خموشی سے ہمارا بے صدا ناقوس ہے
عاشقِ بے خود کو اندیشہ ملامت کا نہیں
مرد دیوانہ جو ہے بےننگ و بے ناموس ہے
ہجر کی شب صبح ہوگی وصل کا دن آئے گا
خوابِ بد بھی نیک ہے ، تعبیر اگر معکوس ہے
عاشقوں سے اُس پری رخسار کا یہ ہے کلام
پھاڑ کر کپڑے جو دیوانہ بنے ، سالوس ہے

خط نکلنا روے رنگیں پر ہے پیغامِ خزاں
اس گلستاں پر قدم اس سبزے کا منحوس ہے
سر کو تیرے جب سے ہے سوداے پابوسیِ یار
ہاتھ ملتا ہوں میں اے آتش ! کمال افسوس ہے

۸۴

[1]تصویر کھینچی اس کے رُخِ سرخ فام کی
اک صفحے میں قلم نے ’گلستاں‘ تمام کی
اللہ رے تکلّفِ ساقی بہار میں
مے کی گلابیاں ہیں مرصّع کے کام کی
ناساز ہے یہ انجمنِ دہر کی ہوا
مُطرب نے راہ بھولی ہے اپنے مقام کی
کیا اپنی انجمن میں صبا کو میں راہ دوں
گلیوں میں بوے خلوتِ خاص اس نے عام کی
خطِ سیہ ہوا رخِ پُرنُور رشکِ باغ
صبحِ بہار سبزۂ نورس نے شام کی
اصلاح لینے آتے ہیں رنگیں خیال لوگ
خدمت ہے اس چمن میں مجھے انتظام کی
اس پر چلیں گے مثلِ قلم پائے خوش خطاں
تُربت ہماری تختی ہے مشقِ خرام کی
سر ٹوٹے محتسب کا جو اس مے کدے میں آئے
جام آہنی ، صراحی ہے سنگِ رخام کی

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۹۲ ، نولکشور قدیم ص ۱۷۷ ، جدید ص ۲۸۰ -

بُلبُل قفس میں عرش کے اوپر دماغ ہے
حالت وہی ہے نکہتِ گل سے مشام کی
صورت پذیر ہو حرکت بے خبر کی کیا
پتلا بنا سکے نہ . . . .[1] احتلام کی
حجت ہے بہرِ مذہبِ عشق ایک ایک داغ
سینہ مرا کتاب ہے علمِ کلام کی
اللہ رے پھڑکنا اسیرانِ تازہ کا
صیاد خیر مانگتا ہے اپنے دام کی
نظارہ کر لے قُلزمِ حُسن و جمال کا
مثلِ حباب ہے تجھے فرصت قیام کی
اِستادہ دیکھتا ہوں گلستاں میں سرو کو
آزادی پر بھی خُو نہیں بدلی غلام کی
مَلتا ہوں متصل کفِ افسوس روز و شب
حسرت ہے میرے ہاتھ کو کس کے سلام کی
مضموں کا چور ہوتا ہے رسوا جہان میں
چکنّی خراب کرتی ہے مالِ حرام کی
آتش کہاں مہدیِ[2] دیس کا ہے اشتیاق
آنکھوں کو آرزو ہے ظہورِ امام کی

۸۵

[2]فرقت کی شب میں گرمیِ روزِ قیام کی
مُردوں کی نیند نالوں نے میرے حرام کی

---

۱ - ایک لفظ بر بنائے کثافت حذف کر دیا گیا۔
۲ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۹۲ ، نول کشور قدیم ص ۱۷۷ ، جدید ص ۲۸۱ -

گزرا مجاز سے تو حقیقت کھلی مجھے
قرآں کا سامنا تھا جو ابجد تمام کی

سُرخیِ پان ہو لعل مسی زیبِ یار پر
پھولی شفق دیارِ بدخشاں کی شام کی

گھر سے خدا کے ملتے ہیں مضموں مجھے بلند
فکرِ رسا کمند ہے کعبے کے بام کی

اچھا نہیں ہے صورتِ عاشق سے بھاگنا
صاحب سمجھ لیں یہ حرکت[1] ہے غلام کی

بُلبُل مُوا پھڑک کے تو کیا دے گا خوں بہا
خالی ہر اک گرہ نظر آتی ہے دام کی

پہنچا وہ عرش پر جو درِ دل تلک گیا
رفعت ہے آستانے میں اس گھر کے بام کی

پیش از سوال دوں میں نکیرین کا جواب
ہے التجا زباں سے مجھے اتنے کام کی

باغِ جہاں میں گل کی قناعت ہے جائے رشک
عمرِ دو روزہ ایک قبا میں تمام کی

غلماں و حور ہیں مری خدمت کو خلد میں
پروا نہیں جہاں میں کنیز و غلام کی

پہچانا حق کو چاردہ[2] معصوم کے طفیل
زینے سے رہنمائی ہوئی مجھ کو بام کی

۱ - کلیات طبع علی بخش مطابقِ متن ۔ نول کشور و لاہوری نسخوں میں :
"سمجھ لیں خود ہے یہ حرکت غلام کی"

۲ - چاردہ معصوم : شیعوں کے عقیدے میں از اول تا آخرِ زندگی ہر قسم کے گناہوں اور لغزشوں سے پاک ذاتیں یہ چودہ ہیں : حضرت جناب

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

بیمارِ عشق ہوں مجھے عیسیٰ جواب دے
کانوں کو آرزو ہے اجل کے پیام کی
موے سیاہ ہو گئے دو روز میں سفید
ثابت تھی پختگی ہمیں اِس رنگِ خام کی
صرفِ نگیں ہے لعلِ زمرد بھی روز و شب
حسرت نہیں عقیق ہی کو تیرے نام کی
پیدا نہ ہوگا دوسرا مجھ سا شراب خوار
مٹی خراب ہو گی مرے[1] بعد جام کی
بیماریِ فراق سے ہے تلخ ہو گئی
شیرینی آب کی ، نمکینی طعام کی
اندیشہٴ بہار سے رنگِ خزاں ہے زرد
دہشت لگی ہوئی ہے اسے انتقام کی
آتش خدا کے واسطے موقوف فکرِ شعر
طاقت نہیں دماغ کو نظمِ کلام کی

۸۶

[2]شبِ فرقت میں یار جانی کی
دردِ پہلو نے مہربانی کی
منہ دکھاؤ بہت رہی تکرار
"ارنی" اور "لن ترانی" کی

(بقیہ حاشیہ صفحہٴ گزشتہ)

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ، جناب فاطمہٴ زہرا سلام اللہ علیہا اور بارہ امام علیہم السلام -

۱ - کلیات علی بخش : "ترے بعد جام کی" غلط ہے -

۲- کلیات طبع علی بخش ص ۱۹۳ ، نولکشور قدیم ص ۱۷۸ ، جدید ص ۲۸۲ -

جس کو کہتے ہیں چودھویں کا چاند
تیری تصویر ہے جوانی کی
کمرِ یار ہو گئی غائب
سن کے دھوم اپنی ناتوانی کی
صورتِ حال پر ہمارے مُہر
داغ نے ، زخم نے نشانی کی
سیر نعمت سے دو جہاں کی کیا
دے کے شبنم کو بوند پانی کی
ہو گیا عشق حسن سے ناگاہ
پوچھتے کیا ہو ناگہانی کی
دل برشتہ ہوا جو مثلِ کباب
میں نے ترکوں کی میہمانی کی
لبِ جاں بخش کے قریب وہ خط
شرح ہے متنِ زندگانی کی
گوش زد ہوتے ہی ہوئی دشمن
نیند تیری ، مری کہانی کی
کھینچتے اِس غزال کی صورت
چوکڑی بھولتی ہے مانی کی
مجھ کو بٹھلا کے یار سوتا ہے
عاشقی کی کہ پاسبانی کی ؟
رہ گیا شوقِ منزلِ مقصود
پائے خفتہ نے سر گرانی کی
مثلِ شبنم ہوں صاف دل قانع
مجھ کو دریا ہے بوند پانی کی

برق چمکی تو سرفراز کیا
ابر آیا تو مہربانی کی
راحتِ مرگ کو نہ پوچھ آتش
نہ رہی قدر زندگانی کی

۸۷

[1]واقف ہوئی خزاں نہ ہماری بہار سے
بدلا نہ رنگ نشے نے اپنے خمار سے
بعدِ فنا وصال ہوا ہم کو یار سے
توڑا طلسمِ ہجر کو لوحِ مزار سے
بے روے یار گل نظر آتے ہیں خار سے
صوتِ ہزار کم نہیں صوتِ خمار سے
توڑوں وہ گل جو سرخ ہو روے نگار سے
کاٹوں میں سرو کو جو بڑھے قدّ یار سے
مرے کا چشمِ یار کی دل کشتہ ہو گیا
مارا پڑا میں زنگیِ ابلق سوار سے
چاہے وہ جس طرح سے کرے مرغِ دل اسیر
صیّاد مطّلع ہے کمینِ شکار سے
انسردہ دل وہ ہوں جو مری قبر پر ہو نصب
مانندِ خشتِ سنگ تہی ہو شرار سے
اس بےوفا کے چہرے سے تشبیہ ہی نہیں
بھاگیں گے دور[2] شمع و گل اپنے مزار سے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۹۴ ، نول کشور قدیم ص ۱۷۸ ، جدید ص ۲۸۳ ، بہارستان سخن ص ۲۲۰ -
۲ - کلیات طبع علی بخش : ''بھاگیں گے زور شمع -''

جولاں میں ہے سمند یہ کس رشکِ ماہ کا
ہر ذرہ اک ستارہ ہے گرد و غبار سے
خاموش دیکھتا ہوں گل و سرو کی بہار
حیرت میں ہوں زمانے کے نقش و لگار سے
عشرت کدہ ہے تیغ سے قاتل کی قتل گاہ
زخموں کی بُدھنّی ملتی[1] ہے پھولوں کے ہار سے
کوچے میں تیرے کشتنیوں کا رہے ہجوم
خالی یہ صیدگاہ نہ ہووے شکار سے
اوروں سے کیجے وعدۂ دیدار حشر پر
مرنا نہیں قبول ہمیں انتظار سے
بعدِ فنا قبول نہیں ذکرِ نیک و بد
مٹ جائے پہلے نام ، نشانِ مزار سے
سمجھے تو رنج و راحتِ بُلبل ہے مدّعا
اس مطلعِ دو لختِ خزان و بہار سے
خط دار عارضوں سے ہوں ناقص پسند خوش
رغبت نہیں مجھے ثمرِ داغ دار سے
بیہودہ[2] خاک اُڑانے سے کیا حاصل اے صبا!
ناوک فگن سوار ہو پیدا غبار سے
ممکن ہوا نہ خونِ شہیداں کو دست رس
نکلا نہ پائے یار حنا کے حصار سے
کشتے ہیں میری اس کی محبّت سے مدّعی
دو دم ہوئے جو ایک ہوئے ذوالفقار سے

---

۱ - علی بخش : ''بدّھی تلتی ہے''
۲ - کلیات طبع علی بخش میں یہ شعر ''ممکن ہوا نہ خونِ شہیداں'' کے بعد ہے -

رکھ دیں برہنہ گور میں اہلِ جہاں مجھے
دس گز کفن قبول نہیں روزگار سے
نیرنگِ روزگار سے آتش عجب نہیں
چھلا اتارے دزدِ حنا دستِ یار سے

۸۸

[1]بہار آئی ، چھکا ساقی شرابِ روح پرور سے
خزاں کا غم بھلا دے بادۂ گلگوں کے ساغر سے
صفائے قلب کو حاصل کیا میں نے مقدر سے
یہ آئینہ مرے ہاتھ آ گیا بختِ سکندر سے
نگاہِ ناز کا سائل ہوں خوبانِ ستم گر سے
قضا کے تیر کا مشتاق ہوں ترکوں کے لشکر سے
جدائی دل کو پیش آئی ہے کس پاکیزہ گوہر سے
قوی ہے رشتۂ باریک اپنے جسمِ لاغر سے
کیا ہے عشق پیدا گردشِ چشمِ فسوں گر سے
یہ کیفیت ہمیں حاصل ہوئی ہے دورِ ساغر سے
نہ خط لے جائے مرا تا کوئی پھر جان کے ڈر سے
جوابِ نامہ لکھا یار نے خونِ کبوتر سے
لکھے ہیں سیکڑوں یک لخت مضمونِ لبِ شیریں
گلوے خامہ کو بھر بھر دیا ہے میں نے شکر سے
کہاں عشقِ حسنِ گل سے بلبل کو ہوا حاصل
صبا دو پھول اڑا لائی تھی اک دن تیرے بستر سے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۹۳ ، نول کشور قدیم ص ۱۷۹ ، جدید ص ۲۸۴ -

شگفتہ خاطر افسردہ کیے[1] خالوں کے بوسے نے
دل بیمار کو صحت ہوئی معجون عنبر سے
پھنسایا چاہتا ہے باغباں بلبل کو پھندے میں
کمر بندھوائی ہے صیاد کی پھولوں کی چادر سے
صف مژگاں کی جنبش نے غبار خط کیا پیدا
نمود گرد کی بنیاد ہے تحریک لشکر سے
کسی دیوار کے سایے کا عالم یاد آوے گا
قیامت ہوگی ہم پر گرمی خورشید محشر سے
خریدار اک نہیں اس کا، ہزاروں اس کے گاہک ہیں
دل وحشی مرا بے قدر ہے جنگلی کبوتر سے
ملے گا وہ پری رو مجھ کو میں دیوانہ ہوں جس کا
شکر خوروں[2] کو رزق اللہ پہنچاتا ہے شکر سے
جفائے حسن کا جس کو گلہ ہے سخت ناداں ہے
نہیں خالی کوئی شمشیر خوں ریزی کے جوہر سے
قفس میں بھی بہار باغ سے حاصل حضوری ہے
چمن کی سیر کر لیتا ہوں میں دل کے صنوبر سے
خیال سینہ کب آتا ہے دل کو کعبۂ رو میں
پھرا ہے کون جا کر آج تک اللہ کے گھر سے
عداوت بے شعوروں کی ضرر پہنچا نہیں سکتی
ہوا کس روز دیوانہ کوئی لڑکوں کے پتھر سے

۱۔ مطبوعہ نسخوں میں مصرع کی صورت مطابق متن ہے۔ بظاہر مصرع یوں ہوگا:
''شگفتہ خاطر افسردہ کی خالوں کے بوسے نے''
۲۔ نسخۂ نول کشور و لاہور میں ہے: ''شکر خورے کو رزق۔''

خدا نے حسن کا رتبہ کیا ہے عشق پر غالب
جو اس کو باز سے ہے شوق تو مجھ کو کبوتر سے

پری زادوں کے کوچے میں ہوئے ہیں گرد آلودہ[1]
ہمارے پاؤں کو دھوویں گی حوریں آبِ کوثر سے

ہوس بوسے کی خطِ پشتِ لب سے کوئی جاتی ہے
کسی نے شہد کو چھوڑا نہیں زنبور کے ڈر سے

قیامت کی دلِ مشتاق پر سیرِ گلستاں نے
کوئی بوٹا سا قد یاد آ گیا مجھ کو صنوبر سے

وہ ماتم دوست ہوں ، رویا کیا ہوں رات بھر **آتش**
چراغِ گور اگر گل ہو گیا ہے بادِ صرصر سے

۸۹

وہی چتون کی خوں خواری ، جو آگے تھی سو اب بھی ہے[2]
تری آنکھوں کی بیماری ، جو آگے تھی سو اب بھی ہے

وہی نشو و نمائے سبزہ ہے گورِ غریباں پر
ہوائے چرخِ زنگاری ، جو آگے تھی سو اب بھی ہے

تعلق ہے وہی تاحال ان زلفوں کے سودے سے
سلاسل کی گرفتاری ، جو آگے تھی سو اب بھی ہے

---

۱ - کلیات طبع اول میں ، پھر لکھنؤ اور لاہور کے نسخوں میں یہ مصرع یوں ہے :

"ہمارے پاؤں کو دھوویں گے آبِ حوضِ کوثر سے"

دوسرے ایڈیشن میں یعنی طبع علی بخش میں مصرع متن کے مطابق ہے -

۲ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۹۵ ، نولکشور قدیم ص ۱۸۰ ، جدید ص ۲۸۵ -

وہی سر کا پٹکنا ہے ، وہی رونا ہے دن بھر کا
وہی راتوں کی بیداری ، جو آگے تھی سو اب بھی ہے

رواجِ عشق کے آئیں وہی ہیں ، کشورِ دل میں
رہ و رسمِ وفا جاری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

وہی جی کا جلانا ہے ، پکانا ہے وہی دل کا
وہ آس کی گرم بازاری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

نیازِ خادمانہ ہے وہی فضلِ الٰہی سے
بتوں کی نازبرداری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

فراقِ یار میں جس طرح سے مرتا تھا ، مرتا ہوں
وہ روحِ تن کی بیزاری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

وہی سودائے کاکل کا ہے عالم جو کہ سابق تھا
یہ شب بیمار پر بھاری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

جنوں کی گرم جوشی ہے وہی دیوانوں سے اپنے
وہی داغوں کی گل کاری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

وہی بازار گرمی ہے محبّت کی ہنوز آتش
وہ یوسف کی خریداری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

۹۰

[1] عارف ہے وہ جو حُسن کا جویا جہاں میں ہے
باہر نہیں ہے یوسف اسی کارواں میں ہے

پیری میں شغلِ مے ہے جوانانہ روز و شب
بوئے بہار آتی ہماری خزاں میں ہے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۹۵ ، نولکشور قدیم ص ۱۸۰ ، جدید ص ۲۸۵ -

ہوتا ہے گل کے سونگھنے سے دونا گرفتہ دل
مجھ سا بھی بد دماغ کم اس بوستاں میں ہے

پشتِ خمیدہ دیکھ کے ہوتا ہوں نعرہ زن
کرتا ہوں صرفِ تیر جو زور اس کماں میں ہے

دکھلا رہی ہے دل کی صفا دو جہاں کی سیر
کیا آئنہ لگا ہوا اپنے مکاں میں ہے

دیوانہ جو نہ عشق سے ہو، آدمی نہیں
حسنِ پری کا جلوہ طلسمِ جہاں میں ہے

پروانوں کی طرح ہے ہجومِ قدح کشاں
روشن چراغِ باد جو مغ کی دکاں میں ہے

اس دلربا کے کوچے میں آگے ہوا سے جائے
اتنی تو جان اب بھی تنِ ناتواں میں ہے

دنیا سے کوچ کرنا ہے اک روز رہروو!
بانگِ جرس سے شور یہی کارواں میں ہے

پڑھ سکتا سرنوشت کا مطلب کوئی نہیں
معلوم کچھ نہیں کہ یہ خط کس زباں میں ہے

آیندہ و روندہ کی چلتی ہیں ٹھوکریں
جادہ جو اپنا تھا آسی خوابِ گراں میں ہے

کشتے ہیں باغ میں بھی تری تیغِ ناز کے
بوے شہید لالہ میں اور ارغواں میں ہے

عاشق کے رنگِ زرد کو دیکھو تو ہنس پڑو
تاثیر اس میں ہے وہی جو زعفراں میں ہے

معدوم وہ کمر ہے، نہ موہوم وہ دہن
کہتے ہیں شاعر ان کے جو کچھ گماں میں ہے

گل ٹوٹتے ہیں ، ہوتے ہیں بلبل اسیرِ دام
صیّاد مستعد مددِ باغباں میں ہے
سرکش کی منزلت ہے مبک پیشِ خاکسار
وہ تمکنت زمیں کی کہاں آسماں میں ہے
سنبل سے حالِ گل ہوں میں یہ کہہ کے پوچھتا
کس سلسلے میں تو ہے یہ کس خانداں میں ہے
دل میں خیالِ گیسوے مشکیں ہے بد بلا
یہ مُرغِ روح کے لیے سانپ آشیاں میں ہے
حکمت سے ہے یہ خاک کا پتلا بنا ہوا
نور آنکھ میں ہے اس کے تو مغز استخواں میں ہے
آتش بلند پایہ ہے درگاہ یار کی
ہفتم فلک کی رفعت اسی آستاں میں ہے

۹۱

[1]طفلی میں بھی شادی متوحش رہی ہم سے
چھٹی نہ ملی جمعے کو بھی ہفتے کے غم سے
ہاتھ آنا تعجب نہیں اس رشکِ پری کا
چل جائے تو کیا داغِ جنوں کم ہے درم سے
وہ گرم روِ بادیۂ عشقِ جنوں ہوں
جلتا ہے چراغ آج مرے نقشِ قدم سے
دکھلاتے نہیں دانت ، وہ ہنس کر ہیں دکھاتے
چشمک زنیِ برق غضب ابرِ کرم سے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۹۶ ، نول کشور قدیم ص ۱۸۱ ، جدید ص ۲۸۶ -

ہو حسن کا عاشق جو مری طرح برہمن
زنّار کو دو تار ملیں زلفِ صنم سے

ہستی میں مری فکرِ رسا باندھ کے اکثر
مضمون کمر یار کے لاتی ہے عدم سے

آنکھوں کو رہے مدّ نظر مشتریِ دل
دلال خریدار لگا لاتے ہیں دم سے

کعبے میں بھی بت خانے کی شکلوں کو نہ بھولا
یاد آ گئی ابرو مجھے محرابِ حرم سے

وہ رشکِ پری ذکر جو کرتا ہے ہمارا
کہتی ہے صبا آ کے سلیماں کی قسم سے

گالی نہیں زیبا لبِ شیریں سے تمھارے
یہ شہد کرو تلخ نہ آمیزشِ سم سے

میراث سمجھتا ہے جو فردوسِ بریں کو
فرزند وہ آدم کا ہے حوّا کے شکم سے

اے چرخ نہیں زندے ہی بیداد سے نالاں
فریادی ہیں مردے بھی ترے ظلم و ستم سے

دیوانے کو اطفال نہ گھیرے رہیں کیوں کر
خالی کوئی لشکر نہیں دیکھا ہے علم سے

ہوتا ہے خطِ پشت لبِ یار سے ظاہر
کاتب کوئی بہتر نہیں یاقوت رقم سے

جاں بخشیِ بلبل ہو، بہار آئے خزاں جائے
کانٹا ہوا ہے سوکھ کے گلزار کے غم سے

دیکھا ہے تماشائے جہاں آنکھوں سے برسوں
اٹھتی ہے بہت کیفیت اس ساغرِ جم سے

ایسا بھی کوئی دور ہو گردش سے فلک کی
وہ لوگ زیادہ ہوں جو جھک جاتے ہیں کم سے

برچھی سے سوا توڑ ہے اس موے مژہ میں
ابرو کی کجی تیز ہے تلوار کے خم سے

تاچند کرے گا رقمِ سوزِ دل **آتش**
رکھ ہاتھ، نکلتا ہے دھواں مغزِ قلم سے

۹۲

[۱]قاتلِ عاشق ہر اک اس تُرک کا انداز ہے
تیغ گویائی، خموشی تیرِ بے آواز ہے

گرم جوشیٔ محبّت کا وہی انداز ہے
داغِ دل سے ربط ہے، سوزِ جگر سے ساز ہے

خانۂ صیّاد کی ایسی ہوا ناساز ہے
روح بُلبُل کی قفس سے مائلِ پرواز ہے

مردِ میداں وجد کرتے ہیں جو سنتے ہیں کبھی
نے گلو اپنا ہے، نالہ شیر کی آواز ہے

سونگھنا گیسوے مشکیں کا کرے گا دم فنا
کون سا سودا نہیں سر کے لیے ناساز ہے

اڑتی پھرتی ہے ہماری خاک ہمراہِ صبا
بے پر و بالی میں بھی اپنی وہی پرواز ہے

بادشاہِ وقت ہے دیوانہ تیرا اے پری!
نالۂ زنجیر نوبت خانے کی آواز ہے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۹۷، نول کشور قدیم ص ۱۸۱، جدید ص ۲۸۷ -

صیدگاہِ عشق سے مایوس پھرنے کا نہیں
عاشقِ تیرِ نگہ ہے ، مرغِ دل جاں باز ہے
صورتِ محبوب کو آنکھوں سے تو دیکھا نہیں
گوش نے البتہ پردے سے سنی آواز ہے
حسن نے خطِ غلامی لکھ دیا ہے یار کو
گل سے گالوں پر نہیں یہ سبزے کا آغاز ہے
انگلیاں کانوں میں دیتے ہیں وہ میرے ذکر سے
کاٹنا اپنی زباں کو دانت سے غمّاز ہے
بے مئے گل رنگ فصلِ گل میں کیفیّت نہیں
سن کے پی جاوے جو تو اُس کو نوائے دل راز ہے
لپٹے جاتے ہیں ہم اُن سے ، ہم سے ہیں وہ بھاگتے
اِس طرف سے ہے نیاز اور اُس طرف سے ناز ہے
روئے روشن کم یدِ بیضائے موسیٰ سے نہیں
سامریِ وقت وہ چشمِ فسوں پرداز ہے
باندھتے ہیں شعر میں مضمونِ چشم و لب شریک
ایک مصرع ہے فسوں اپنا تو اک اعجاز ہے
محو رہتا ہوں میں یادِ حسنِ عالم گیر میں
ذکرِ سلطاں مجھ فقیرِ مست کا دمساز ہے
دل کو رکھ دیتے ہیں یہ کہہ کر کہاں داروں میں ہم
اس نشانے کو اڑا دے جو وہ تیرانداز ہے
رمز کی تقریر ہم سے پیش جانے کی نہیں
بات اپنی بھی کنایہ ہے جو اے طنّاز ہے
ڈھونڈھتا ہوں اک حسیں قاتل ، نظر آتا نہیں
صیدگاہِ عشق میں قحط شکار انداز ہے

مرغِ دل عاشق کا چشمِ یار سے بچتا نہیں
تیز پر شاہیں سے بھی اُس کی نگہ کا باز ہے

فصلِ گل ہے ، شیشہ و پیمانہ کا ہے دور دور
خانقاہیں بند ہیں ، مے خانے کا در باز ہے

لعل سے لب ، دُر سے دنداں کے ہے مضموں باندھتا
مردِ شاعر تو نہیں آتش مرصّع ساز ہے

۹۳

[1]خرمنِ عمر جلے تیرے لبِ خنداں سے
برق کا کام تبسّم نے لیا دنداں سے

زلف سے چھٹ کے نگہ اُلجھی رخِ جاناں سے
لے گئی کعبے کو قسمت مجھے ہندوستاں سے

الحذر گردشِ چشمِ سیہِ جاناں سے
درہم اک خلق ہے برہم زدنِ مژگاں سے

روزِ مولود سے ہے اصل حقیقت کا خیال
بوئے خوں آتی تھی دایہ کے مجھے پستاں سے

مثلِ گل یار کو خنداں نہ کیا گریہ نے
تخمِ اُمّید نہ سرسبز ہوا باراں سے

حالتِ شمع حرارت سے بہم پہنچی ہے
سر کٹے پر نہ ہٹے پاؤں مرا میداں سے

نیک طینت کو بدی کا نہیں منظور عوض
انتقام اپنا نہ یوسف نے لیا اِخواں سے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ۱۹۷ ، نول کشور قدیم ۱۸۲ ، جدید ص ۲۸۷ -

وحشت آبادِ جہاں میں نہ کر آرام طلب
کب مسافر کو ملا چین دہِ ویراں سے

زمہریر اور جہنّم ہے مجھے بے محبوب
استراحت ہے زمستاں سے، نہ تابستاں سے

صحبتِ یار و رقیب آنکھوں میں پھر جاتی ہے
داغ ہوتا ہے مجھے لالہ و نافرماں سے

آخرِ کار جہاں سے ہو اگر آگاہی
صاحبِ خانہ نظر آنے لگے مہماں سے

پست فطرت کو نہ ہو رتبۂ اعلیٰ حاصل
ایک تہ خانے کو دیکھا نہ بلند ایواں سے

امن چاہے تو نہ رکھ عالمِ اسباب سے کچھ
ہاتھ آتا ہے کفن دزد کو کیا عریاں سے

بے خبر کو ہو خبر شوق کی اپنے **آتش**
یار تک نامہ پہنچ جائے کسی عنواں سے

۹۴

[1]خام کو شادی ہے، غم پختہ کو ہے احساں سے
کشت کو نفع ہے، خرمن کو ضرر باراں سے

کرمِ حق سے ہوں ایمن ستمِ دوراں سے
پالے کا ڈر نہیں رہتا اثرِ باراں سے

آستیں ہوں وہ کہ مربوط گریباں سے نہیں
وہ گریباں ہوں جسے قرب نہیں داماں سے

تیغِ قاتل سے اڑا یوں سرِ شوریدہ مرا
جس طرح سے حرکت گوے کو ہو چوگاں سے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۹۷، نولکشور قدیم ص ۱۸۲، جدید ص ۲۸۸ -

خطِ نورس نے جگہ کی رخِ رشکِ گل پر
آشنا سبزۂ بیگانہ ہوا بستاں سے

عشق آنکھوں کو ترازو کے بنائے پلڑے
حسن انصاف طلب ہووے اگر میزاں سے

آسماں سے ہے توقع کسے سرسبزی کی
ہوں وہ افتادہ زمیں جو نہ اٹھے دہقاں سے

رنج دنیا میں زیادہ ہے تو راحت کم ہے
وصل کا روز ہے کوتاہ شبِ ہجراں سے

سجدہ آدم[۴] کو فرشتوں نے کیا، خوب کیا
قدرت اللہ کی ظاہر ہوئی ہے انساں سے

شمعِ کافوری کی حاجت نہیں کچھ مدفن پر
دل منوّر ہے اگر روشنیِ ایماں سے

نالہ کش جب سے ترے حسن کو مطلوب ہوئے
عشقِ گل ترک ہوا بلبلِ خوش الحاں سے

بختِ خفتہ کو جگا کر اسے نوکر رکھوں
خواب کا روکنا ممکن ہو اگر درباں سے

کون سا لطف ترے روے کتابی میں نہیں
رطب و یابس کوئی باہر نہیں ہے قرآں سے

شیر ہم اور نیستاں ہے حصیر اے آتش!
سلسلہ فقر کا اپنے ہے شہِ مرداں سے

۹۵

[۱]کام آخر نہ ہوا اپنا صفِ مژگاں سے
حسرتِ تیر لیے جاتے ہیں ترکستاں سے

۱- کلیات طبع علی بخش ص ۱۹۹، نول کشور قدیم ۱۸۳، جدید ص ۲۸۹ -

وصل کے بعد کھلا ہم کو غمِ ہجراں سے
یہیں ہوتی ہے مکافاتِ عمل اِنساں سے
حیف ہے خاک کا پُتلا نہ کرے یاد اُس کو
اُلفت اللہ کو کس مرتبہ ہے انساں سے
زخمِ خنداں سے تری تیغ کے کچھ فرق نہیں
عشقِ بلبل کا سبب ہے یہ گلِ خنداں سے
رگیں زنجیریں ہیں ، مَیں روح ہوں ، یہ قالب ہے
مَلک الموت چھڑا دے گا مجھے زنداں سے
کعبہ و دَیر میں نافہمی سے پھرتا ہے خراب
دور سمجھا ہے جسے ، ہے وہ قریب اِنساں سے
قسمتِ مرغِ گرفتار کی اللہ رے بدی
دام کو دانے کا محتاج کیا دہقاں سے
بسکہ رکھتا ہے اُسے دوش پر اے قاتل تُو
مثلِ گردن ہے تری تیغ خم اس احساں سے
طُرفہ گرمی مرے محبوبِ قباپوش نے کی
شمعِ کُشتہ کو فروزندہ کیا داماں سے
سائلِ صبر و سکونت ہوں خدا سے شب و روز
منصبِ فقر ہے مطلوب مجھے سلطاں سے
آتش و دود کا عالم نظر آیا بے یار
خفقاں مجھ کو ہوا لالہ و نافرماں سے
خشمگیں آنکھ دکھائی جسے وہ قتل ہوا
برچھیاں چل گئیں اے تُرک تری مژگاں سے
باغ میں زلف و خطِ یار ہے یاد آ جاتا
کبھی سنبل سے اُلجھتا ہوں ، کبھی ریحاں سے

گردشِ بخت ہے یا گردشِ پرکار آتش
پاؤں اٹھتا نہیں اس دائرۂ دوراں سے

۹۶

[1]ساغرِ صافِ مئے حبِّ علی[ؑ] مشرب ہے
مردِ مومن ہوں میں اثنا عشری مذہب ہے

حسنِ انساں سے ہر اک شعر میں یاں مطلب ہے
روحِ معنی ہے جو ہے بیت مری قالب ہے

سرو آولیا ہے مری آنکھوں میں ، گل انسب ہے
جو کہ ہے خوب ہے ، اللہ کا عالم سب ہے

ابلقِ یار کا پھرتا ہے خیال آنکھوں میں
روز نقرہ جو ہمارا ہے ، تو مُشکی شب ہے

تو امیر اے بتِ سرکش ، تو یہ عاجز ہے فقیر
حسن جاگیر تری ، عشق مرا منصب ہے

مردِ میداں کی حرارت ہے شجاعت کی دلیل
دائمی شیرِ نیستاں کے لیے اک تب ہے

کنجِ تنہائی میں آگے خفقاں ہوتا تھا
اپنی پرچھائیں کی صورت سے بھی نفرت اب ہے

وصل کی شب بھی وہ کافر نہیں عریاں ہوتا
مثلِ گل پیرہنِ یار مگر قالب ہے

عشق نے حُسن کا دیوانہ کیا ہے مجھ کو
زلف زنجیر ہے ، زنداں مجھے کنجِ لب ہے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۹۹ ، نول کشور قدیم ص ۱۸۳ ، جدید ص ۲۹۰ -

ایک سے ایک کو پاتا ہوں میں یاں بالا دست
زیرِ لب ہے جو ذقن ، زیرِ ذقن غبغب ہے

حکمتِ حسنِ ہویدا ہے رخِ دلبر سے
چاہِ نخشب ہے ذقن ، چہرہ مہِ نخشب ہے

تُرکِ خوں خوار ہے یار ، اور ہے مسکیں شاعر
تیغ مقصود اسے ، جوہر سے مجھے مطلب ہے

جلوۂ یار سے یاں سینہ ہوا ہے روشن
میں وہ ذرہ ہوں کہ خورشید مرا کوکب ہے

عشقِ کامل ہے سبب حسن سے یک رنگی کا
شمع و پروانہ کا جل جانے میں اک مذہب ہے

موذیوں کا بھی ہے یہ خاک کا پُتلا موذی
زیرِ پاپوش سرِ مار و سرِ عقرب ہے

شہ سواروں کو گراتا ہے یہ پشتِ زیں سے
کس قدر ابلقِ ایّام برا مرکب ہے

حیف ہے سوزشِ دل کا نہ ہو اشکوں سے علاج
بیشتر ورنہ پسینے سے اترتی تب ہے

دوست ہو جائے ، جو دشمن مرے اشعار سنے
مُدّعا مہر و محبّت سے وفا مطلب ہے

مرضِ عشق سے اک خلقِ خدا ہے رنجور
جلوۂ حسنِ جہاں سوز بھی فصلی[1] تب ہے

کون سی شے ہے زمانے میں نہیں جو اِس میں
سیر کر دل ہی میں دنیا کا تماشا سب ہے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش : ''جہاں سوز بھی فصلِ تب ہے ۔'' متن مطابق نسخۂ نول کشور و لاہور ۔

حشر پر وعدۂ دیدار نہ کر عاشق سے
کس کو معلوم ہے فردائے قیامت کب ہے

جسم کو جانتے ہیں صنعتِ دستِ قدرت
روح کو ہم یہ سمجھتے ہیں کہ امرِ رب ہے

روے انور سے مقدّم ہے تری زلفِ سیاہ
عید کے روز سے اول رمضاں کی شب ہے

مجھ کو لغزش نہ ہو ، ہرچند زمانہ ہل جائے
قطب تارہ جسے کہتے ہیں ، مرا کوکب ہے

روح کی طرح سے مہمان رہا کرتا ہوں
گھر کو اپنے یہ سمجھتا ہوں مرا قالب ہے

زور و قوّت سے ڈراتا ہے یہ کس کو آتش
میں بھی شمشیرِ علی ہوں جو عدو مرحب ہے

۹۷

اے صنم ! جس نے تجھے چاند سی صورت دی ہے[1]
اسی اللہ نے مجھ کو بھی محبّت دی ہے

تیغ بے آب ہے ، نے بازوے قاتل کمزور
کچھ گراں جانی ہے ، کچھ موت نے فرصت دی ہے

اس قدر کس لیے یہ جنگ و جدل اے گردوں !
نہ نشاں مجھ کو دیا ہے ، نہ تو نوبت دی ہے

سانپ کے کاٹے کی لہریں ہیں شب و روز آتیں
کاکلِ یار کے سودے نے اذیّت دی ہے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۱۹۹ ، نول کشور قدیم ص ۱۸۴ ، جدید ص ۲۹۱ -

کوئی اکسیر غنی دل نہیں رکھتی ایسا
خاکساری نہیں دی ہے، مجھے دولت دی ہے
آہ کا اپنے فتیلہ نہیں کس رات جلا
عمل حب کی بہت ہم نے بھی دعوت دی ہے
جسم کو زیر زمیں بھی وہی پہنچاوے گا
روح کو جس نے فلک سیر کی طاقت دی ہے
فرقت یار میں رو رو کے بسر کرتا ہوں
زندگانی مجھے کیا دی ہے، مصیبت دی ہے
یاد محبوب فراموش نہ ہووے اے دل!
حسن نیت نے مجھے عشق سی نعمت دی ہے
گوش پیدا کیے سننے کو ترا ذکر جمال
دیکھنے کو ترے آنکھوں میں بصارت دی ہے
لطف دل بستگی عاشق شیدا کو نہ پوچھ
دو جہاں سے اس اسیری نے فراغت دی ہے
کمر یار کے مضمون کو باندھو آتش
زلف خوباں سی رسا تم کو طبیعت دی ہے

۹۸

[1]نفس شقی بھی روح کے ہمراہ تن میں ہے
یوسفؑ کے ساتھ گرگ بھی اس پیرہن میں ہے
حجت جو ایک حور کے شیریں دہن میں ہے
شہد بہشت کا مزا اپنے سخن میں ہے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۰۰، نول کشور قدیم ص ۱۸۴، جدید ص ۲۹۲، بہارستان سخن ص ۱۹۷ -

دیوانے تیرے دونوں ہوئے اے بہارِ حسن !
زندہ نہ پیرہن میں ، نہ مردہ کفن میں ہے
عاشق کو زہر دیجیے صاحب ! نہ پیس کر
الماس ہے جو دانت تمھارے دہن میں ہے
کیا طفلِ اشک کو مری رسوائی کا ہو پاس
نووارداںِ گنبدِ چرخِ کہن میں ہے
سونگھے سے زلفِ یار کے سودے کا کیا عجب
عنبر میں ہے یہ بو ، نہ تو مشک ختن میں ہے
سرمہ لگا کے آنکھ وہ دکھلائیں تو کہاں
خوش چشمی[1] کی یہ شاخ اگی جو ہرن میں ہے
خالی زمانے کو نہ سمجھ حسن و عشق سے
پروانہ اور شمع ہنوز انجمن میں ہے
زلفیں ہٹائیے رخِ روشن سے ، مہرباں !
اختر شناس کہتے ہیں سورج گہن میں ہے
دکھلائے گا بہار کو حسن اپنا باغباں
آئینہ آب جُو کا لگایا چمن میں ہے
دھوکا نہ دے سکے گی مجھے رنگِ یار کا
سرخی نہیں سفیدی اگر یاسمن میں ہے
حسن و جمال کا ترے شہرہ ہے دور دور
آبِ حیات حسرتِ چاہِ ذقن میں ہے
ابرو ہر اک صنم کا ہے رشکِ ہلالِ عید
خوش وقتی ہے تو بت کدۂ برہمن میں ہے

---

۱ - نسخۂ لاہور میں ''خوش چشمی'' کو ''خوش قسمتی'' بنایا گیا ہے۔

فرقت میں دل جلاتا ہے شوقِ وصالِ یار
اک آگ سی لگی ہوئی آتش بدن میں ہے

۹۹

[1]تازہ ہو دماغ اپنا ، تمنّا ہے تو یہ ہے
اس زلف کی بو سونگھیے ، سودا ہے تو یہ ہے
قینچی نہیں چلوائی مرے نامے نے کس پر
پروازِ کبوتر ہو جو عنقا ہے تو یہ ہے
کچھ سرو کا رتبہ ہی نہیں قد سے ترے پست
شمشاد و صنوبر سے بھی بالا ہے تو یہ ہے
ملتا جو نہیں یار تو ہم بھی نہیں ملتے
غیرت کا اب اپنی بھی تقاضا ہے تو یہ ہے
اے نورِ نظر ! معجزۂ حسن سے تیرے
اندھے بھی کہیں گے کہ مسیحا ہے تو یہ ہے
محشر کو بھی دیدار کا پردہ نہ کرے یار
عاشق کو جو اندیشۂ فردا ہے تو یہ ہے
بینا ہوں جو آنکھیں تو رخِ یار کو دیکھیں
نظّارے کے قابل جو تماشا ہے تو یہ ہے
مضمونِ دہنِ یار کا کیا فکر سے نکلے
لا حل جو معمّوں میں معمّا ہے تو یہ ہے
گہ یادِ صنم دل میں ہے ، گہ یادِ الٰہی
کعبہ ہے تو یہ ہے جو کلیسا ہے تو یہ ہے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۰۰ ، نول کشور قدیم ص ۱۸۵ ، جدید ص ۲۹۲ -

معشوق و مے و خانۂ خالی و شبِ ماہ
عاشق کے لیے حاصلِ دنیا ہے تو یہ ہے

دیوانے نہ کیوں کر غل و زنجیر پہنتے
سرکارِ جنوں کا جو سراپا ہے تو یہ ہے

دل کے لیے ہے عشق ، تو دل عشق کی خاطر
مے ہے تو یہ ہے اور جو مینا ہے تو یہ ہے

دیوانۂ قد کے کبھی نالوں کو تو سنیے
ہنگامۂ محشر کا سا غوغا ہے تو یہ ہے

ثابت دہنِ یار دلیلوں سے کر **آتش**
حجت کی جو شاعر کے لیے جا ہے تو یہ ہے

۱۰۰

ایذا میں روح ہے تنِ خانہ خراب سے
پائے سمند الجھا ہوا ہے رکاب سے

بے خود ہے یار دولتِ حسنِ شباب سے
سچ ہے زیادہ نشۂ زر ہے شراب سے

افشانِ روے یار وقوعِ محال ہے
ممکن وصالِ ذرہ نہ تھا آفتاب سے

جاتا ہے تو جو گورِ غریباں کی سیر کو
مردے نجات پاتے ہیں اپنے عذاب سے

مضمونِ لب خیالِ رخِ یار میں ملا
پیدا کیا ہے ہم نے یہ لعل آفتاب سے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۰۰ ، نول کشور قدیم ص ۱۸۵ ، جدید ص ۲۹۳ ، بہارستانِ سخن ص ۲۵۱ -

نازک خیال اب بھی ہیں موجود اے فلک !
خالی رہا نہیں کبھی دریا حباب سے

کھاتا نہیں ہوں اس کو میں کھاتا ہوں اپنا گوشت
دل ٹوٹتا ہے گریۂ چشمِ کباب سے

برسائیں گی ہماری بھی آنکھیں لہو کا مینہ
بجلی گرائیے نہ نگاہِ عتاب سے

سیرِ دروں سے کنہِ حقیقت کھلی مجھے
باہر نہیں کتاب کا مطلب کتاب سے

بیدار بخت ایسا میں دیوانہ ہوں، جسے
پریاں اٹھا کے لے گئی ہیں فرشِ خواب سے

اس سے ہرے درخت ہوں، اس سے شگفتہ گل
رتبے میں اپنی خاک برابر ہے آب سے

قاتل ! لہو کو دیکھ کے غش آئے گا تجھے
تلوار کھینچ، منہ کو چھپا لے نقاب سے

کیا سرخ کر دیا مرے قاتل کا پیرہن
کچھ کم نہیں ہے خونِ شہیداں شہاب سے

نیرنگِ حسنِ یار کا دل میں خیال ہے
شیشہ بھرا ہے ہم نے شفق گوں شراب سے

نافہمی اپنی کرتی ہے انسان کو ذلیل
مطعونِ خلق صوفی ہے حالِ خراب سے

آتش وہ گنجِ حسن ملے تجھ کو چاہیے
ظاہر یہ ہوتا ہے ترے حالِ خراب سے

۱۰۱

[1]ظاہر ہوا ہمیں یہ تمہارے حجاب سے
یوسف چھپائے رکھتا تھا منہ کو نقاب سے

اپنا دماغِ خشک بھی تر ہو شراب سے
طاؤس وجد کرتے ہیں ساقی سحاب سے

یوسف میں اور یار میں اتنا ہی فرق ہے
اُس کو چھپایا ، اِس کو نکالا نقاب سے

حیرت کی جا ہے خطِ رخِ آتشینِ یار
نکلا ہے شپّرہ بغلِ آفتاب سے

اے شہ سوار ! پاؤں کا تیرے خیال ہے
آنکھوں نے حلقے وام لیے ہیں رکاب سے

اُس بحر میں کھلاتی ہے غوطے مجھے قضا
ٹکرا کے پارہ پارہ ہو کشتی حباب سے

بے خود ہوئے نہ رند چڑھا کر خُم و سبو
چکر میں چرخ ہے قدحِ آفتاب سے

یاد آ گیا ہے بوسۂ چشمِ سیاہِ یار
وحشت ہوئی ہے مجھ کو ہرن کے کباب سے

گلہائے زخم کے لیے خوش بو ضرور ہے
اے تُرک ! اپنی تیغ کو بُجھوا گلاب سے

دیوانے روزِ حشر کو پوچھے نہ جائیں گے
خارج ہے سرنوشت ہماری حساب سے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۰۱ ، نول کشور قدیم ص ۱۸۶ ، جدید ص ۲۹۴ -

گریے سے اپنے اس گلِ خنداں کو آیا رحم
تسخیرِ قلب کرتے ہیں ہم نقشِ آب سے

ہووے اگر حقیقتِ آدم سے مطّلع
شیطاں ہو منفعل عملِ ناصواب سے

کہتے ہیں ہاتھ دیکھ کے اس بت کا برہمن
تم عاشقوں کو قتل کرو گے حجاب سے

عمرِ دو روزہ ہو گئی اک حال پر بسر
خالی رہا زمانہ مرا انقلاب سے

باتوں میں بند ہو گیا غمّازِ پوچ گو
ٹیڑھے سوال رد ہوئے سیدھے جواب سے

روتا ہے وہ تو ہنستی ہے یہ اس کے حال پر
نفرت ہے مجھ کو صحبتِ برق و سحاب سے

آتش کو چن کے قتل کیا اس نے اس لیے
ہوتی ہے قدرِ شعرِ بلند انتخاب سے

۱۰۲

[1]کوئی اچھّا نہیں ہوتا ہے بری چالوں سے
لبِ بام آ کے کھڑے ہو نہ کھلے بالوں سے

روز و شب کس لیے رہتا ہوں الٰہی بے تاب
نہ تو گوروں سے محبّت، نہ مجھے کالوں سے

جوشِ وحشت میں جو جنگل کی طرف جا نکلا
تپ چڑھی شیرِ نیستاں کو مرے نالوں سے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۰۱ ، نول کشور قدیم ص ۱۸۶ ، جدید ص ۲۹۴ -

کوئی کچھ عشق کا کرتا ہے بیاں ، کوئی کچھ
تنگ آیا ہوں میں اس قضیے کے دلالوں سے
پیشتر صبحِ شبِ وصل سے ہم گزریں گے
زورِ ادبار چلے گا نہ خوش اقبالوں سے
مست ہاتھی ہے تری چشمِ سیہ مست اے یار !
صفِ مژگاں اسے گھیرے ہوئے ہے بھالوں سے
روے خوباں سے ملے گا ہمیں بوسہ کہ نہیں
حال ان شکلوں کا کچھ پوچھیے رمّالوں سے
عارضی حسن سے نفرت یہ ہوئی ہے دل کو
رتبہ زلفوں کو نہیں مکڑیوں کے جالوں سے
خطِ شب گوں نے نکل کر عبث اندھیر کیا
کافرستاں تو وہ رخ آگے ہی تھا خالوں سے
دو جہاں حشر کے دن ہوویں گے باہم موجود
متّفق ہوں گے اِدھر والے اُدھر والوں سے
دل حسینوں کے تصوّر سے بنایا خالی
آئنہ خانوں میں کثرت رہی تمثالوں سے
کچھ تو ہلکا کریں خارِ رہِ صحراے جنوں
بوجھ لنگر کا ہوئے ہیں کفِ پا چھالوں سے
اُن کے بوسوں کی تمنّا ہے لبوں کو آتش
آئنے کسبِ صفا کرتے ہیں جن گالوں سے

۱۰۳

اُتار[1] ، اُتارنا ساقی جو شیشہ طاق سے ہے
لبوں پر آئی مِری جان اشتیاق سے ہے

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۰۲ ، نولکشور قدیم ص ۱۸۶ ، جدید ص ۲۹۵ -

جواب دوں ترے نالے کا کیا میں اے بُلبل !
کراہنا مجھے تکلیف ہائے شاق سے ہے
نہ سوؤ ساتھ مرے رکھ کے درمیاں شمشیر
یہ اتّفاق بھی کچھ کم نہیں نفاق سے ہے
مقامِ شکر ہے ایذا جو دردِ عشق سے ہو
غنیمت اس کو سمجھ حسنِ اتّفاق سے ہے
ہمارے دل کو جلاتا ہے شمع کا جلنا
مشابہت بہت اس کو کسی کی ساق سے ہے
یہ وہ بلا نہیں بے جان کے لیے جو ٹلے
یقین صبح کا کس کو شبِ فراق سے ہے
جمالِ چہرۂ خورشید بھی ہے کیا نعمت
کروروں ذرہ ہوا سیر اک طباق سے ہے
نظارے کے لیے ہے قحطِ حسنِ نوخیزاں
کمال تنگ دل اب اس کہن رواق سے ہے
نہ بیٹھ پھول کے تو شاخِ گل پر اے بلبل !
خرابی ہی خس و آتش کے اتّفاق سے ہے
خدا کے واسطے کشتیِ مے کو لا ساقی !
تباہ حال بہت آتش اشتیاق سے ہے

۱۰۴

[1]خواہاں ترے ہر رنگ میں اے یار! ہمیں تھے
یوسف تھا اگر تُو ، تو خریدار ہمیں تھے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۰۳ ، نول کشور قدیم ص ۱۸۷ ، جدید ص ۲۹٦ -

بیداد کے ، محفل میں ، سزاوار ہمیں تھے
تقصیر کسی کی ہو ، گنہ گار ہمیں تھے

وعدہ تھا ہمیں سے لبِ بام آنے کا ہونا
سایے کی طرح سے پسِ دیوار ہمیں تھے

کنگھی تری زلفوں کی ہمیں پر تھی مقرّر
آئینہ دکھاتے تجھے ہر بار ہمیں تھے

نعمت تھی ترے حسن کی حصّے میں ہمارے
تُو کانِ ملاحت تھا ، خریدار ہمیں تھے

سودا زدہ زلفوں کا نہ تھا اپنے سوا ایک
آزاد دو عالم تھا ، گرفتار ہمیں تھے

تُو اور ہم اے دوست ! تھے یک جان دو قالب
تھا غیر ، سوا اپنے جو تھا ، یار ہمیں تھے

بیمارِ محبّت تھا سوا اپنے نہ کوئی
اک مستحقِ شربتِ دیدار ہمیں تھے

بے اپنے بہلتی تھی طبیعت نہ کسی سے
دل سوز ہمیں تھے ترے ، غم‌خوار ہمیں تھے

اک جنبشِ مژگاں سے غش آتا تھا ہمیں کو
دو نرگسِ بیمار کے بیمار ہمیں تھے

جب چاہتے تھے لیتے تھے آغوش میں تم کو
مجبور سے رہ جاتے تھے ، مختار ہمیں تھے

ہم سا نہ کوئی چاہنے والا تھا تمھارا
مرتے تھے ہمیں ، جان سے بیزار ہمیں تھے

بدنام محبّت نے تری ہم کو کیا تھا
رسوائے سرِ کوچہ و بازار ہمیں تھے

دل ٹھوکریں کھاتا تھا نہ ہر گام کسی کا
اک خاک میں ملتے دمِ رفتار ہمیں تھے
بھڑکانے سے آتش کو جلانے لگے، یا تو
الطاف و عنایت کے سزاوار ہمیں تھے

۱۰۵

[۱] گنگ ایمائے لبِ یار سے گویا ہووے
آنکھیں تلووں سے ملے کور تو بینا ہووے
حبّذا یار کا در، بابِ سعادت کہیے
زہے دیوار، ہُما سایے سے پیدا ہووے
چھپ سکی بادِ سحر سے نہ تری زلف کی بو
مُشک کا چور یقیں ہے یہ کہ رسوا ہووے
یار نے پردہ کیا ہم سے، بہت خوب کیا
حُسن ہے وہ بھی کوئی جو کہ تماشا ہووے
اس بیاباں میں پیادہ مجھے لائی ہے قضا
شہ سواروں کی جہاں گرد نہ پیدا ہووے
ناف پر تیری ہو کیوں کر نہ نگاہوں کا ہجوم
ہالہ بے ماہ جو ہو جاوے تماشا ہووے
دل نہیں داغ ہے، جس میں نہیں کیفیّتِ عشق
جسم بے روح ہے، بے بادہ جو مینا ہووے
آبرو چاہے اگر معرکۂ الفت میں
کود پڑ اس میں، کنواں ہووے کہ دریا ہووے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۰۳، نولکشور قدیم ص ۱۸۷، جدید ص ۲۹۶ -

روز و شب چرخ ہنڈولے کی طرح پھرتا ہے
کس طرح سے نہ زمانہ تہ و بالا ہووے

حشر کا روز گذر جائے، ملے حور و بہشت
وہ بھی دن ہو کہ نہ اندیشۂ فردا ہووے

نفرت آنے میں جو کی تھی، عوض اس کا یہ سمجھ
روح کو جسم کے چھٹنے میں جو ایذا ہووے

میری تکبیر کی آواز جو راہب سن پائے
دردِ سر نالۂ ناقوسِ کلیسا ہووے

روشنی سے مجھے اس کی یہ یقیں ہوتا ہے
پنج شاخہ ترے در کا یدِ بیضا ہووے

دل کو خوش رکھتی ہے نافہمیِ کم عمر آتش
کوئی دیوانہ ہو، لڑکوں کو تماشا ہووے

۱۰۶

سر کاٹ کے کر دیجیے قاتل کے حوالے[۱]
ہمت مری کہتی ہے کہ احسان نہ لا لے

ہر قطرۂ خوں سوزِ دروں سے ہے اک اخگر
جلاد کی تلوار میں پڑ جائیں گے چھالے

یوں دیتے ہیں وہ عاشقِ بے صبر کو بوسہ
جیسے کوئی صدقہ کرے بھوکے کے حوالے

شمشیر پھر اے ترک! نہیں تیغ یہ تیری
سیفی ہے مرے سر کی بلا کو جو یہ ٹالے

نادان نہ ہو، عقل عطا کی ہے خدا نے
یوسف[ع] کی طرح تم کو کوئی بیچ نہ ڈالے

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۰۳، نولکشور قدیم ص ۱۸۸، جدید ص ۲۹۷ -

نقاشِ ازل نے تری تصویر میں رکھتے
اندازِ رُخ و زلف زمانے سے نرالے
ہستی کی اسیری سے، شرر سے ہیں سوا تنگ
چُھوٹے تو اِدھر پھر کے نہیں دیکھنے والے
سالک کو یہی جادے سے آواز ہے آتی
پامال جو ہو، راہ وہ منزل کی نکالے
کچھ اور لبِ یار کی تعریف کروں کیا
وہ لعل کہ دیکھے سے پڑیں جان کے لالے
گردِ رخِ زیبا رہیں کیوں کر نہ وہ زلفیں
دو سانپ حفاظت کو ہیں اک گنج کے پالے
صیاد چمن ہی میں کرے مرغِ چمن ذبح
لبریز لہو سے بھی درختوں کے ہوں تھالے
پیغامِ اجل ہوتے ہیں اس عشق کے صدمے
پالا نفسِ سرد سے اللہ نہ ڈالے
دشمن سے سمجھتے ہیں ہم اُس دوست کو بدتر
مشتاق کو منہ اپنا دکھا کر جو چھپا لے
مضمون ہے تو شمعِ رخِ یار کا آتش
شاعر ہے اسے فکر کے سانچے میں جو ڈھالے

۱۰۷

[1]آبلے پاؤں کے کیا تُو نے ہمارے توڑے
خارِ صحرائے جنوں! عرش کے تارے توڑے
ذقن و رُخ میں نہ جا بوسوں سے باقی رکھتے
ثمر و گلِ چمنِ حسن کے سارے توڑے

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۰۴، نول کشور قدیم ۱۸۸، جدید ص ۲۹۸ -

سلسلہ اپنی گرفتاری کا کب قطع ہوا
پھنی پازیب انھوں نے جو اُتارے توڑے
مست مجھ سا بھی کوئی نشے کا ہوگا نہ حریص
پی کے مے، جام کے دانتوں سے کنارے توڑے
شربتِ وصل ہے تنقیہ کی خاطر موجود
تپِ ہجر آ کے بدن کو نہ ہمارے توڑے
ختم دزدیدہ نگہ پر ہے تری طرّاری
دل نہیں توڑے، احبا کے پٹارے توڑے
آ گیا وہ شجرِ حسن نظر جب ہم کو
بوسے لے کر لبِ شیریں کے چھوارے توڑے
عشق بے درد سے کرنے کو کہا تھا کس نے
سر کو ٹکرا کے نہ دل درد کے مارے توڑے
کنجِ عزلت میں بٹھایا ہے خدا نے آتش
اب جو تم یاں سے ہلے پاؤں تمھارے توڑے

۱۰۸

[1]پاتا ہوں مہر و مہ کو تہی عدل و داد سے
خالی یہ کعبتین[2] ہے نقش مراد سے
سودا ہے سر کو زلفِ گرہ گیر یار کا
دل بستگی ہے کافرِ خوش اعتقاد سے
زندہ نہ چھوڑے گی نگہِ خشمگینِ یار
نیکی کی چشم داشت نہیں بد نہاد سے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۰۲، نول کشور قدیم ص ۱۸۸، جدید ص ۲۹۸ -
۲ - کعبتین : دو پانسے -

پار اتریں خاک بحرِ محبت کی کشتیاں
طوفانِ نوح رہتا ہے بادِ مراد سے
شہرہ تمھارے حسن کا پہنچا ہے دور دور
مکتوبِ شوق آتے ہیں کس کس بلاد سے
زور آوری پر اپنے نہ سرکش کریں غرور
عاجز نہیں خدا کا غضب قومِ عاد سے
مر کر ملائی سرکشیِ نفس خاک میں
کی جان کھو کے ہم نے فراغت جہاد سے
عاشق کے حال سے نہیں معشوق بے خبر
بندے کو بھولتا نہیں اللہ یاد سے
دیوانہ ہو نہ دیکھ کے دل حسنِ عارضی
اچھا نہیں ہے سابقہ بے اعتماد سے
اللہ سے مرادِ دلی کا ہوں ملتجی
سائل ہوں میں فقیر کریم و جواد سے
جو کچھ کہ ہوں میں خوب اسے جانتا ہے دوست
دشمن ہزار بد کہے میرے عناد سے
بے درد و دردمند کا احوال کھل گیا
بیمار تندرست سے ، ناشاد شاد سے
ہنگامہ حسن و عشق کا یونہی رہے گا گرم
فتنے نہ باز آئیں گے شر و فساد سے
مالوف یار مجھ سے ، میں شیدائے یار ہوں
مشتاقِ ہم دگر ہیں دو دل اتحاد سے
خونِ جگر سے پرورشِ شعر ہم نے کی
فرزند کا سلوک کیا خانہ زاد سے

دشمن جو ہو حسین علیہ السلام کا
آتش نہ کم سمجھ اسے ابنِ زیاد سے

۱۰۹

یہ کس رشکِ مسیحا کا مکاں ہے
زمیں جس[۲] کی چہارم آسماں ہے

خدا پنہاں ہے ، عالم آشکارا
نہاں ہے گنج ، ویرانہ عیاں ہے

دلِ روشن ہے روشن گر کی منزل
یہ آئینہ سکندر کا مکاں ہے

تکلف سے بری ہے حسنِ ذاتی
قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے

پسیجے گا کبھی تو دل کسی کا
ہمیشہ اپنی آہوں کا دھواں ہے

برنگِ بو ہوں گلشن میں میں بلبل
بغل غنچے کی میرا آشیاں ہے

شگفتہ رہتی ہے خاطر ہمیشہ
قناعت بھی بہارِ بے خزاں ہے

چمن کی سیر پر ہوتا ہے جھگڑا
کمر میری ہے ، دستِ باغباں ہے

بہت آتا ہے یاد اے صبرِ مسکیں
خدا خوش رکھے تجھ کو تو جہاں ہے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۰۵ ، نولکشور قدیم ص ۱۸۹ ، جدید ص ۲۹۹ ، بہارستانِ سخن ص ۲۰۶ -

۲ - نولکشوری نسخوں میں ہے : ''زمیں یاں کی چہارم آسماں ہے -''

الٰہی ! ایک دل کس کس کو دوں میں
ہزاروں بت ہیں یاں ہندوستاں ہے
یقیں ہوتا ہے خوشبوئی سے اُس کی
کسی گل‌رو کا غنچہ عطرداں ہے
وطن میں اپنے اہلِ شوق کی طرح
سفر میں روز و شب ریگِ رواں ہے
سحر ہووے کہیں شبنم کرے کوچ
گل و بُلبُل کے دریا درمیاں ہے
سعادت مند قسمت پر ہیں شاکر
ہُما کو مغزِ بادام استخواں ہے
دلِ بےتاب جو اس میں گرے ہیں
ذقنِ جاناں کا پارے کا کنواں ہے
جرس کے ساتھ دل رہتے ہیں نالاں
مرے یوسف کا عاشق کارواں ہے
نہ کہہ رندوں کو حرفِ سخت واعظ !
درشت اہلِ جہنّم کی زباں ہے
قدِ محبوب کو شاعر کہیں سرو
قیامت کا یہ اے آتش ! نشاں ہے

۱۱۰

آتشِ نالۂ بُلبُل سے دھؤاں ہوتا ہے[1]
سیرِ گلزار سے مجھ[2] کو خفقاں ہوتا ہے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۰۵ ، نولکشور قدیم ص ۱۸۹ ، جدید ص ۳۰۰ -
۲ - کلیات طبع علی بخش : ''تجھ کو خفقاں ہوتا ہے -''

رُوے گل کو رخِ رنگیں سے ترے کیا نسبت
قد صنوبر کا یہ بُوٹا سا کہاں ہوتا ہے

ظاہری بازیِ ایّام ہے باطن سے خلاف
دانہ ہوتا ہے عیاں ، دام جہاں ہوتا ہے

وعدۂ شب نہ کر اے مہر لقا ، جھوٹ نہ بول
جلوہ گر رات کو خورشید کہاں ہوتا ہے

باتیں کرتا ہوں نگاہوں میں پری زادوں سے
دیدۂ شوق سے یاں کارِ زباں ہوتا ہے

ابروے یار سے قوّت ہے مژہ کو ساری
تیر کے واسطے سب زورِ کماں ہوتا ہے

فرشِ گل پر وہ نزاکت سے نہیں سو سکتے
تنِ نازک میں رگِ گل کا نشاں ہوتا ہے

حسن کو داغ لگا دے گی یہ سیرِ گلزار
آپ پر حورِ بہشتی کا گماں ہوتا ہے

صورتِ کعبہ دکھاتے ہیں جو طاقِ ابرو
چاہِ زمزم وہ زنخداں کا کنواں ہوتا ہے

حسرت انجام جہانِ گزراں ہے غافل!
حسن رہتا نہیں گلزار خزاں ہوتا ہے

جذبۂ دل سے الٹتا ہے نقابِ رخِ یار
پردۂ غیب کا احوال عیاں ہوتا ہے

چشمِ تر عالمِ نیرنگ دکھاتی ہے مجھے
برجِ آبی مرے رہنے کا مکاں ہوتا ہے

زیرِ دیوار جو ٹھہروں تو حسد سے میرے
سایہ سر پر سے دبے پاؤں رواں ہوتا ہے

جائے نامرد نہیں بزم میں اپنے آتش
مصرعِ تیغ کے مطلب کا بیاں ہوتا ہے

۱۱۱

۱خدا محفوظ رکھے دل کو آس افعیِ کاکل سے
نہیں ممکن سلامت چھوٹنا موذی کے چنگل سے
شرابِ سرخ کا ساغر چلے ساقی لبِ جو پر
چمن سرسبز ہے بارانِ رحمت کے تفضّل سے
اگر نام آوری مقصود ہے ، نیکوں سے صحبت رکھ
ہوا ہے شہرۂ آفاق لفظ طیب سنبل سے
پری لاتی ہے صندل گھس کے مجھے دیوانے کی خاطر
جو سر میں درد ہوتا ہے کبھی زنجیر کے غل سے
اٹھائی آستیں جو چشمِ دریا بار سے اپنی
بنے گرداب دورِ دامن اشکوں کے تسلسل سے
چمن کی سیر سے نفرت ہمارے دل کو ہوتی ہے
طبیعت کو خفا کرتی ہے صحبت خار کی گل سے
خدا پر رکھ نظر طالب اگر ہے دین و دنیا کا
یقیں ہے دولتِ کونین حاصل ہو توکل سے
ضرر پہنچاتی ہے معشوق کو بےتابیِ عاشق
پھٹے ہیں پردہ ہائے گوشِ گل فریادِ بلبل سے
اثر پیدا کیا گردش نے اس کے دورِ ساغر کا
تری آنکھوں نے کیفیّت اٹھائی ساغرِ مُل سے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۰۶ ، نولکشور قدیم ص ۱۹۰ ، جدید ص ۳۰۰ -

منغّص کی طبیعت یار بن سامانِ عشرت نے
دماغ اپنا پریشاں ہوگیا مینا کی قُلقل سے
شبِ مہ میں جو دریا کے کنارے جا کے روتا ہوں
گزر جاتی ہے کشتی مار کر ٹھوکر سرِ پل سے
قیامت میں بھی کوئی حال کو اُن کے نہ پوچھے گا
کیا ہے کشتہ تو نے جن کو شمشیرِ تغافل سے
نہایت مشتِ خاکِ آتشِ بےکس کو حسرت ہے
کسی دامن تلک پہنچے صبا تیرے توسّل سے

۱۱۲

[1]بالائے بامِ خانہ وہ عالی جناب ہے
منزل سے اپنی جلوہ نما آفتاب ہے
دیکھے جو بےنقاب تجھے، کس کو تاب ہے
خورشید تیرے آگے گلِ آفتاب ہے
فصلِ بہار آئی ہے، دورِ شراب ہے
قاضی و محتسب کا کلیجہ کباب ہے
زیرِ زمیں بھی چین کی صورت نہیں کوئی
آسودگانِ خاک کی مٹّی خراب ہے
بیدار آج ہووے تو فردائے حشر کو
خواب اپنے بخت کا نہیں مُردے کا خواب ہے
فصلِ بہار آ کے خزاں بارہا ہوئی
انگور میں ہنوز ہمارے شراب ہے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۰۶ ، نول کشور قدیم ص ۱۹۰ ، جدید ص ۳۰۱ ، بہارستان سخن ص ۲۴۰ -

دیوانگانِ عشق گرفتارِ حال ہیں
تُو اے پری! اسیرِ طلسمِ حجاب ہے

تصویرِ یار دیکھی ہے فردائے حشر کو
اتنا تو ہم کہیں گے دہن لا جواب ہے

شاعر پسند حسن پُر آشوب ہے ترا
دیوانِ روزگار کا تُو انتخاب ہے

دوزخ بہشت ہو اگر اس کو نہ چھوڑئے
ہر پاٹ اپنے دامنِ تر کا سحاب ہے

بہلائیے شراب سے دل کو کوئی گھڑی
لہرا رہا ہے سبزہ، رواں جوئے آب ہے

دریا میں ایک روز نہانے گیا تھا یار
اُس دن سے اب تک آنکھوں میں جانِ حباب ہے

چندے میں پاک صحبتِ طاہر سے ہو نجس
سرکہ نمک سے چار گھڑی میں شراب ہے

بیداری سے زیادہ تڑپتا ہوں خواب میں
آسودگی میں برق کا یاں اضطراب ہے

خاطر نہ اس کی توڑیے جامِ شراب سے
مہماں چند روز یہ عہدِ شباب ہے

عاقل پر آشکار ہو صورت سے حالِ دل
چینِ جبینِ مردِ دلیلِ عتاب ہے

ساقی ملے گا باغ میں، دیکھا ہے خواب میں
جنّت ہے، دستِ حور میں جامِ شراب ہے

ڈورا کھنچا ہے کون سے قاتل کی تیغ پر
گردن میں کچھ رگوں کو بہت پیچ و تاب ہے

ٹلتے نہیں ہیں سامنے سے اشک ایک دم
آتش ہمارا تشنۂ دیدار آب ہے

۱۱۳

[1]تنگ دنیا کی خرابی میں ہوں نازک خو سے
دردِ سر ہونے لگا فاختہ کی کُو کُو سے

ماہِ نو دیکھ کے دیکھا کیے ہم صورتِ یار
ہر مہینے میں ہوا عید کا چاند ابرو سے

سیرِ گلشن میں ہوا یار برابر جو کھڑا
مصرعِ سرو کیا بیت قدِ دلجُو سے

شمع بے دود ہے یہ، آئنہ بے زنگ ہے وہ
کم نہیں خوبی میں کچھ ساقِ صنم زانو سے

حسنِ کافر کو کیا ہم نے مطیع الاَسلام
بوسۂ خال لیا، جزیہ لیا ہندو سے

غسل کر لے یہیں، دریا میں نہانے کو نہ جا
مچھلیاں لپٹیں گی اے یار! ترے بازو سے

لبِ جاں بخش سے ہے چشمِ فسوں گر کا سوال
زندہ اعجاز سے ہووے جو مرے جادو سے

جس قدر ہووے دراز، اس کو صنم ہونے دے
سنبلِ باغ کو بڑھ چلنے نہ دے گیسو سے

نہیں معلوم اُن آنکھوں کا ارادہ کیا ہے
کچھ اشارے[2] میں تو مژگاں نے کہا ابرو سے

۱- کلیات طبع علی بخش ص ۲۰۷، نولکشور قدیم ص ۱۹۱، جدید ۳۰۲ -
۲- طبع نول کشور و لکھنؤ: ''کچھ اشارت میں'' متن مطابقِ علی بخش -

زخمِ خنداں ہے بعینہ گلِ خنداں ہر ایک
بوئے خوں آتی ہے اس باغ میں آبِ جو سے
صورتِ جام و سبو ہجر کی شب گھبرا کر
خمِ گردوں کو میں توڑوں گا دمِ یاھو سے
سونگھ کر منہ کو ترے سونگھا تو بدتر نکلی
دہنِ غنچہ کی بو گندہ بغل کی بو سے
دیکھ کر چشمِ سیہ کو تری کہتے ہیں عرب
شترِ مست کو اندیشہ ہے اِس آہو سے
حور بن کر مرے پاس آئیو اے عزرائیل!
مرد ہوں، عشق میں رکھتا ہوں زنِ خوش رو سے
رحم کر واسطے اللہ کے، خاموش **آتش**!
پردۂ گوش جلے نالۂ آتش خو سے

۱۱۴

اشہرۂ آفاق مجھ سا کون سا دیوانہ ہے
ہند میں میں ہوں، پرستاں میں مرا افسانہ ہے
صید گاہِ مرغِ دل رخسارۂ جانانہ ہے
دام زلفِ عنبریں ہے، خال مشکیں دانہ ہے
حسن سے رتبہ ہے اپنے عشقِ کامل کا بلند
آستانے پر پری ہے، بام پر دیوانہ ہے
اس میں رہتا ہے صفائے روئے جاناں کا خیال
دل نہیں پہلو میں اپنے آئنے کا خانہ ہے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۰۷، نول کشور قدیم ص ۱۹۱، جدید ص ۳۰۲، بہارستان سخن ص ۱۹۸ -

بیچتا ہوں دل کو ، جو محبوب چاہے مول لے
بوسہ قیمت ہے ، توجّہ کی نظر بیعانہ ہے

پھوٹیں وہ آنکھیں نگاہِ بد سے جو دیکھیں تجھے
آتشیں رخسار مجمر ، خال کالا دانہ ہے

روز و شب اس شمع رو کو بھیجتا ہوں خطِ شوق
نامہ بر دن کو کبوتر ، رات کو پروانہ ہے

خارِ خارِ دل غنیمت جانتا ہوں عشق میں
زلفِ دودِ آہ کی آراستگی کا شانہ ہے

شرح لکھنا چاہیے اس کی بیاضِ صبح پر
مطلعِ خورشید بیتِ ابروے جانانہ ہے

حالتِ آئینہ رکھتا ہے صفا سے دل مرا
آشنا سے آشنا ، بیگانے سے بیگانہ ہے

قتل سے مجھ سخت جاں کے منکر اے قاتل ! نہ ہو
حجتِ قاطع تری تلوار کا دندانہ ہے

واسطے ہر شے کے دنیا میں مقرّر ہے[۱] محل
شہر میں جب تک ہے مجنوں گنج بے ویرانہ ہے

باغِ عالم میں نہیں اس شوخ سا کوئی حسیں
گل ہے اپنا یار ، یوسف سبزۂ بیگانہ ہے

اب نہیں اے یار ! جوبن کو ترے بیمِ زوال
خطِ مشکیں حسن کی جاگیر کا پروانہ ہے

حال ہے جس کا اسی کے واسطے ہے خوش نما
نقص ہے تلوار کا ، وصف ارّہ کا دندانہ ہے

---

۱ - کلیات طبع نولکشور و لاہور : ''دنیا میں مقرر ہیں محل ۔''

یار کھینچے تیغ تیرے قتل کرنے کے لیے
سر جھکا آتش یہ جائے سجدۂ شکرانہ ہے

۱۱۵

[1]سائل نجات کا ہوں خدائے کریم سے
رحمت بزرگ‌تر ہے گناہِ عظیم سے

آئی تھی کس کے سنبلِ عنبر شمیم سے
گلزار ہو رہے ہیں مُعطّر نسیم سے

حاضر ہے مرغِ دل جو دُرِ گوش یار لے
اک مشتِ پر عزیز نہیں اس یتیم سے

تُو شاہِ حسن ، حسن ہے تیرا فقیر یار
خطّ سیہ اشارہ سمجھ لے گلیم سے

دل دادہ جب سے ہوں کہ مری جان آپ کی
آواز آشنا نہ تھی گوشِ کلیم سے

بیدار بخت ہوں مَیں وہ مومن ، مرے لیے
آتی ہے حور خواب میں باغِ نعیم سے

یاد آئی بوئے پیرہنِ یار باغ میں
پہروں ہی بد دماغ رہے ہم شمیم سے

اللہ سے بھی اُن کو زیادہ غرور ہے
دو باتیں کیں نہ ایک صنم نے کلیم سے

کشمیر و طوس لے گئے آ کر دوشالہ باف
کچھ پشم جھڑ گئے تھے ہمارے گلیم سے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۰۸ ، نول کشور قدیم ص ۱۹۰ ، جدید ص ۳۰۳ -

کھلوایا بیڑا عیسیٰ سے ، کھائے جو اُس نے پان
بندھوائی مہندی پاؤں میں دستِ کلیم سے

خوش ہو نہ دیکھ کر قد و زلف و دہانِ یار
حرفِ الم عیاں ہے الف لام میم سے

پھندے میں عشق کے نہیں جن کا کہ دل پھنسا
نکلے گی جان اُن کی عذابِ الیم سے

صیّاد نے بہار سے پہلے کیا حلال
شرمندہ بوے گل کے نہیں ہم نسیم سے

مر جاؤں پر نہ رازِ محبّت ہو آشکار
واقف نہ ہو کوئی مرے حالِ سقیم سے

اب کی بہار میں تو مجھے پار اُتار دے
کشتیٔ سے دوآبۂ اُمیّد و بیم سے

سائل ہیں آسماں سے لبِ ناں کے کون لوگ
گل کھانے کو تو آپ ہی نہ لیں ہم لئیم سے

دنیا کو ٹھوکتے نہیں دیوانگانِ عشق
یاں طوق ہے طلا سے ، نہ زنجیر سیم سے

اک مشتِ استخواں پہ نہ اتنا غرور کر
قبریں بھری ہوئی ہیں عُظامِ رمیم[1] سے

بےقدر ہے سخن جو سخنداں کوئی نہیں
قدر اِس گُہر کی ہوتی ہے گوشِ فہیم سے

اللہ رے ہواے لبِ بامِ قصرِ یار
اُڑ کر کبوتر آگے گیا ہے نسیم سے

---

۱ - عُظام : جمع عظم - ہڈیاں - عظامِ رمیم : گلی ہوئی ہڈیاں -

داغِ غمِ فراق کی کرتا ہوں دل میں سیر
آنکھوں کو سینکتا ہوں میں نارِ جحیم سے

طفلی سے سامنا غم و اندوہ کا رہا
کیا کیا نہ حادثے ہوئے ہم پر قدیم سے

پھر گل شگفتہ ہوتے ہیں لیتے ہی انتقام
غافل نہیں بہار خزاں سے غنیم سے

شیشہ پری سے جان لے آتش بھرا ہوا
خالی سمجھ نہ خُم کو فلاطوں حکیم سے

۱۱۶

آج تک واقف نہیں کوئی ہمارے حال سے[1]
سامنا آئینے کا ہے عالمِ تمثال سے

پھنس کے اس میں مرغِ جاں چھوٹا رگوں کے جال سے
اپنی دل جمعی ہوئی زلفِ پریشاں حال سے

سامنے سینہ نہ کر اے دل! دہن کے خال سے
رکتی ہے بندوق کی گولی کہیں بھی ڈھال سے

نشۂ مے کا اثر رکھتا ہے مُطرب کا سماع
کچھ خبر رہتی نہیں صوفی کو اپنے حال سے

مطلبِ دیدار کے خاطر جو پھنکواؤں آسے
منہ چھپاویں سعد شکلیں قُرعۂ رمّال سے

جب چنا ہے روئے نُورانی پر افشاں یار نے
لڑ گیا ہے مطلعِ خورشید بیت المال سے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۰۹ ، نول کشور قدیم ص ۱۹۲ ، جدید ص ۳۰۴ -

افشرے کا بوسہ بازی میں مجھے ملتا ہے لطف
قند کی ڈلیاں وہ لب ہیں ، خالِ لب ہیں فالسے

باندھتا ہوں شعر میں مضمون طلائی رنگ کے
مرغِ زریں صید کرتا ہوں میں اپنے جال سے

کارِ اعلیٰ گو کرے ادنیٰ وہی بےقدر ہے
دیکھ لے قیمت میں کم ہوتا ہے کمبل شال سے

ہاتھ مل کر رہ گیا صیاد ، اڑا کر لے گئی
دانہ قسمت ہوا میرے پروں کی جال سے

ناتواں ہرچند میں مجنوں ہوں ، آنے دے بہار
اے جنوں ! زنجیر توڑوں گا ترے اقبال سے

کس کو ہے فکرِ کفن پروانہ[۱] مردہ ہوں میں
شمع کُشتہ ہوں ، مجھے کیا کام ہے غسال سے

ماہ رُو کیونکر کہیں تجھ کو نہ ہم صاحب کہاں
سینہ عارف نہ ہوگا صاف تیرے گال سے

دل الجھتا ہے نہایت ، دیکھیے ہوتا ہے کیا
زلفِ پیچاں کچھ اشارہ کر رہی ہے خال سے

حشر تک ہووے نہ وہ زلفِ سیہ آتش سفید
دوں جسے تشبیہ اپنے نامہ اعمال سے

۱۱۷

[۲]خرامِ ناز میں شمشیرِ برّاں کی روانی ہے
تری پاپوش اے ترکِ ستم گر سیف خانی ہے

۱- کلیات طبع بخش : ’’کس کو ہے فکر کفن و قبر وہ مردہ ہوں میں ۔‘‘
۲- کلیات طبع علی بخش ص ۲۰۹ ، نول کشور قدیم ص ۱۹۳ ، جدید ص ۳۰۵ ۔

ہر اک شعر اپنا معشوقوں کو پیغام زبانی ہے
دلیل اس پر ہمارے نظم کا کاف بیانی ہے
وہ ایسا کون سا معشوق ہے جس کو نہیں چاہا
یہ فردیں جتنی ہیں ان پر ہماری بھی نشانی ہے
ترقی حسن کی کھنچنے نہیں دیتی شبیہہ اس کی
اِدھر بہزاد عاجز ہے ، اُدھر مجبور مانی ہے
خوش الحاں نالہ کش مجھ سا نہ ہوگا باغ عالم میں
غذا میری دو نان گندم داؤد خانی ہے
ہوا سے اڑ کے پہنچا اس پری پیکر کے کوچے میں
وہ مجنوں ہوں جسے تخت سلیماں ناتوانی ہے
مٹا لے چار دن مجھ کو گیا جس روز جنت میں
کہاں پیری ، وہی میں ہوں ، وہی میری جوانی ہے
تری فرقت میں اے یوسف ! خلیل وقت ہیں عاشق
غم و اندوہ و حرماں کی ہمیشہ میہمانی ہے
خیال آیا ہے ہم کو ان دنوں مضمون گیسو کا
زمین شعر پر نازل بلائے آسمانی ہے
جسے دیکھا وہ ماہ چاردہ مطلوب ہے اس کو
عزیز دل نہ ہو کیونکر عجب یوسف جوانی ہے
فقیر مست ہوں نعمت مری حاضر ہے جو چاہے
کباب نرگسی ہے یا شراب ارغوانی ہے
نہیں بننے کا سودا ہم سے اس بازار عالم میں
عداوت کی ہے ارزانی ، محبت کی گرانی ہے
نگہ پھرتی ہے اس کی یک بیک دیوانہ ہووے گا
پری سمجھا ہے دل جس کو بلائے ناگہانی ہے

ستارہ آج کل چمکا ہوا ہے اپنا اے **آتش**!
موافق ہے فلک، اُس ماہ رُو کی مہربانی ہے

۱۱۸

[1]بہارِ باغ ایمائے شرابِ ارغوانی ہے
تسلسل خواہِ دورِ جام دورِ آسمانی ہے
سخن گوئی کا باعث عشقِ چشمِ یارِ جانی ہے
فسوں پرداز کی دولت سے یہ معجزبیانی ہے
تجھے اے تُرک! زیبا دعوئ صاحب قرانی ہے
مگر خنجر ترا لوحِ طلسمِ زندگانی ہے
کرے ہاتھوں کو کس کا طوق، کس کا بوسہ لے عاشق
دہن وہمی، کمر اُس آفتِ جاں کی گمانی ہے
فراقِ یار میں رو رو کے آنکھوں کو میں کھوؤں گا
میں ہوں یعقوب کا ہم چشم، وہ یوسف کا ثانی ہے
حذر کر میرے گریے سے، نہ رلوا آسماں مجھ کو
یہ وہ سیلاب ہے جو خانہ ویرانی کا بانی ہے
نصیحت کرتے کرتے اُس نے دیوانہ کیا مجھ کو
الٰہی پندِ ناصح ہے کہ پریوں کی کہانی ہے
وہ مکھڑا دیکھ کر بھولیں گے اپنی کشت کو دہقاں
خط اُس محبوب کے رخسارِ گندم گوں کا دھانی ہے
نہ آوارہ ہو، دل میں ڈھونڈھ اُسے جویا ہے تو جس کا
یہی ویرانہ ہے جس میں کہ وہ گنجِ نہانی ہے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۱۰، نولکشور قدیم ص ۱۹۳، جدید ص ۳۰۶ -

غنیمت سمجھیں اس وحشی کو کم سن دام میں اپنے
بھڑک کر جب اُڑا عنقا یہ طاؤسِ جوانی ہے
جو روتا ہوں تو کہتا ہے وہ ہنس کر مجھ سے اے آتش !
یہ کیا آزار ہے تجھ کو ، نہیں بچتا جو پانی ہے

۱۱۹

[1] کہاں تک آنکھوں میں سرخی شراب خواری سے
سفید مُو ہوے ، باز آ سیاہ کاری سے
رہا نہ پیچھے میں گریاں تری سواری سے
بلند گرد نہ ہونے دی اشک باری سے
سبوے غنچہ ہے معمور و جامِ گل لب ریز
ٹپک رہی ہے شراب ابرِ نو بہاری سے
جہاں دوست ہوں ، یاسیں کے بدلے وقتِ اخیر
سنوں گا سورۂ یوسف زبانِ قاری سے
وصالِ شاہدِ مقصود ہوگا بعدِ فنا
وہ دلربا جو ملے گا تو جاں نثاری سے
مروڑوں کان کو مجنوں کے مثلِ طفلِ شریر
عجب نہیں یہ جنوں کی بزرگ واری سے
دکھاؤ ہنس کے صفا اک دن اپنے دنداں کی
گُہر ہیں آگ کے مول اپنی آب داری سے
رقیب کو تری تلوار نیم جاں رکھتے
جو سرفراز ہو عاشق تو زخمِ کاری سے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۱۰ ، نول کشور قدیم ص ۱۹۳ ، جدید ص ۳۰۶ -

ہماری خاک سمجھنا اُسے ہمارے بعد
رہے جو گرد نہ پیچھے تری سواری سے
ترے دہان و کمر کا ہے ذکر وردِ زباں
ہمیشہ بحث ہے فرضی و اعتباری سے
چمک رہی ہے بہت ، برق سے[1] ملاؤں گا
ترے ڈوپٹے کی آنری ہوئی کناری سے
ثنائے حسن میں اُس کو خدا رواں رکھے
قلم نے پاؤں نکالے ہیں سر گزاری سے
سوالِ بوسہ پر انکار جبر کرنا ہے
کنارہ کرتے ہو کیا امرِ اختیاری سے
ہرا بھرا رہے اے باغباں ترا گلزار
دماغ تازہ رہیں نکہتِ بہاری سے
اکیلا پا کے نہیں چھوڑنے کا میں تم کو
خیال خام ہے یہ میری پختہ کاری سے
حقیقتِ چمنِ دہر سے جو ہو آگاہ
گلِ مراد چنے تو ہر اک کیاری سے
وصالِ یار نہیں تو وصالِ گور ہی ہو
جو کچھ کہ ہونا ہو آتش ہو آہ و زاری سے

۱۲۰

[2]عاشقِ جاں باز کی گردن پر احساں کیجیے
طشت و سر موجود ہے ، شمشیر عریاں کیجیے

۱ - کلیات طبع نولکشور و لاہور : ''برق کو ملاؤں گا ـ'' متن کلیات علی بخش کے مطابق ہے -

۲ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۱۰ ، نولکشور قدیم ص ۱۹۴ ، جدید ص ۳۰۷ -

وصل کی شب عیش و عشرت کا یہ ساماں کیجیے
خـودبھی عریاں ہوجیے ، اُس کو بھی عریاں کیجیے

اپنی صورت دیکھنے سے ایک دن فـرصت نہـیں
توڑ کر آئینہ اُس خود بیں کو حـیراں کیجیے

کـم نہیں خورشید سے داغِ جنوں میں روشـنی
صبح ہو جائے جو چاک اپنا گریباں کیجیے

راہ میں اکثر کنواں بنواتے ہیں لوگ ، آپ بھی
فی سبیل اللہ یہ چاہِ زنخداں کـیجیے

منہ تو دکھلا دے خدا تیرا گلـوں سے پیـشتر
چاک اے صبحِ بہار ! اپنا گریباں کیجیے

یہ سیہ دل صورتِ گیسو نہ ہوگا رُو سفید
خال وہ ہندو نہیں جس کو مسلماں کیجیے

چھپ کے آؤ ، آشکارا میرے گھر آئے تـو کـیا
اجر ہے اُس کا بڑا جو خیر پنہاں کیجیے

بلبلِ شیدا کے نالوں سے یہ آتی ہے صدا
فصلِ گل ہے ، چـار دن سـیرِ گلستاں کیـجیے

اپنے کہنے سے اک آبِ تلخ تم پیتے نہیں
آگ میں ہـم کودتے ہیں ، آپ اگر ہاں کیجیے

یہ صدا ہے اُس کے مشتاقوں کے گھر میں سے بلند
دیـدہ و دل فرشِ پاانداز مہماں کیـجیے

تم بھی دیوانے ہو **آتش** سنتے ہیں آئی بہار
بیٹھے کیا کرتے ہو ، **چاک** اُٹھ کر گریباں کیجیے

۱۲۱

پیری[1] سے مرا نوعِ دگر حال ہوا ہے
وہ قد جو الف سا تھا سو اب دال ہوا ہے

مقبول مرے قول سے قوّال ہوا ہے
صوفی کو غزل سن کے مری حال ہوا ہے

ان ہاتھوں کی دولت سے کڑا مال ہوا ہے
ان پاؤں سے آوازۂ خلخال ہوا ہے

المنۃ للہ بہ صد منّت ادھر سے
انکار تھا جس شے کا اب اقبال ہوا ہے

جب قتل کیا ہے کسی عاشق کو تو واں سے
جلّاد کی تلوار کو رومال ہوا ہے

کس عقدے کو اس زلف کے کھولا نہیں ہم نے
سلجھایا ہے الجھا ہوا جو بال ہوا ہے

کس سر کو نہیں یار کی رفتار کا سودا
معراج وہ سمجھا ہے جو پامال ہوا ہے

بیمار رہا برسوں ہی عیسیٰ نفسوں میں
پوچھا نہ کسی نے کبھی کیا حال ہوا ہے

جاوے جو صبا کوچۂ گیسو میں تو کہنا
سودائیوں کا تیرے برا حال ہوا ہے

بو مشک کی اس میں ہے تو عنبر کی پھر اس میں
کچھ زلف سے بھی طرّہ ترا خال ہوا ہے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۱۱، نولکشور قدیم ص ۱۹۷، جدید ص ۳۰۰ -

لڑواتا ہے آپس میں خریداروں کو تیرے
دلال ترا قضیے کا دلال ہوا ہے
دیدار ہے عام اہلِ نظر سے ہے اگر تو
دولت تری خاطر سے جو کچھ مال ہوا ہے
اے ابرِ کرم تو ہی سفید اس کو کرے گا
برسوں میں سیہ نامۂ اعمال ہوا ہے
جو ناز کرے یار ، سزاوار ہے آتش
خوش رُو و خوش اسلوب و خوش اقبال ہوا ہے

۱۲۲

یہ کہاں داری ہے دم تک عاشقِ دل گیر کے
اس نشانے کو اڑا کر پر کٹیں گے تیر کے
وا ہوئے ہرگز نہ وہ عقدے جو تھے تقدیر کے
سعی کرتے کرتے ناخن گھس گئے تدبیر کے
بسکہ قامت سے ہے آثارِ قیامت آشکار
فتنے ہوتے ہیں مرید اس کافرِ بےپیر کے
آشنا معنی سے بھی ہو جائیں گے صورت پرست
دیکھ لیں گے تجھ کو بھی عاشق تری تصویر کے
ایک میرے قتل سے دو لطف اے قاتل ہوئے
زنگِ دل تیرا مٹا ، جوہر کھلے شمشیر کے
کھائے ہیں دو چار گل خوبانِ گل رخسار پر
داغ چند اس عشق میں تھے اپنی بھی تقدیر کے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۱۱ ، نول کشور قدیم ص ۱۹۵ ، جدید ص ۳۰۸ ، بہارستانِ سخن ص ۱۸۵ -

بوسہ لیتا ہوں تو کہتا ہے طمانچا مار کر
دیجیے تعزیر اُسے قابل جو ہو تعزیر کے

گفتگو تو نے غرورِ حسن سے اے بت نہ کی
رہ گئے مشتاق گوش اپنے تری تقریر کے

شہرہ ہے گیسوئے پیچاں کا تمھارے ہر طرف
غلغلے ہیں چار سُو اس بے صدا زنجیر کے

جنبشِ مژگاں سے وہ خوں‌خوار کھیلے گا شکار
صید کے تودے لگا دیں گے یہ دستے تیر کے

اپنے دیوانوں کو صحرائے عدم پہنچا دیا
چیر ڈالا ارہ سے مانگ اس پری نے چیر کے

آج کل سے حسن پر وہ نازنیں نازاں نہیں
عاشقوں پر پیس کر توڑے ہیں دندان شیر کے

قہقہے کرتے ہیں مثلِ کبک نالوں کے عوض
عاشقِ شیدا تمھاری چاند سی تصویر کے

دولتِ دنیا سے **آتش** ہم نے جب پھیری نگاہ
جس طرف آنکھ اٹھ گئی تودے لگے اکسیر کے

۱۲۳

[1]تیغِ ابرو نہیں دی جانے کی اے دل ! خالی
سہل اس چوٹ کا کھا لینا ہے ، مشکل خالی

جو ستم چاہے سو کر یار نہ بد پر ہوں گے
کینے سے رکھتے ہیں سینہ ترے سائل خالی

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۱۲ ، نول کشور قدیم ص ۱۹۵ ، جدید ص ۳۰۹ ، بہارستانِ سخن ۲۱۳ -

تیغِ خوش آب سے تیری ہے توقّع قاتل
سر سے پا تک نہ رہے زخم سے بسمل خالی

کیا تپنچے کی طرح ہم سے بھرا پھرتا ہے
کھینچ کر تیغ ، دل اپنا کرے قاتل خالی

دیتی ہے شانِ کریمی اُسے حسبِ دل خواہ
تیری درگاہ سے پھرتا نہیں سائل خالی

قصرِ تن سا بھی نہ دلچسپ کوئی گھر ہوگا
روحِ مہماں اسے کرتی ہے بہ مشکل خالی

دلِ بےدرد سے رہتی ہے گراں خاطر رُوح
بوجھ ناقے کو ہے لیلیٰ سے یہ محمل خالی

برق وش یار کی فرقت میں ہوئے جب بےتاب
ابرِ باراں کی طرح روکے کیا دل خالی

ہفت اقلیم ترا بھرتی ہے دم اے محبوب
حسن کے عشق سے کوئی نہیں منزل خالی

فرقتِ یار میں جامے سے ہوں باہر رہتا
بے خودی رکھتی ہے مجھ سے مری منزل خالی

تیرے دم سے ہیں بجا میرے[1] حواسِ خمسہ
اٹھ گیا تُو تو ہوئی یار یہ محفل خالی

جنگ جُو یار کا اصلاح پر آیا نہ مزاج
عقل سے ہوتا ہے فی‌الواقعی جاہل خالی

کعبے میں ہم کو ہے مقصود بہارِ فردوس
دل میں جا ہے تری ، اے حور شمائل ! خالی

---

۱ کلیات طبع نولکشور و لاہور: ''بجا اپنے حواسِ خمسہ ۔'' متن کلیات علی بخش کے مطابق ہے ۔

دل کے بہلانے کو گلزار میں آ نکلا ہوں
سر کو میرے نہ کرے شورِ عنادل خالی

روشنیِ حسن کی رکھے گی زمانہ روشن
شمع رُویوں سے رہے گی نہ یہ محفل خالی

جام میں قطرۂ مے لب نہ مرے چھوڑیں گے
مالِ کشتی کو کیا کرتے ہیں ساحل خالی

قیس و فرہاد سے دل دادہ ہزاروں آتش
تیشہ بیکار رہے گا ، نہ سلاسل خالی

۱۲۴

الے کے تیشہ کھینچنا رنج و محن کیا چاہیے
جانِ شیریں کھونے کو اے کوہ کن کیا چاہیے

تیرے کُشتوں کو نہیں پروائے رختِ آخرت
ہو نہ ممکن تو شہیدوں کو کفن کیا چاہیے

میں گدائے حسن ہوں ، صورت ہی میری ہے سوال
بہرِ عرضِ مدّعا مجھ کو دہن کیا چاہیے

دل جلا لینا کہیں تیری طرح سے اے چراغ !
ہم کو بالینِ مزار و انجمن کیا چاہیے

جامۂ عریانی ہی سے تنگ میں دیوانہ ہوں
پھاڑ کھانے کو بدن کے پیرہن کیا چاہیے

تُو تو سودائی نہیں میری طرح سے زلف کی
دخل روغن میں تجھے اے یاسمن ! کیا چاہیے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۱۲ ، نول کشور قدیم ص ۱۹۵ ، جدید ص ۳۰۹ -

جان کھونے کے لیے لازم نہیں ہے عشقِ حُسن
ڈوب مرنے کے لیے چاہِ ذقن کیا چاہیے

تیوری رہتی ہے چڑھی ، کچھ تم کو سودا تو نہیں
اس جبیں پر گیسوؤں کی سی شکن کیا چاہیے

یہ اشارہ کرتی ہے غربت میں شمشیرِ قضا
کہہ لے کہنا ہو جو کچھ اے بے وطن ! کیا چاہیے

فکرِ رنگیں ہم کو دکھلاتی ہے گھر بیٹھے بہار
مثلِ بلبل نالہ کرنے کو چمن کیا چاہیے

چومتا ہوں پاؤں اے آتش تو کہتا ہے وہ بت
مردِ مومن کو طریقِ برہمن کیا چاہیے

۱۲۵

'صورت سے اس کی بہتر صورت نہیں ہے کوئی
دیدارِ یار سی بھی دولت نہیں ہے کوئی

آنکھوں کو کھول اگر تو دیدار کا ہے بھوکا
چودہ طبق سے باہر نعمت نہیں ہے کوئی

ثابت ترے دہن کو کیا منطقی کریں گے
ایسی دلیل ، ایسی حجت نہیں ہے کوئی

یہ کیا سمجھ کے کڑوے ہوتے ہیں آپ ہم سے
پی جائے گا کسی کو شربت نہیں ہے کوئی

میں نے کہا "کبھی تو تشریف لاؤ" بولے
"معذور رکھیے ، وقتِ فرصت نہیں ہے کوئی"

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۱۳ ، نول کشور قدیم ص ۱۹۶ ، جدید ص ۳۱۰ -

ہم کیا کہیں کسی سے کیا ہے طریق اپنا
مذہب نہیں ہے کوئی ، ملّت نہیں ہے کوئی

دل لے کے جان کے بھی سائل جو ہو تو حاضر
حاضر جو کچھ ہے اس میں حجّت نہیں ہے کوئی

ہم شاعروں کا حلقہ ، حلقہ ہے عارفوں کا
نا آشنائے معنی صورت نہیں ہے کوئی

دیوانوں سے ہے اپنے یہ قول اُس پری کا
خاکی و آتشی سے نسبت نہیں ہے کوئی

مژدہ ہزار عالم دم بھر رہا ہے تیرا
تجھ کو نہ چاہے ، ایسی خلقت نہیں ہے کوئی

نازاں نہ حسن پر ہو ، مہماں ہے چار دن کا
بے اعتبار اس سے[1] دولت نہیں ہے کوئی

جاں سے عزیز دل کو رکھتا ہوں ، آدمی ہوں
کیونکر کہوں میں ، مجھ کو حسرت نہیں ہے کوئی

یوں بد کہا کرو تم ، یوں مال کچھ نہ سمجھو
ہم سا بھی خیر خواہِ دولت نہیں ہے کوئی

میں پانچ وقت سجدہ کرتا ہوں اُس صنم کو
مجھ کو بھی ایسی ویسی خدمت نہیں ہے کوئی

ما و شما ، کہ و مہ کرتا ہے ذکر تیرا
اس داستاں سے خالی صحبت نہیں ہے کوئی

شہرِ بُتاں ہے آتش ! اللہ کو کرو یاد
کس کو پکارتے ہو حضرت ! نہیں ہے کوئی

---

۱ - کلیات طبع نول کشور و لاہور : "بے اعتبار ایسی دولت ـ" متن کلیات طبع علی بخش کے مطابق ہے ۔

[1]بازارِ دہر میں تری منزل کہاں نہ تھی
یوسف نہ جس میں ہو ، کوئی ایسی دکاں نہ تھی

زردی نے میرے رنگ کی مجھ کو رلا دیا
ہنسوائے جو کسی کو یہ وہ زعفراں نہ تھی

ظاہر سے خوب رُویوں کو باطن خلاف تھا
شیریں لبوں کی طرح سے اُن کی زباں نہ تھی

منزل ہی دور ہے جو یہ پہنچے نہیں ہنوز
دم لینے والی راہ میں عمرِ رواں نہ تھی

دکھلاتی سیر آنکھوں کو بامِ مراد کی
ایسی کوئی کمند ، کوئی نردباں نہ تھی

قوسِ قزح سے ہم نے بھی تشبیہ دی اسے
چلّہ نہ ہونے سے جو وہ ابرو کماں نہ تھی

آگاہ جذبِ عشقِ زلیخا سے تھا نہ حُسن
یوسف[ؑ] کو چاہ میں خبرِ کارواں نہ تھی

یاد آ گئی جو سلکِ گُہر تیرے گوش کی
سُوہانِ روح تھی مجھے ، شب کہکشاں نہ تھی

رہ جانا پیچھے جسم کا جاں سے عجب نہیں
کس کارواں کی گرد پسِ کارواں نہ تھی

نافہمی کی دلیل ہے یہ سجدے سے اِبا[2]
ابلیس کو حقیقتِ آدم[ؑ] عیاں نہ تھی

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۱۳ ، نول کشور قدیم ۱۷۶ ، جدید ص ۲۷۸ -
۲ - ابا : بکسر اول - انکار -

عاشق کے سر کے ساتھ ہے سودائے کوئے یار
سوسن نہ تھا وہ جس کو ہوائے جناں نہ تھی

بانگِ جرس سے آگے ہر اک کا قدم رہا[1]
گرد اپنے کارواں کی پسِ کارواں نہ تھی

افسوس کیا جوانیِ رفتہ کا کیجیے
وہ کون سی بہار تھی جس کو خزاں نہ تھی

نالوں سے ایک دن نہ کیے گرم گوش یار
آتش! مگر تمھارے دہن میں زباں نہ تھی

۱۲۷

[2]لختِ جگر کو کیوں کر مژگانِ تر سنبھالے
یہ شاخ وہ نہیں جو بارِ ثمر سنبھالے

دیوانہ ہو کے کوئی پھاڑا کرے گریباں
ممکن نہیں کہ دامن وہ بے خبر سنبھالے

تلوار کھینچ کر وہ خوں‌خوار ہے یہ کہتا
منہ پر جو کھاتے ڈرتا ہو وہ سپر سنبھالے

اللہ ناتواں کو دے طاقتِ توانا
ہیکل کا بوجھ اُن کی نازک کمر سنبھالے

تکیے میں آدمی کو لازم کفن ہے رکھنا
بیٹھا رہے مسافر رختِ سفر سنبھالے

اک دم نہ نبھنے دیتی اُن کی تنک مزاجی
رکھتے نہ ہم طبیعت اپنی اگر سنبھالے

---

۱ - کلیات علی بخش: ''ہر اک کا قدم بڑھا ۔''
۲- کلیات طبع علی بخش ص ۲۱۸ ، نولکشور قدیم ص ۱۹۷ ، جدید ص ۳۱۱ ۔

وہ نخلِ خشک ہوں میں ، اِس گلشنِ جہاں میں
پھرتا ہے باغباں بھی مجھ پر تبر سنبھالے
آڑتے ہیں ہوش تیرے دیکھے سے اے پری رُو !
ممکن نہیں حواسِ خمسہ بشر سنبھالے
حرفِ دُرشت سن کر ہیں کان دل دُکھاتے
اپنی زباں ذرا وہ رشکِ قمر سنبھالے
ہر گام پر خوشی سے وارفتگی سی ہو گی
لانا جواب خط کو اے نامہ بر ! سنبھالے
یا پھر کُتر پر اس کے صیّاد یا چھری پھیر
بے بال و پر نے تیرے پھر بال و پر سنبھالے
دردِ فراق آتش تڑپا رہا ہے ہم کو
اک ہاتھ دل سنبھالے ہے اک جگر سنبھالے

۱۲۸

[1] وہ کاوش خارِ خارِ غم کی ہم اے گلبدن ! بھولے
تری بشّاش صورت دیکھ کر رنج و محن بھولے
جسے دیکھا وہ دیوانہ ہے تیرا باغِ عالم میں
برنگِ بوے گل پھرتے ہیں مردم پیرہن بھولے
جو دے تکلیف تیرا مصحفِ رو اُس کو ایماں کی
کہے اللہ اکبر ، بت پرستی برہمن بھولے
لحد میں جا کے بزمِ دہر پھر ہم کو نہ یاد آئی
مزا پایا یہ خلوت میں کہ لطفِ انجمن بھولے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۱۴ ، نولکشور قدیم ص ۱۹۷ ، جدید ص ۳۱۲ -

فسوں پرداز ہے شیریں زبانی میرے دلبر کی
کلام اللہ حافظ سن کے اس بت کا سخن بھولے

مزا رکھتا نہیں ہے ضدّ بہم کا مجتمع ہونا
الٰہی تلخ گوئی سن کے وہ شیریں دہن بھولے

نہیں اسباب دنیا کون سا کشتیِ گردوں میں
وہ آٹھ کر پہنے خلعت کو جو بیٹھا ہو کفن بھولے

کسی دن تو ہو اے یوسف لقا ! تازہ دماغ اپنا
کبھی تو راہ ادھر بھی تیری بوے پیرہن بھولے

اٹھا پردہ دوئی کا شاہد توحید کے رخ سے
ہوے ہم دم بخود ایسے کہ ساری ما و من بھولے

گلِ رخسارۂ صیّاد سے جو عشقِ کامل ہو
قفس میں آشیانے کی ہوا مرغِ چمن بھولے

تماشا گوشہ گیری دشتِ غربت کا دکھاتی ہے
وطن میں ہوں مگر مجھ کو ہیں یارانِ وطن بھولے

یہی اللہ سے آتش دعا ہے ، مردِ مومن ہوں
حواسِ خمسہ زائل ہوں جو یادِ پنجتن بھولے

۱۲۹

[1]دل لگی اپنی ترے ذکر سے کس رات نہ تھی
صبح تک شام سے یاھُو کے سوا بات نہ تھی

اِلتجا تجھ سے کب اے قبلۂ حاجات نہ تھی
تیری درگاہ میں کس روز مناجات نہ تھی

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۱۳ ، نولکشور قدیم ص ۱۹۷ ، جدید ص ۳۱۳ -

اب ملاقات ہوئی ہے تو ملاقات رہے
نہ ملاقات تھی جب تک کہ ملاقات نہ تھی

غنچۂ گل کو نہ ہنسنا تھا تری صورت سے
چھوٹے سے منہ کی سزاوار بڑی بات نہ تھی

ابتدا سے تجھے موجود سمجھتا تھا میں
میری تیری کبھی پردے کی ملاقات نہ تھی

اے نسیمِ سحری ! بہرِ اسیرانِ قفس
تحفہ تر نکہتِ گل سے کوئی سوغات نہ تھی

جن دنوں عشق رلاتا تھا ہمیں صورتِ ابر
کون سی فصل تھی وہ جس میں کہ برسات نہ تھی

کیا کہوں اس کے جو مجھ پر کرمِ پنہاں تھے
ظاہری یار سے ہرچند ملاقات نہ تھی

جس نے باندھے ہوئے گاتی تجھے دیکھا ، پھڑکا[1]
دلربا شے تھی مری جان تری گات نہ تھی

خاک میں مل گئے اے شاہ سوار ! اہلِ نیاز
نازِ معشوق تھا ، توسن کی ترے لات نہ تھی

لب کے بوسے کا ہے انکار تعجب اے یار !
پھیرے سائل سے جو منہ کو وہ تری ذات نہ تھی

کمرِ یار تھی از بس کہ نہایت نازک
سوجھتی بندشِ مضموں کی کوئی گھات نہ تھی

جن دنوں ہوتا تھا تو گھر میں ہمارے شب باش
روزِ روشن سے کم اے مہر لقا ! رات نہ تھی

---

۱ - کلیات طبع علی بخش : ''بھڑکا ۔''

بے شعوروں نے نہ سمجھا تو نہ سمجھا **آتش**
نکتہ سنجوں کو لطیفہ تھی ، تری بات نہ تھی

۱۳۰

[1]ناز و ادا ہے تجھ سے دلارام کے لیے
یہ جامہ قطع ہے ترے اندام کے لیے
وحشت میں کعبے کو جو گیا کوے یار سے
لتّے جنوں نے جامۂ احرام کے لیے
عاشق ہوں ہر طرح سے گنہ گار ہوں ترا
حاجت قصور کی نہیں الزام کے لیے
کیا کیا جپے گی ، کیسا رٹے گی زباں اسے
تسبیح ہم نے لی ہے ترے نام کے لیے
طفلی کے گریے کا یہ کھلا حال وقتِ مرگ
آغاز ہی میں روتے تھے انجام کے لیے
اچھا نہیں مقابلہ اس چشمِ شوخ سے
اک دن شکستِ فاش ہے بادام کے لیے
وہ نونہال آئے الٰہی ! مراد پر
حاصل ہو پختگی ثمرِ خام کے لیے
ہرچند اپنا نامۂ عصیاں سیاہ ہو
ہو گا سفید ، صبح ہے ہر شام کے لیے
نامرد اور مرد میں اتنا ہی فرق ہے
وہ نان کے لیے مرے ، یہ نام کے لیے
مثلِ کمند اپنی رسائی ہوئی اگر
اے قصرِ یار ! بوسے لبِ بام کے لیے

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۱۵ ، نولکشور قدیم ص ۱۹۸ ، جدید ص ۳۱۳ -

کیا چشمِ مستِ یار سے تشبیہ دیجیے
کیفیتِ نگاہ نہیں جام کے لیے

رکھوا کے زلفیں یار نے لاکھوں ہی مرغِ دل
پیدا کیے ہیں ، کشمکشِ دام کے لیے

دل میں سوائے یار جگہ ہو نہ غیر کی
خلوت سرائے خاص نہیں عام کے لیے

جاتا ہے بھرِ غسل جو اے خوش دماغ تو
جلتا ہے عُود گرمیِ حمّام کے لیے

آتش جو چاہے پائے توکل کی محکمی
جو صبح کو ملے ، نہ رہے شام کے لیے

۱۳۱

قفلِ درِ قبول نہ کھولے ، بعید ہے
انساں کے پاس دستِ دعا کی کلید ہے

دل کو خیالِ یار نہ ہووے ، بعید ہے
جوہر ہے آئنے میں تو صورت کی دید ہے

نقصان جاں بھی راہِ خدا میں مفید ہے
مارا گیا جہاد میں جو ، وہ شہید ہے

انگشتری کا حلقہ ہے وہ ناف حلقہ دار
خالِ سیاہ اس میں نگینِ حدید ہے

فقر و فنا کی بو نہیں کس کے دماغ میں
عطّار اپنے شہر کا ہر اک فرید ہے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۱۵ ، نول کشور قدیم ص ۱۹۸ ، جدید ص ۳۱۴ -

پاسِ ادب سے چلتے ہیں عشّاق سر کے بل
کوچے میں اُس کے نقشِ قدم ناپدید ہے
آیا تو ہے وہ شوخ تماشائے باغ کو
مہندی ملے چمن میں تو لالہ شہید ہے
یہ ترک کردہ ہے شہِ مرداں سے پیر کی
دنیا کا خواستگار جو ہے زن مرید ہے
افطاری جامِ مے، سحری ساغرِ شراب
مجھ رند کو شبِ رمضاں روزِ عید ہے
کس کس ستارے نے شبِ ہجراں دکھائی آنکھ
پیرِ فلک کا لاکھوں ہی فتنہ مرید ہے
گل چاک چاک کر رہے ہیں اپنے پیرہن
شاید قبائے یار کی قطع و برید ہے
صانع ہے وہ، یہ صورتیں ہیں اُس کی صنعتیں
اللہ ہے قدیم، یہ عالم جدید ہے
ہم کو بھی قیدِ غم سے چھڑاؤ، گلے لگو
زندانی چھوٹتے ہیں تصدّق میں عید ہے
لگ چل نہ گل رخوں سے نسیمِ چمن کی طرح
بوئے حسین[۲] ان میں تو خوئے یزید ہے
اے بت اسیرِ عشق نہ کر زاہدوں کو تو
قیدِ نماز ہی انھیں[۱] قیدِ شدید ہے
تحسیں سمجھ اُسے جو یہ نفریں کرے تجھے
انصاف ان قریبوں سے آتش بعید ہے

---

۱ - کلیات طبع نول کشور و لاہور: ''قید نما ہے، نہیں قید شدید ہے''
متن مطابق طبع علی بخش -

۱۳۲

[1]ہر چشم کو دیدار ترا مدِّ نظر ہے
جو گوش ہے مقصود اُسے تیری خبر ہے

اُس خال ، اُس ابرو کی ، ہمیں خوب خبر ہے
یہ گوے سعادت ہے ، وہ چوگانِ ظفر ہے

مُو ہی رگِ گل ہے کہ وہ باریک کمر ہے
میں ہیچمداں ہوں ، مجھے کیا اس کی خبر ہے

بےکار بنائے نہیں آنکھوں کے پیالے
دیدار کا سائل ہو جو یارائے نظر ہے

قالب کی طرح روح دکھائی نہیں دیتی
پنہاں یہ مسافر ہے ، عیاں گردِ سفر ہے

گردش ہے اشارے سے ترے ہفت فلک کو
چشمک زنی انجم کی تجھے مدِّ نظر ہے

سونگھے جو اُسے سانپ کے سونگھے کا ہو عالم
اُس زلف کی بو میں سمِ افعی کا اثر ہے

دیدِ کمرِ یار کی مشتاق ہیں آنکھیں
ہستی میں تماشاے عدم مدِّ نظر ہے

یہ صدمے اُٹھائے ہیں جدائی میں کسی کی
دو قطرۂ خوں ہیں ، نہ تو دل ہے نہ جگر ہے

شبنم کو رلا کر وہ ہنساتا ہے گلوں کو
خورشید سے بھی گرم مرا رشکِ قمر ہے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۱٦ ، نول کشور قدیم ص ۱۹۹ ، جدید ص ۳۱۵ -

آفت ہے کوئی ذکر فقیرانہ ہمارا
اک نعرۂ ہُو میں دو جہاں زیر و زبر ہے
کھول آنکھ کو ، اٹھ خواب سے ، بیدار ہو غافل
حاضر لیے آئینۂ خورشید سحر ہے
کس گل کے ہواخواہوں میں ہے آتش ِ مسکیں
کس نور کے بکنے کے لیے خاک بسر ہے

۱۳۳

آسماں ! مر کے تو راحت ہو کہیں تھوڑی سی[1]
پاؤں پھیلانے کو ہاتھ آئے زمیں تھوڑی سی
خود بخود کچھ دل ِ شیدا کو ہے اندوہ و ملال
کس جبیں کے لیے درکار ہے چیں تھوڑی سی
مجھ کو حیرت ہے حسینوں سے بچی ہے کیونکر
بادشاہوں کے لیے چین ِ جبیں تھوڑی سی
نعمت ِ فقر ہے موجود ، جسے رغبت ہو
آب ِ شیریں میں ہے نان ِ نمکیں تھوڑی سی
کون سا گل نہیں گلزار ِ جہاں میں مغرور
کس کے چہرے میں ہے یاں چین ِ جبیں تھوڑی سی
میہمانوں میں ہیں اس خوان ِ فلک کے ہم بھی
اپنی قسمت کی بھی ہے نان ِ جویں تھوڑی سی
ہرگز آن دانتوں سے کرنا نہ صفا کا دعویٰ
آبرو تیری ہے اے در ِ ثمیں تھوڑی سی

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۱۶ ، نول کشور قدیم ص ۱۹۹ ، جدید ص ۳۱۵ ، بہارستان ِ سخن ص ۲۴۶ -

عفو ہو جائیں گے ، ہرچند کہ لاکھوں ہوں گناہ
یہ عطا ہے تری رحمت کے قریں تھوڑی سی
چار دن اپنے محبّوں سے محبّت کرتے
لذّتِ عشق بھی چکھتے یہ حسیں تھوڑی سی
اے جُنوں ! تنگ نہ ہو ، وسعتِ کونین کو دیکھ
یہیں تھوڑی سی جگہ ہے ، نہ وہیں تھوڑی سی
چند پریاں بھی کروں مثلِ سلیماں[۴] تسخیر
یہ قلمرو بھی رہے زیر نگیں تھوڑی سی
میہماں ہوں میں ، جگہ دیں مجھے ، تکلیف کریں
آس کے اصحابِ یسار اور یمیں تھوڑی سی
گوش زد ہو وہ کہ جو وہم و گماں میں بھی نہ ہو
سنیں اپنی بھی جو اربابِ یقیں تھوڑی سی
توبہ کرنی ہے گناہوں سے تو کر لے غافل
ورنہ فرصت ہے دمِ بازپسیں تھوڑی سی
مدّت العمر ہے اِک چشمِ زدن کا وقفہ
کر لیں ہُو حق یہ خرابات نشیں تھوڑی سی
فکرِ رنگیں سے لگا اس میں بھی اِک باغ آتش
رُبعِ مسکوں سے الگ ہے یہ زمیں تھوڑی سی

۱۳۴

[۱]موت کو سمجھے رہیں گبر و مسلماں آئی
روح قالب میں ہے دو روز کو مہماں آئی

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ۲۱۷ ، نول کشور پریس قدیم ۲۰۰ ، جدید ص ۳۱۶ -

بوے یوسفؑ سے ہؤا تازہ دماغِ یعقوبؑ
للہ الحمد ، صبا مصر سے کنعاں آئی
ہم سے دیوانے بھی ہوویں گے پری کے سائل
اِس طرف سے جو سواریِ سلیماں آئی
آئنے نے رخِ انور پہ اجارا باندھا
شانے کے حصے میں وہ زلفِ پریشاں آئی
یہ صفا تن میں کہاں ، کتمِ عدم سے باہر
جسم کی طرح تری روح ہے عریاں آئی
ڈھونڈیں اپنے لیے معشوق کوئی گرما گرم
فکر پہلو کی کریں ، فصلِ زمستاں آئی
گلشنِ دہر بھی ہے کوئی سرائے ماتم
شبنم اِس باغ میں جب آئی تو گریاں آئی
جو گنہ وصل میں سرزد ہوئے تھے ، عفو ہوئے
فارغ البال ہوا میں ، تبِ ہجراں آئی
خط کا آغاز ہوا اُس رخِ نورانی پر
چل بسی صبحِ وطن ، شامِ غریباں آئی
سرِ شوریدہ کو اُس زلف کا سودا نہیں خوب
اس بلا میں جو پھنسا ، شامتِ انساں آئی
عشقِ بلبل میں اثر ہے تو قفس میں آتش
بوے گل پھاند کے دیوارِ گلستاں آئی

[1] بادباں کا کام کرتی ہے گھٹا برسات کی
کشتیِ مے سے موافق ہے ہوا برسات کی
جھومتی آتی ہے مستانہ گھٹا برسات کی
ساتھ کیفیت کے چلتی ہے ہوا برسات کی
سبزۂ مینا کا عالم دیدنی ہے آج کل
میکدے کو دوڑی جاتی ہے گھٹا برسات کی
دیدۂ تر سے ہمارے ہوگیا ہے سامنا
آبرو ہم چشم سے رکھ لے خدا برسات کی
پنجۂ مرجاں بنیں گے تیرے ہاتھ اے بحر حسن!
ے کیسے شوخی نہیں رہتی حنا برسات کی
روتے روتے عاشقِ شیدا ہزاروں مر گئے
مانگی اس دہقاں پسر نے جو دعا برسات کی
اڑ کے ٹپکا دے گی مجھ مخمور کے منہ میں شراب
پر لگا دے گی بطِ مے کو ہوا برسات کی
غسل کر کے تجھ کو بھی لازم ہے تبدیلِ لباس
چاندنی نکھری ہے خوب اے مہ لقا برسات کی
ابر میں بے نشے کے اک دم رہا جاتا نہیں
دخترِ رز ہے ہماری آشنا برسات کی
حسرتِ ساقی میں روتا ہوں جو میں دل کھول کر
گرمیوں میں چلنے لگتی ہے ہوا برسات کی

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۱۷ ، نول کشور قدیم ص ۲۰۰ ، جدید ص ۳۱۶ ، بہارستان سخن ص ۲۳۸ -

غم بہت کھلوا نہ مجھ گریاں کو تو اے ہجرِ یار
خوف بدہضمی کا رکھتی ہے غذا برسات کی

مے نہ دینا مجھ کو بے دردی ہے اب تو ساقیا!
ابتدا جاڑے کی ہے، اور انتہا برسات کی

ساتھ دے گی کیا مرا، رونے میں ساون کی جھڑی
سوزشِ دل سے نہیں گرمی سوا برسات کی

پی کے مے دستار لالہ کی اچھالا چاہیے
دیکھتا تھا راہ وہ گلگوں قبا برسات کی

کیفِ مے کا ابرِ باراں میں ہوا دل کو جو ذوق
ہم نے بے ساقی کے رو رو کر جدا برسات کی

روتے روتے مر گیا اک برق وش کی یاد میں
قسمتِ آتش میں لکھتی تھی قضا برسات کی

۱۳۶

[1]غم نہیں ثابت قدم کو، گو جہاں گردش میں ہے
قطب کو جنبش نہیں ہے، آسماں گردش میں ہے

حیف ہے بے نشہ اس سے خانے میں انسان رہے
روز و شب جامِ مہ و خورشید یاں گردش میں ہے

تیغِ ابرو جس قدر چاہے بُرش پیدا کرے
چشمِ فتاں یار کی مثلِ فساں گردش میں ہے

پار اترے کیا سلامت بحرِ الفت سے کوئی
سیکڑوں گرداب اس کے درمیاں گردش میں ہے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۱۸، نول کشور قدیم ص ۲۰۰، جدید ص ۳۱۷، بہارستانِ سخن ۲۲۴ -

گرد پھرنے کا ترے سودا ہوا ہے ہم کو یار
ہر گھڑی ، ہر وقت ، ہر دم، ہر زماں گردش میں ہے

دائرے میں عشق کے جس نے کہ مارا ہے قدم
صفحۂ ہستی میں وہ پرکار ساں گردش میں ہے

خال و چشمِ یار کی تعریف ہو سکتی نہیں
تمکنت میں یہ زمیں وہ آسماں گردش میں ہے

جستجو میں تیری انجم کی طرح اے ماہِ حُسن
ذرہ ذرہ ہو کے خاکِ عاشقاں گردش میں ہے

گنبدِ گردوں سے نکلو جس طرح سے ہو سکے
ڈر ہے گر پڑنے کا آتش یہ مکاں گردش میں ہے

۱۳۷

[1]ما سوا تیرے نہیں رہنے کا کچھ ''یا باقی''
جو ہے فانی ہے ، تری ذات ہے الا باقی

نوجوانی کی ہے پیری میں تمنّا باقی
موسمِ گل کے گئے پر بھی ہے سودا باقی

دل کو اک سرو سے قد کی ہے تمنّا باقی
روح کو ہے ہوسِ عالمِ بالا باقی

دیکھ لیں ہے جو قیامت کا تماشا باقی
ہو چکے وہ بھی جو ہے صحبتِ فردا باقی

تنگ غنچے سے دہن گو کہ ہے اس گل رُو کا
پھر بھی ہے بوسۂ عاشق کے لیے جا باقی

رقص کرتے ہیں جو بسمل تو یہ کہتا ہے وہ تُرک
مجلس آخر ہوئی ، لیکن ہے تماشا باقی

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۱۸ ، نولکشور قدیم ص ۲۰۱ ، جدید ص ۳۱۸ -

جان پر بن گئی دم گننے لگا میں شب ہجر
گنتے گنتے نہ رہا جب کوئی تارا باقی
ساقیا ! گردشِ ساغر میں تامّل کیا ہے
خُم و خُم خانہ ہے باقی ، مے و مینا باقی
میری تعظیم نے مجلس سے نکالا مجھ کو
اٹھتے اٹھتے نہ رہی بیٹھنے کی جا باقی
عشق کی شرط ادا کرتے ہیں انشاء اللہ
کوئی دن ہے یہ محبّت کا تقاضا باقی
آخرِ کار ہے میلے سے جہاں کے چلنا
سیر کرتا نہ رہے کوئی تماشا باقی
کون وارفتہ ترے گیسوے پیچاں کا نہیں
کس کو سودا نہیں ، یہ سلسلہ ہے تا باقی
فرقتِ یار میں مردہ سا پڑا رہتا ہوں
رُوح قالب میں نہیں ، جسم ہے تنہا باقی
ٹھوکریں مار کے مُردوں کو ہے زندہ کرتا
میرے یوسف سے ہے اعجازِ مسیحا باقی
یار سے کہیو یہ پیغام زبانی قاصد !
کچھ نہیں یاد ، تری یاد ہے اِلاّ باقی
دہنِ یار کا مضموں بھی کوئی باندھوں میں
مرد شاعر ہوں نہ رہ جائے معمّا باقی
گرمیاں ہیں جو یہی آہِ شرر افشاں کی
نہیں رہنے کا مرے یار کا پردا باقی
فرقتِ یار مُبدّل نہیں وصلت سے ہوئی
تیرنا ہے درِ مقصود کا دریا باقی

قامتِ یار سے کس دن ہو قیامت دیکھیں
آج تک تو ہے وہی وعدۂ فردا باقی

صبح تک وصل کی شب شام سے عریاں رکھا
نہ رہا پیرہنِ یار کا پردا باقی

مشکلِ نزع بھی آسان ہوئی جاتی ہے
نفسِ چند کی ہے روح کو ایذا باقی

اس قدر سینہ غمِ عشق سے معمور ہوا
نہ رہی دل میں مرے حسرتِ دنیا باقی

دہنِ یار کی شہرت سے دہن ثابت ہے
نام باقی نہیں گویا کہ ہے عنقا باقی

ٹکڑے ایسا مجھے قاتل نے کیا ہے کہ نہیں
گور میں جا کے جدا ہونے کو اعضا باقی

دل میں لالہ ہی کے داغِ رُخِ بے داغ نہیں
سرِ سنبل میں بھی ہے زلف کا سودا باقی

محفل آباد ہے، منہ پر سے نقاب الٹو تو
دیکھ لے گا کوئی ہووے گا جو بینا باقی

چھیڑ بیٹھے جو ہم افسانۂ گیسوے دراز
صبح ہوگی، نہ رہے گی شبِ یلدا باقی

یہی آتش کی دعا ہے یہی آتش کی دعا
مغفرت ہووے مری بعدِ فنا "یا باقی"

۱۳۸

[1] کچھ نظر آیا نہ پھر جب تو نظر آیا مجھے
جس طرف دیکھا مقامِ ہُو نظر آیا مجھے

حسن سے قدرت خدا کی رو نظر آیا مجھے
ریش پیغمبر[2] ترا گیسو نظر آیا مجھے

روئے گل بے چشم و بے ابرو نظر آیا مجھے
سرو باغی قد بے بازو نظر آیا مجھے

رازِ دل افشا نہ ہو اے دل کبھی رکھتا ہوں میں
پھوڑ ڈالی آنکھ اگر آنسو نظر آیا مجھے

تیری تلوار اس کو سمجھا میں اسے مشتاق زخم
جب کوئی تشنہ کنارِ جو نظر آیا مجھے

دیدۂ یعقوب[3] سے دیکھا جو عالم کی طرف
یوسف اس بازار میں ہر سو نظر آیا مجھے

دل شبِ فرقت رہا سینے میں مردے کی طرح
گور کا پہلو مرا پہلو نظر آیا مجھے

کہکشاں نے ساقِ پائے یار کا دھوکا دیا
ماہِ تاباں کاسۂ زانو نظر آیا مجھے

سامنا رخ کا ترے گل نے کیا تھا ایک روز
رنگ اڑا ایسا گلِ شبّو نظر آیا مجھے

خالِ مشکیں کا ترے جس رات افسانہ سنا
سو گیا تو خواب میں ہندو نظر آیا مجھے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۱۹ ، نول کشور قدیم ص ۲۰۱ ، جدید ص ۳۱۹ ، بہارستانِ سخن ۲۳۳ -

اے فراق اب عہدِ وصلِ دائمی ہے یار سے
بے طرح سمجھا اگر پھر تو نظر آیا مجھے

جب ترے روے عتاب آلودہ سے تشبیہ دی
لالہ آتش رنگ و آتش خو نظر آیا مجھے

تو وہ گل ہے باغِ عالم میں کہ جس کے واسطے
گل بھی آوارہ بہ رنگِ بو نظر آیا مجھے

حاجیوں کی طرح سے میں نے کیا اُس کا طواف
کعبہ سنتا تھا جسے وہ کُو نظر آیا مجھے

تو نے دکھلائی صنم برقع کی جالی سے جو آنکھ
دام میں صیّاد کے آہو نظر آیا مجھے

وصل کی شب کردیا بےکار رعبِ حسن نے
دست و پا ہر ایک بےقابو نظر آیا مجھے

مُہرہ کی وصلی سے تھا وہ صفحۂ رُو بسکہ صاف
قطعۂ اُستاد چار ابرو نظر آیا مجھے

چشمِ بے سرمہ جو دکھلائی کسی محبوب نے
ساری ناواقفِ جادو نظر آیا مجھے

تو نے زلفوں کو اُلجھ پڑنے سے منڈوایا جو یار
شاہ بازِ حسن بے بازو نظر آیا مجھے

تیرے دنداں میں دکھائی دی جو مسّی کی لکیر
اے پری دُرّ نجف میں مُو نظر آیا مجھے

مشک و عنبر کی بھی بُو چین و شکن کے ساتھ ہے
طرّہ سنبل پر بھی وہ گیسو نظر آیا مجھے

بے تصنّع اُس کو سمجھا میں نے تیغِ بے نیام
جب ترا بے آستیں بازو نظر آیا مجھے

یاد کر اس گل کو آتش ! مثلِ شبنم رو دیا
پیرہن کوئی اگر خوش بُو نظر آیا مجھے

۱۳۹

[1] کیا کہیے کہ ہے سوزشِ داغِ جگر ایسی
منتا نہیں وہ غیرتِ شمس و قمر ایسی
کوشش کا ارادہ ہے رہِ مہر و وفا میں
پھر کھل نہ سکے باندھیے کس کر کمر ایسی
پیری میں جلاتا ہے جو دل داغِ جوانی
پنبہ سے بھی گرمی نہیں کرتا شرر ایسی
نازک[2] ہے رگِ گل سے ، فزوں بال سے باریک
دیکھی نہیں ، البتہ سنی ہے کمر ایسی
مشکل ہوئی ہے روح کو قالب سے جدائی
چھٹتی ہی نہیں لپٹی ہے گردِ سفر ایسی
کیونکر نہ مرا شعر ہو عالم کے زباں زد
مشہور بہت ہوتی ہے جھوٹی خبر ایسی
بیدار ہوں منہ دیکھ کے اس مہر لقا کا
وہ شام کہاں ہے ، جو دکھائے سحر ایسی
ہووے نہ صفا میں ترے دانتوں کے مقابل
پیدا تو کرے قدر و شرافت گُہر ایسی

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۲۰ ، نول کشور قدیم ص ۲۰۲ ، جدید ص ۳۲۰ -

۲ - نولکشوری نسخوں میں ہے : ''نازک ہے رگ گل سے ، فزوں بال سے باریک -'' علی بخش : ''باریک رگِ گل سے فزوں بال سے باریک -''

کیا سینہ اس ابرو سے بچا سکتا ہے دل کو
شمشیرِ قضا روکے نہیں ہے سپر ایسی

زلفوں کی طرح تا کمرِ یار پہنچتی
اے کاش رسا ہوتی یہ عقلِ بشر ایسی

محبوب نہیں باغِ جہاں میں کوئی تجھ سا
بو رکھتا ہے گل ایسی، نہ لذت ثمر ایسی

تیرے لبِ لعلیں کا نہیں سہل پرکھنا
وہ جوہری ہے جس کو خدا دے نظر ایسی

دنیا کی نہ ہے فکر، نہ عقبیٰ کا تردد
آتش کہو آئی ہے طبیعت کدھر ایسی

۱۴۰

[1]جاں بخش لب کا یار کے رتبہ بلند ہے
فی الواقعی مقامِ مسیحا بلند ہے

مدہوش کیفِ مے سے وہ بالا بلند ہے
اقبالِ ساغر و خُم و مینا بلند ہے

بالائے بامِ خانہ وہ بالا بلند ہے
گردن وہ ہے جو بہرِ تماشا بلند ہے

پروانے جلتے ہیں تری برقِ جمال سے
شمعوں کے سر سے آتشِ سودا بلند ہے

بے داغ ہونے سے رخِ رنگینِ یار کے
داغِ جگر سے لالہ کے شعلہ بلند ہے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ۲۲۰ ص، نول کشور قدیم ص ۲۰۳، جدید ص ۳۲۱ -

دو ساغرِ شراب ہیں دو چشمِ مستِ یار
گردن مثالِ گردنِ مینا بلند ہے
خالِ سیہ بناتا ہے رخسار پر وہ ماہ
کیا ان دنوں زُحل کا ستارا بلند ہے
طوفانِ نوح ہے مرے اشکوں کے جوش سے
مرغِ ہوا سے ماہیِ دریا بلند ہے
افضل نہ ہوگا بڑھ کے ترے قد سے سروِ باغ
کعبے سے کیا شرف جو کلیسا بلند ہے
باغِ جہاں میں فتنۂ محشر سے کم نہیں
بالشت بھر زمیں سے جو بوٹا بلند ہے
دل کا مرے بخار نکالا ہے آہ نے
شعلہ ثریٰ سے تا بہ ثریّا بلند ہے
سبزے سے روے یار کے ہے ابروؤں کو فوق
فرماں کے خط سے منزلِ طغرا بلند ہے
بحرِ جہاں میں حالتِ مجنوں بنائیے
ہر اک حبابِ محملِ لیلیٰ بلند ہے
پوشاکِ سرخ پہنے ہیں وہ بام پر کھڑے
اپنی نظر میں طُور سے شعلہ بلند ہے
آتش یہ جان لے جو سرِ مُو سفید ہو
شب ہے اخیر، صبح کا تارا بلند ہے

۱۴۱

امجھ سے مستی میں جو ہوں شیشہ و ساغر ٹکڑے
ساقیا! کیجیو میرے بھی برابر ٹکڑے

۱- کلیات طبع علی بخش ص ۲۲۰، نول کشور قدیم ۲۰۳، جدید ص ۳۲۱ -

موسمِ گل ہے ، جنوں خیز بہارِ گل ہے
آڑتے پھرتے ہیں گریباں کے ہوا پر ٹکڑے

مستحق اِس کا ہُما بھی ہے ، سگِ یار بھی ہے
استخوانوں کے مرے دو ہوں برابر ٹکڑے

مجھ گدا کو جو ہے گدڑی میں تکلف منظور
ہوتے ہیں اطلس و کمخواب و مشجّر ٹکڑے

دلِ صد پارہ کو ڈھونڈھا ہے جو اُس کوچے میں
ہاتھ آئے ہیں مجھے شیشے کے اکثر ٹکڑے

نعمتِ فقر سے محظوظ ہوا ہوں ایسا
خشک کر کے اُنھیں کھاؤں جو ملیں تر ٹکڑے

تیری تلوار کی بُرّش کا ہے شُہرہ قاتل
ہم بھی دیکھیں تو ہمیں کرتے ہو کیونکر ٹکڑے

آشنا صورتِ ہفتاد و دو ملّت سے ہوں میں
آئنہ دل کا ہے پہلو میں بہتّر ٹکڑے

سنگِ در پر کسی محبوب کے دے پٹکوں گا
بد دماغی جو یہی ہے تو ہؤا سر ٹکڑے

نعمتِ فقر میں بھی خُو نہیں تنہا خوری
بانٹ کھاتا ہوں جو ہوتے ہیں میسّر ٹکڑے

نامۂ شوق کا عاشق کے ہے واں سے یہ جواب
پرزے خط ہوتا ہے ، بازوے کبوتر ٹکڑے

سرِ فرہاد کے تیشے سے یہ آتی ہے صدا
کھائے یہ چوٹ جو پتّھر تو ہو پتّھر ٹکڑے

جڑ دیے ہیں دہنِ یار میں دانتوں کی جگہ
دستِ قدرت نے یہ الماس کے کیونکر ٹکڑے

زخمِ کاری کا جو سائل ہوں کسی تُرک سے میں
یہ گدائی کا اثر ہو کہ ہو خنجر ٹکڑے
ستم و قہر و غضب ہے روشِ مستانہ
شیشۂ دل کو کرے گی تری ٹھوکر ٹکڑے
چند بوسوں سے بسر ہوتی ہے مجھ سائل کی
درگہِ حسن سے ہیں میرے مقرّر ٹکڑے
نظر آئی مرے بدخو کو جو صورت ٹیڑھی[1]
ساتھ آئینے کے ہووے گا سکندر ٹکڑے
ارہ کی چال جو گلشن میں چلا وہ خوش قد
دلِ عاشق کی طرح ہوں گے صنوبر ٹکڑے
درِ سلطاں کا گدا ہوں میں گدا اے آتش
نانِ نعمت کے کھلاتا ہے مقدّر ٹکڑے

۱۴۲

[2]خوش خطوں پر جو طبیعت مری آئی ہوتی
مجھ سے وصلی کی طرح پھر نہ جدائی ہوتی
آنکھ آئینے سے تم نے جو لڑائی ہوتی
رات بھر میری طرح نیند نہ آئی ہوتی
تارِ سنبل کوئی کہتا ہے، رگِ گل کوئی
کمرِ یار جو ہوتی تو دکھائی ہوتی

---

۱ - کلیات علی بخش : "جو صورت تیری ۔"
۲ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۲۱ ، نول کشور قدیم ص ۲۰۴ ، جدید ص ۳۲۲ ، بہارستانِ سخن ص ۲۰۰ ۔

عہد کرتے تو تری طرح نہ پھرتے اے یار !
اپنے دل سے نہ نکلتی جو سمائی ہوتی
خواب میں وہ قدِ دل کش جو نظر آ جاتا
جاگتا پھر نہ ، قیامت بھی جو آئی ہوتی
کمرِ یار بھی آنکھوں کو دکھائی دے گی
ناف تک تو ہے نگاہوں کی رسائی ہوتی
صاحبِ ظرف جو ہوتا نہ ہمارے دل سا
دو جہاں میں نہ محبّت کی سمائی ہوتی
چشمِ بُلبل سے جو احباب نظارہ کرتے
بوے گل پیرہنِ یار سے آئی ہوتی
میرے گریے کا فسانہ وہ پری رُو سنتا
گوشِ گل تک دُرِ شبنم کی رسائی ہوتی
ہم نے چُوما دہنِ یار کو گستاخی سے
مانگتا بوسہ وہ جس سے کہ گدائی ہوتی
کلّیاں آبِ گہر کی بھی جو خوش رو کرتے
تیرے دانتوں کی نہ دانتوں میں صفائی ہوتی
سہل چھٹنا نہیں اس راحتِ جاں کا آتش
روح و قالب میں ہے مشکل سے جدائی ہوتی

۱۴۳

[1]تیغ میں جوہر کہاں وہ ابروے خم دار کے
زخم دکھلائی نہیں دیتے ہیں اس تلوار کے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۲۱ ، نول کشور قدیم ص ۲۰۴ ، جدید ص ۳۲۳ ، بہارستانِ سخن ص ۱۸۲ -

ڈال دیتا ہوں جو میں اس کو گلے میں یار کے
بوئے یوسف آنے لگتی ہے گلوں سے ہار کے
رہ گئے مشتاق طالب جلوۂ دیدار کے
مار ڈالا اس پری پیکر نے جھرسٹ مار کے
حلقہ ٔ چشمِ پری روزن ہیں قصرِ یار کے
جن چڑھے اس پر جو ٹھہرے سایے میں دیوار کے
گوش افسانے سنے تو تجھ سے خوش رو یار کے
آنکھ دے اللہ تو قابل ترے دیدار کے
دن بسر ہوتا ہے یوں سودے میں کوئے یار کے
دھوپ سے اٹھّے تو بیٹھے سایے میں دیوار کے
فرشِ گل کو بھی قدم سے کیجے اپنے سرفراز
گل بھی سبزے کی طرح پامال ہوں رفتار کے
لالہ ہی داغی غلام اس گل سے چہرے کا نہیں
سرو بھی ہیں بندۂ آزاد قدِّ یار کے
چھوڑ کر ہم نے امیری ، کی فقیری اختیار
بورے پر بیٹھے ہیں قالیں کو ٹھوکر مار کے
چشمِ وحدت بیں سے لازم ہے تماشائے چمن
خار و گل دونوں بغل پروردہ ہیں گلزار کے
کس طرف بھجوائیے ہم کو دیکھیے سلطانِ عشق
کوہ و صحرا دو علاقے ہیں یہ اس سرکار کے
مرہمِ زنگار ہے زخمی کو خطِّ سبزِ یار
خالِ لب حبِّ شفا ہے واسطے بیمار کے
دیکھ کر آئینہ کہتا ہے وہ آرائش پسند
طرّے کے قابل ہے سر ، گردن ہے لائق ہار کے

بُلبلوں کا نکہت گل سے معطّر ہے دماغ
غنچے کیا چٹکے ہیں ، شیشے ٹوٹے ہیں عطّار کے

ہم کو در پردہ محبّت ، غائبانہ عشق ہے
لن ترانی آں سے ہو سائل ہوں جو دیدار کے

خواہ مروارید و گل کے ، خواہ سیم و زر کے ہوں
طرّے جتنے ہیں وہ جویا ہیں تری دستار کے

کام ہے اللہ سے ، عالم سے کچھ مطلب نہیں
مشتری یوسف کے ہیں ، خواہاں نہیں بازار کے

حسن کا نظارہ وہ نعمت نہیں جو دل بھرے
سیر ہونے کے نہیں بھوکے ترے دیدار کے

روے رنگیں کا ترے سودا ہوا ہے باغ کو
لالہ و گل کی رگیں ہیں اور نشتر خار کے

واقعہ منصور کا سن کر کھلا ہم کو یہ راز
حق کہے سے آدمی ہوتا ہے قابل دار کے

کچھ جو غیرت ہے تو اے سفّاک اِک وار اور بھی
زخم اوچھے ہنستے ہیں منہ پر تری تلوار کے

جو کوئی بیٹھا نہ اُٹھّا پھر وہ پشتے کی طرح
ڈھیر ہو کر رہ گیا نیچے تری دیوار کے

باغ میں پی ہے شراب اُس کج کلہ نے بارہا
چیتھڑے اکثر کیے ہیں لالہ کی دستار کے

کعبۂ مقصود کا کس دن نہیں کرتا طواف
گِرد پھرتا ہوں میں آتش روز کوے یار کے

۱۴۴

انافہمی[1] اپنی پردہ ہے دیدار کے لیے
ورنہ کوئی نقاب نہیں یار کے لیے

نورِ تجلّیٰ ہے ترے رُخسار کے لیے
آنکھیں مری کلیم ہیں دیدار کے لیے

فدیے بہت اس ابروے خم دار کے لیے
چو رنگ کی کمی نہیں تلوار کے لیے

قول اپنا ہے یہ سبحہ و زنّار کے لیے
دو پھندے ہیں یہ کافر و دیندار کے لیے

لطفِ چمن ہے بلبل گلزار کے لیے
کیفیّتِ شراب ہے مے خوار کے لیے

سیری نہ ہوگی تشنۂ دیدار کے لیے
پانی نہیں چہِ ذقنِ یار کے لیے

آتی ہی ہے نمود مرے یار کے لیے
شہرہ ہے جس قدر مرے اشعار کے لیے

دشتِ عدم سے آتے ہیں باغِ جہاں میں ہم
بے داغ لالہ و گل بے خار کے لیے

شمشاد اپنے طرّے کو بیچے تو لیجیے
اس لالہ رو کی لٹپٹی دستار کے لیے

دو آنکھیں چہرے پر نہیں تیرے فقیر کے
دو ٹھیکرے ہیں بھیک کے دیدار کے لیے

سرمہ لگایا کیجیے آنکھوں میں مہرباں
اکسیر یہ سفوف ہے بیمار کے لیے

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۲۲ ، نولکشور قدیم ص ۲۰۵ ، جدید ص ۳۲۴ -

حلقے میں زلفِ یار کے موتی پروئیے
دنداں ضرور ہیں دہنِ مار کے لیے

گفت و شنید میں ہوں بسر دن بہار کے
گل کے لیے ہے گوش ، زباں خار کے لیے

بے یار سر پٹکنے سے ہلتا ہے گھر مرا
رہتا ہے زلزلہ در و دیوار کے لیے

بیٹھا جو اس کے سائے میں ، دیوانہ ہو گیا
سایہ پری کا ہے تری دیوار کے لیے

بلبل ہی کو بہار کے جانے کا غم نہیں
ہر برگ ہاتھ مَلتا ہے گلزار کے لیے

اے شاہِ حسن زلف و رخ و گوش و چشم و لب
کیا کیا علاقے ہیں تری سرکار کے

چال ابر کی چلا جو گلستاں میں جھوم کر
طاؤس نے قدم ترے رہوار کے لیے

آیا جو دیکھنے ترے حسن و جمال کو
پکڑا گیا وہ عشق کی بیگار کے لیے

حاجت نہیں بناؤ کی اے نازنیں ! تجھے
زیور ہے سادگی ترے رخسار کے لیے

بیمار تندرست ہو ، دیکھے جو روئے یار
کیا چاشنی ہے شربتِ دیدار کے لیے

اس بادشاہ حسن کی منزل میں چاہیے
بالِ ہُما کی پرچھتی دیوار کے لیے

سودائے زلفِ یار میں کافر ہوا ہوں میں
سنبل کے تار چاہییں زنار کے لیے

زنجیر و طوق جو کہ ہے بازارِ دہر میں
سودا ہے اُس پری کے خریدار کے لیے

چونا بنیں گے بعدِ فنا اپنے استخواں
دولت سرائے یار کی دیوار کے لیے

معشوق کی زباں سے ہے دشنام دل پذیر
شیرینی زہر ہے تری گفتار کے لیے

جاں سے عزیز تر ہے مرے دل کو داغِ عشق
مہتاب ہے لحد کی شبِ تار کے لیے

وہ مستِ خواب چشم ہے کوئی بلائے بد
کیا مرتبہ ہے فتنۂ بیدار کے لیے

خلوت سے انجمن کا کہاں یار کو دماغ
وہ جنسِ بے بہا نہیں بازار کے لیے

پہنا ہے جب سے تو نے شبِ ماہ میں اُسے
کیا کیا شگوفے پھولتے ہیں ہار کے لیے

چھکڑا ہوئے ہیں سوچ کے راہِ وفا میں پاؤں
پہیے لگائیے انہیں رفتار کے لیے

جو مُشتری ہے بندہ ہے اُس خوش جمال کا
یوسف بنے غلام خریدار کے لیے

سونے کے پتّے ہوویں ہر اِک گل کے کان میں
مقدور ہو جو بُلبلِ گلزار کے لیے

گل ہائے زخم سے ہوں شہادت طلب نہال
توفیقِ خیر ہو تری تلوار کے لیے

اندھیر ہے جو دم کی نہ اُس کے ہو روشنی
یوسف مرا چراغ ہے بازار کے لیے

احساں جو ابتدا سے ہے آتشؔ وہی ہے آج
کچھ انتہا نہیں کرمِ یار کے لیے

۱۴۵

[1]ٹھہرے نہ پھر، جو راہ میں تیری نکل چلے
شل ہوگئے جو پاؤں تو ہم سر کے بل چلے

جوبن سے اپنے زیب دہِ باغ ڈھل چلے
رنگ ان گلوں کے چار ہی دن میں بدل چلے

لے جائیں گے ہما کے خطِ شوق یار تک
قاصد سے کم نہیں ہیں جو آنسو نکل چلے

خط یادگار چھوڑ چلے گیسوانِ یار
یہ سانپ چلتے چلتے بلا زہر اگل چلے

ارّہ کی پھبتی کہہ کے انھیں کاٹیے ذرا
شمشاد سروِ قد سے تمھارے نکل چلے

ساقی معاف رکھ مجھے ساغر کشی سے تو
مے کیا پیے وہ، دودھ جو پی کر اگل چلے

درگاہِ یار سے یہ کرامت نہیں بعید
کھل جائیں پاؤں راہ میں اس کی جو شل چلے

سر ہاتھ پر لیے ہوئے ہیں کُشتنی کھڑے
وہ تیغِ ناز آج چلے، خواہ کل چلے

جو کچھ عذاب زیرِ زمیں ہو عجب نہیں
ساتھ اپنے گور میں بھی ہمارے عمل چلے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۲۳، نول کشور قدیم ص ۲۰۶، جدید ص ۳۲۵ -

کی ولولوں نے شوق کی تکلیف کوے یار
لے کر مجھے بہشت میں حسنِ عمل چلے

اِتنی شکار گاہِ جہاں میں ہے آرزو
ہم سامنے ہوں اور تمھاری رَفل چلے

اٹھتے ہی تیرے ہونے لگے منتشر حواس
دو کوہ تھے جو صبر و تحمّل وہ ٹل چلے

ثابت ہوا جو کشتۂ دندانِ یار میں
ہنس آ کے قبر پر مری موتی اُگل چلے

بانکی ادا سے قتل انھوں نے کیا ہمیں
مہندی لگا کے پاؤں میں پنجوں کے بل چلے

دل بھر کے سیر کی نہ خرابات دہر کی
سیلاب کی طرح سے ہم آج آئے کل چلے

بے دام و دانہ چاہیے بُلبل اسیر ہوں
عطرِ گلاب باغ میں صیّاد مل چلے

طُرفہ پری ہے کوئی نسیمِ بہار بھی
دیوانے اپنے جامے سے باہر نکل چلے

آنکھیں تمھاری پھر گئیں آئینہ دیکھ کر
آخر غرورِ حسن سے تیور بدل چلے

آسودہ سیر ہو کے ہوئے اپنی جان سے
خوانِ فلک سے ہم غم و غصّہ نگل چلے

یاد آ گئے چمن میں وہ مہندی لگائے پاؤں
مہندی کے پیڑ[1] دیکھ کے ہم ہاتھ مَل چلے

---

۱ - کلیات طبع نول کشور و لاہور: ''مہندی کی پڑی دیکھ کے۔'' متن کلیات علی بخش کے مطابق ہے۔

آئے جو کیفِ مے میں وہ گلگشتِ باغ کو
غنچے سے ٹوپی لالے سے پگڑی بدل چلے
تڑپا جو میں فشارِ لحد کے عذاب سے
تھرائی گور ، قبر کے تختے نکل چلے
للہ چلیے سایۂ دیوارِ یار میں
گرمی سے آفتاب کی آتش پگھل چلے

۱۴۶

چہکارتے ہیں مرغ خوش الحاں نئے نئے
دکھلا رہا ہے رنگ گلستاں نئے نئے
کرتا ہے ناز وہ شہِ خوباں نئے نئے
آئین تازہ تازہ ہیں ، فرماں نئے نئے
سودائے زلفِ یار میں یہ چاہتا ہے شوق
آنکھیں ہوں ، اور خواب پریشاں نئے نئے
کیونکر چبا چبا کے نہ باتیں کرے وہ شوخ
نکلے ہیں منہ میں یار کے دنداں نئے نئے
پروانوں کے شریک ہوں جلنے میں قمریاں
روشن ہوئے ہیں سروِ چراغاں نئے نئے
بدتر ہے حال آس چہِ[2] غبغب کے شوق میں
دیتا ہے داغ سیبِ زنخداں نئے نئے
دریائے قہرِ یار جو آ جائے جوش میں
پیدا ہوں ہر تنور سے طوفاں نئے نئے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۲۴ ، نولکشور قدیم ص ۲۰۶ ، جدید ص ۳۲۶ -
۲ - تمام مطبوعہ نسخوں میں : ''بہِ غبغب'' چھپا ہے جو غلط معلوم ہوتا ہے -

ویرانے شہر ہوں تری شمشیرِ ناز سے
آباد ہوویں گنجِ شہیداں نئے نئے

وہ زخمِ تیغِ عشق ہوں میں روزگار میں
منہ سے لگے ہیں جس کے نمکداں نئے نئے

اے تُرک جب سے منزلِ سودا ہے سر مرا
گیسو ترے ہوئے تھے پریشاں نئے نئے

گہ تیر بنتی ہے ، کبھی خنجر ، کبھی سناں
لاتی ہے سانگ یار کی مژگاں نئے نئے

ہوں کہنہ عاشقِ رخِ محبوب ، آئیں گے
سُوئم میں میرے حافظِ قرآں نئے نئے

رہتی ہے فکرِ تازہ مضامیں کی منتظر
اِس گھر میں آ نکلتے ہیں مہماں نئے نئے

رخسار خط نکالے گا اس شاہِ حسن کا
پیدا کرے گا مور سلیماں[۴] نئے نئے

قیدِ نقاب و قیدِ حیا و حجاب و شرم
یوسف ہمارا رکھتا ہے زنداں نئے نئے

کیا باغِ کوے یار ہے ، سیر اس کی کیجیے
آتش شگوفے پھولتے ہیں یاں نئے نئے

۱۴۷

[۱]جوہر نہیں ہمارے ہیں صیّاد پر کھلے
لے کر قفس کو اڑ گئے ، رکھتا جو پر کھلے

شیشے شراب کے رہیں آٹھوں پہر کھلے
ایسا گھرے کہ پھر نہ کبھی ابرِ تر کھلے

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۰۴ ، نولکشور قدیم ص ۲۰۷ ، جدید ص ۳۲۷ -

کچھ تو ہمیں حقیقتِ شمس و قمر کھلے
کس کج کلہ کے عشق میں پھرتے ہیں سر کھلے

انصاف کو ہیں دیدۂ اہلِ نظر کھلے
پردہ اٹھا کہ پردۂ شمس و قمر کھلے

رنگریز کی دکاں میں بھرے ہوں ہزار رنگ
طُرّہ وہ ہے جو یار کی دستار پر کھلے

کیا چیز ہے عبارتِ رنگیں میں شرحِ شوق
خط کی طرح طبیعتِ بستہ اگر کھلے

جو چاہیں یار سے کہیں اغیار ، غم نہیں
خواجہ کو ہیں غلام کے عیب و ہنر کھلے

حیواں پر آدمی کو شرف نطق سے ہؤا
شکرِ خدا کرے جو زبانِ بشر کھلے

یوسف کی اِک دکاں میں نہ تو نے تلاش کی
بازار کون کون سے اے بے خبر کھلے

شیریں دہن سے تیرے تعجّب ہے گفتگو
اعجاز ہے اگر گرہِ نیشکر کھلے

کٹ جائے وہ زباں نہ ہو جس سے دعاے خیر
پھوٹے وہ آنکھ جو کہ نہ وقتِ سحر کھلے

کوتہ ہے اِس قدر مرے قد پر رداے عیش
ڈھانکوں جو پاؤں کو تو یقیں ہے کہ سر کھلے

قاتل جزاے خیر ملے تیری تیغ کو
زخموں کے منہ کھلے نہیں ، جنّت کے دَر کھلے

فصلِ بہار آئی ہے ، چلتا ہے دَورِ جام
مُغ کی دکان ، شام کھلے یا سحر کھلے

پاپوش ہم نے ماری ہے دستار و تاج پر
سودائے زلفِ یار میں رہتے ہیں سر کھلے

کیفِ شرابِ ناب کا انجام ہو بخیر
شلوار بندِ ساقیِ رشکِ قمر کھلے

ناخواندہ شرح شوق جلائے گئے خطوط
باندھے گئے وہ جو کہ مرے نامہ بر کھلے

چاہے صفا تو ساتھ طہارت کے ذکر کر
پرہیز کر تو تجھ کو دوا کا اثر کھلے

ہنس کر دکھائے دانت جو ہم کو تو کیا ہوا
لے لیجیے جو قیمتِ ملکِ گہر کھلے

کہتا ہوں رازِ عشق، مگر ساتھ شرط کے
کانوں ہی تک رہے، نہ زباں کو خبر کھلے

مشتاق بندشوں کے ہیں، خوبوں کو چاہیے
بندھوائیں شاعروں سے جو اُن کی کمر کھلے

رکتی نہ اس سے چوٹ، نہ چلتی یہ قاتلا
ہاتھوں سے تیرے جوہرِ تیغ و سپر کھلے

مطلب نہ سرنوشت کا سمجھا تو شکر کر
دیوانہ ہو جو حالِ قضا و قدر کھلے

چلنا پڑے گا یار کی خدمت میں سر کے بل
سمجھے ہو کیا جو بیٹھے ہو آتش کمر کھلے

۱۴۸

نکہتِ گل سے مجھے یار کی بو آتی ہے[1]
خار سے یاد الجھ پڑنے کی خو آتی ہے

شرم تجھ کو بہت اے آئنہ رو ! آتی ہے
میری صورت سے مگر عشق کی بو آتی ہے

صبح تک دیدۂ تر سے نہیں آنسو تھمتے
پانی کرنے کو شبِ ہجر لہو آتی ہے

موسمِ گل کی ہوا نے کیے ساقی بےکار
بطِ مے اڑ کے لبِ مست کو چھو آتی ہے

فصلِ گل باقی ہے کر لوں گا گریباں پھر چاک
آنے دو سوزنِ اگر بہرِ رفو آتی ہے

پاک دامانیِ معشوق کا سودا ہے جنھیں
نیند ان کو نہیں بے قیدِ وضو آتی ہے

کون سا نقشِ قدم چاند سی تصویر نہیں
اس صنم کو روشِ خامۂ مو آتی ہے

ساز کی طرح رہا کرتے ہیں عاشق نالاں
چھیڑ طرفہ تجھے اے عربدہ جو آتی ہے

خونِ دل آنکھوں میں اس طرح سے بھر جاتا ہے
جام میں جیسے کہ صہبائے سبو آتی ہے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۲۵ تا ۲۲۶ ، دیوانِ اول ختم ہے - اس کے بعد خاتمہ الطبع اور تین تاریخیں ہیں جو ہم نے آخر میں شریکِ اشاعت کر لی ہیں - طبع نولکشور کان پور قدیم ص ۲۰۸ ، طبع جدید ص ۳۲۸ تا ۳۲۹ -

قد میں اس حور کے طوبیٰ کا ہے سارا انداز
زلف سے سنبلِ فردوس کی بو آتی ہے

کمرِ یار کی قمری ہے مگر دیوانی
غیب سے پہنے ہوئے طوقِ گلو آتی ہے

دور پہنچا ہے کمال اس کی صفا کا شہرہ
دیکھنے حور وہ آئینہ رو آتی ہے

کرمِ حق سے ہے گلزارِ توکل سرسبز
کٹ کے دریا سے مرے باغ میں جو آتی ہے

خوش قماشی وہ نہیں جامۂ عریانی کی
اس میں کب نوبتِ پیوند و رفو آتی

یارِ جانی کا ذرا بھیس بدل لے اے موت!
قبض کرنے کو مری روح جو تو آتی ہے

مے سے کرتا نہیں لبریز اسے تو ساقی
قالبِ جام میں یہ روحِ سبو آتی ہے

سرو قد کا ترے سودا جو سنا ہے قمری
میرے سر مارنے کو طوقِ گلو آتی ہے

حلقۂ ناف سے یہ عقدہ کھلا اے آتش
کمرِ یار کو بھی پیچشِ مو آتی ہے

۱۴۹

گل[1] کی قبا نہ لالے کی دستار لے چلے
عریاں بدن وہ[2] لائے جو تھے خار لے چلے

۱ - کلیات دیوان دوم طبع علی بخش ص ۲۷۰، کلیات دیوان دوم نولکشور قدیم ص ۲۴۳ ۔ کلیات دیوان دوم جدید ص ۳۸۵ -

۲ - نسخۂ نولکشور قدیم: "عریاں بدن جو لائے تھے -" طبع جدید: "عریاں بدن وہ لائے جو تھے -"

سر میں ہوائے کوچۂ دلدار لے چلے
باغِ جہاں سے حسرتِ گلزار لے چلے

نیّت کو عاشقوں کی کیا سیر حسن نے
آنکھوں کے جام شربتِ دیدار لے چلے

کرتے ہیں سیر چشم خریدار سے مدام
یوسف ملا تو لوٹ کے بازار لے چلے

سودا بنا نہ یار کے حسن و جمال کا
اُس لالہ رو کا داغ خریدار لے چلے

مقصودِ دل ہے قلزمِ خوں میں شناوری
جس گھاٹ چاہے یار کی تلوار لے چلے

اے نونہالِ حسن جو اُن کی نظر پڑے
عنابِ لب کو توڑ کے بیمار لے چلے

بولی یہ روح پھینک کے پشتارہ جسم کا
بھاری ہے بوجھ ، کون یہ بیگار لے چلے

آ جائے جوش پر تو ابھی قصرِ یار میں
سیلابِ اشک توڑ کے دیوار لے چلے

جامے سے باہر اپنے مرا شوقِ وصل ہے
تشریف اب تو پیرہنِ یار لے چلے

کیفِ شراب سے دو جہاں کا ہو غم غلط
بحرین سے یہ کشتیِ مے پار لے چلے

دوڑا ہے ان کے پیچھے کس انداز سے وہ شوخ
طاؤس و کبک اُڑا کے جو رفتار لے چلے

دارالسرور میں بھی کروں سجدہ پائے خم
مسجد سے شوقِ خانۂ خمّار لے چلے

شمشیر سے بلا کا ہو ہرچند سامنا
چلیے جدھر وہ ابروے خمدار لے چلے

ایسی رسائی کیجیے پیدا کہ کھینچ کر
خلوت میں انجمن سے ہمیں یار لے چلے

سایے نے دی ڈھئی جو ترے آستان پر
در سے اٹھا کے ہم پسِ دیوار لے چلے

داغِ فراق و حسرتِ دیدار و شوقِ وصل
دنیا سے ہم یہ عاقبتِ کار لے چلے

بازارِ دہر میں نہ رہی جنسِ دل پسند
سودا جو تھا وہ تیرے خریدار لے چلے

نالوں نے اپنے آنکھ جھپکنے نہ دی کبھی
سودائے خواب فتنۂ بیدار لے چلے

انصاف ہو تو محکمۂ عدل و داد میں
جلّاد اپنے ساتھ گنہ گار لے چلے

تم سیر کر کے کیا پھرے اندھیر ہوگیا
بازار آ کے رونقِ بازار لے چلے

حاصل ہوا نہ خاک بھی آپس کی نزع[۱] سے
دل میں غبار کافر و دیں دار لے چلے

آتش جرس کے نالوں کی پھر ہو نہ احتیاج
ہم کو جو ساتھ قافلہ سالار لے چلے

---

۱ - نزع : بمعنی نزاع - لڑائی جھگڑا - آتش کا منفرد استعمال -

۱۵۰

[1]اسیرِ لطف و کرم کی رہائی مشکل ہے
نگیں کو نام سے تیرے جدائی مشکل ہے

ہزار دعوئ باطل کیا کریں یا رب !
بتوں کو تیری طرح سے خدائی مشکل ہے

پھرایا سر کو ترے زمزموں نے اے بلبل !
خفا نہ ہو تو کہوں خوش نوائی مشکل ہے

بہت سی دیکھیں ہیں خم‌دار ہم نے تلواریں
تمھارے ابروؤں کی کج ادائی مشکل ہے

وہ اتحاد نہیں ہے کہ جس میں فرق پڑے
ہماری اور تمھاری جدائی مشکل ہے

کمر سے بڑھ چلے گیسوے یار قہر کیا
عدم سے دو قدم آگے رسائی مشکل ہے

ولایتی بھی حسینوں کو ہم نے دیکھ لیا
منش تری سی کہاں میرزائی مشکل ہے

پھریں گے ہم نہ ہزار آپ ہم سے منہ پھیریں
تمھیں ہے سہل ، ہمیں بے وفائی مشکل

جلا کیا کریں آئینہ ساز آئینے
صفاے رُخ کی تمھارے صفائی مشکل ہے

حیاے[2] یار نے بدلا جو کیفِ مے میں رنگ
یقیں ہوا یہ ہمیں پارسائی مشکل ہے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۷۱ ، نولکشور قدیم ص ۲۴۴ جدید ص ۳۸۵ -
۲ - کلیات طبع علی بخش : ''حیاے یار نے بدلا -'' نولکشور و لاہور : ''حیا سے یار نے بدلا -''

عنایت اُس کو ہو بے مانگے بوسہ اے شہِ حُسن
فقیرِ مست کو تیرے گدائی مشکل ہے
ہزار پنجۂ مرجاں کا چہچہا ہو رنگ
وہ دل ربائیِ دستِ حنائی مشکل ہے
کنارہ کش نہ ہوا اے بحرِ حُسن ! عاشق سے
نہیں تو کہتے ہیں ہم آشنائی مشکل ہے
خلیل کا اِسے کعبہ نہ جانیو آتش
خدا کا گھر ہے یہ ، دل تک رسائی مشکل ہے

۱۵۱

وردِ زباں جنابِ محمدؐ کا نام ہے
قابل درود پڑھنے کے اپنا کلام ہے
مومن پسند یار کا شیریں کلام ہے
کیا چاشنی ہے ، کیا مزہ ہے ، کیا قوام ہے
حق ہے جو موشگاف کا اس میں کلام ہے
دیکھا کمر کو یار کی ، نازک مقام ہے
اِک حال پر کبھی نہیں اُس کو قیام ہے
دنیا کا کارخانہ طلسمی مقام ہے
عاشق کا نالہ سن کے یہ اُن کا کلام ہے
باقی دھواں ہے عُود میں جب تک کہ خام ہے
زنجیر ہے وہ طرّۂ مشکیں ، نہ دام ہے
شاعر کہا کریں اُنھیں سودائے خام

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۷۲ ، نولکشور قدیم ص ۳۴۴ ، جدید ص ۳۸۶ -

آزاد کردہ سرو اک اُس کا غلام ہے
قدِ بلند یار کا عالی مقام ہے

مطلب ہے دفترِ گل و لالہ میں مختصر
دو دن کی سیر میں یہ گلستاں تمام ہے

صبحِ بہار ہے، مجھے ساقی پلا شراب
سب جانتے ہیں عید کا روزہ حرام ہے

اُس شاہِ حسن کو یہ سجھاتی ہے تمکنت
وہ کام اَشارے سے ہو، زباں کا جو کام ہے

حسن و جمالِ یار کی شہرت کہاں نہیں
روشن تر آفتاب سے اس مہ کا نام ہے

عاشق نوازِ حسن کی تعریف کیا کروں
یوسف سے بھی عزیز اسے اپنا غلام ہے

دکھلا رہی ہے سیرِ چمن گفتگوے یار
جھڑتے ہیں پھول منہ سے یہ رنگیں کلام ہے

کس کشتنی کو عشق تری تیغ سے نہیں
مشتاقِ جوے آب ہے جو تشنہ کام ہے

زیبندہ چشمِ یار میں سرخی ہے نشے کی
کیفیّتِ شراب کے قابل یہ جام ہے

اَک سجدۂ نیاز میں ہے فرضِ عشق ادا
میں مقتدی ہوں اور مرا دل امام ہے

ہم چشمِ تر کو سامنے کرتے ہیں ابر کے
تم ہنس پڑو تو برق کا قصّہ تمام ہے

رہتے ہیں جبہہ سا جو ترے آستاں پر
آنکھوں میں ان کی پست بلندیِ بام ہے

خوں ریز ہے نقابِ رخِ یار سے کھلا
جوہر ہیں جس میں تیغ کے یہ وہ نیام ہے

بے معنی ہے وہ عشق کہ جس میں کشش نہیں
دل چسپ ہو نہ حسن تو صورت حرام ہے

نکلے بخارِ دل جو زباں سے عجب نہیں
چھلکے تو کیا بعید ہے، لب ریز جام ہے

سودائی زلفِ یار کا جب سے ہوا ہے دل
قالب میں مرغِ روح کو ایذائے دام ہے

جب تک حلال کر لے نہ مجھ بے گناہ کو
قاتل کو دہنے ہاتھ کا کھانا حرام ہے

رکھتے ہیں وہ قدم تنِ بےجاں میں حکمِ روح
پاپوشِ یار کبک سے بھی خوش خرام ہے

کیا کیا شگوفے پھولتے رہتے ہیں رات بھر
صبحِ بہار یار کے کوچے کی شام ہے

دولت کے سامنے نہیں کچھ قدر حُسن بھی
محمود کا ایاز سا خوش رو غلام ہے

اک دن حضورِ قلب سے ہوتی نہیں ادا
زاہد تری نماز کو میرا سلام ہے

مہندی ہمارے قتل کی خاطر ہے لگ رہی
خونِ حنا کا ہم سے انھیں انتقام ہے

معشوق ہی نہیں جو نہ وعدہ خلاف ہو
چاہے جو مجھ سے پختگیِ عہد، خام ہے

خلخالِ پائے یار سے آتی ہے یہ صدا
مردے سے لیجیے[1] وہ جو زندہ کا کام ہے

بت خانہ کھود ڈالیے ، مسجد کو ڈھائیے
دل کو نہ توڑیے ، یہ خدا کا مقام ہے

جس مسئلے میں شک ہو جسے ، آ کے پوچھ لے
مسجد ہے ، وقتِ صبح ہے ، موجود امام ہے

ہوتا ہے خوش نوائیِ بُلبل سے آشکار
یہ مشتِ پر بھی شاعروں کا احتلام ہے

انگشتری ہنوز نہیں دستِ یار میں
ناآشنا نگینے کی صورت سے نام ہے

بے باکیِ زباں سے نہیں کون خوف ناک
ہر عضو اٹھ کے صبح کو کرتا سلام ہے

آتش برا نہ مانیو حق حق جو پوچھیے
شاعر ہیں ہم ، دروغ ہمارا کلام ہے

۱۵۲

[2]باغباں انصاف پر بُلبل سے آیا چاہیے
پنچنی اس کو زرِ گل کی پنھایا چاہیے

فرشِ گل بلبل کی نیت سے بچھایا چاہیے
شمع پروانوں کی خاطر سے جلایا چاہیے

پان بھی کھاؤ ، جائی ہے جو مسّی کی دھڑی
شام تو دیکھی ، شفق کو بھی دکھایا چاہیے

---

۱ - کلیات علی بخش : ''مردہ سے کیجیے جو وہ زندہ ۔''
۲ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۷۳ ، نول کشور قدیم ص ۲۴۵ ، جدید ص ۳۸۸ ، بہارستانِ سخن ص ۲۴۲ -

آئنے میں خطِ نورس کا نظارہ کیجیے
آہوانِ چشم کو ریحاں چرایا چاہیے

بوسہ اس لب کا ہے قوت بخشِ روحِ ناتواں
ایسی یاقوتی میسر ہو تو کھایا چاہیے

عشق میں حدِ ادب سے آگے رکھتا ہے قدم
شاخِ گلبن پر سے بلبل کو اڑایا چاہیے

دیکھیے کرتا ہے کیونکر یار سے گستاخیاں
شوق کے بھی حوصلے کو آزمایا چاہیے

ہوگیا ہے ایک مدت سے دلِ نالاں خموش
باغ میں چل کر اسے بلبل سنایا چاہیے

فصلِ گل ہے چار دن ، ساقی تکلف ہے ضرور
پر جواہر کے بطِ مے کو لگایا چاہیے

خم میں جوشِ مے سے مجھ کو یہ صدا ہے آ رہی
ظرفِ مستی ہو تو کیفیت اٹھایا چاہیے

حالِ دل کچھ کچھ کہا میں نے تو بولا سن کے یار
بس عبارت ہو چکی ، مطلب پر آیا چاہیے

شیر سے خالی نہیں رہتا نیستاں زینہار
بوریائے فقر بچھا چھوڑ جایا چاہیے

رنگِ زرد و چشمِ تر سے کیجیے دعوائے عشق
دو گواہِ حال اس قصے کے لایا چاہیے

رام ہوتے ہی نہیں ، وحشی مزاجی ہے سو ہے
ان سیہ چشموں کو چوپہرہ جگایا چاہیے

دیکھ کر خلوت سرائے یار ، کہتے ہیں فقیر
عود کے مانند یاں دھونی لگایا چاہیے

خاطرِ آتش سے کہیے چند جز شعر اور بھی
بے نشاں کا نام باقی چھوڑ جایا چاہیے

۱۵۳

[1]دل بہت تنگ رہا کرتا ہے
رنگ بے رنگ رہا کرتا ہے

حُسن میں تیرے کوئی عیب نہیں
قُبح میں دنگ رہا کرتا ہے

صلح کی دل سے ہیں یاں مصلحتیں
واں سرِ جنگ رہا کرتا ہے

محتسب کو ترے مستانوں سے
خوفِ سرچنگ رہا کرتا ہے

دل مرا پی کے محبّت کی شراب
نشے میں بھنگ رہا کرتا ہے

عار سی عار ہے مجھ مجنوں کو
ننگ سے ننگ رہا کرتا ہے

جوہرِ تیغ دکھاتا ہے حسن
عشق چورنگ رہا کرتا ہے

گفتنی حال نہیں ہے اپنا
کچھ عجب رنگ رہا کرتا ہے

حلقۂ رُخ میں ترے خالوں سے
لشکرِ زنگ رہا کرتا ہے

منزلِ گور کے دیوانوں کے
سینے پر سنگ رہا کرتا ہے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۷۳ ، نولکشور قدیم ص ۲۴۶ ، جدید ص ۳۸۸ -

عالمِ وجد ترے مستوں کو
بے دف و چنگ رہا کرتا ہے
فندقِ دستِ صنم سے نادم
گلِ اورنگ رہا کرتا ہے
تیرے گوشِ شنوا کا مشتاق
ہر خوش آہنگ رہا کرتا ہے
بندشِ چست سے تیری آتش
قافیہ تنگ رہا کرتا ہے

۱۵۴

[1]زخم دل میں تیری فرقت سے ، جگر میں داغ ہے
ایک گھر میں گل محبت ، ایک گھر میں داغ ہے
رُخ ترا بے داغ ہے ، روے قمر میں داغ ہے
دیکھ لے جو چاہے ، آنکھوں کی نظر میں داغ ہے
عشق کی دل سوزیوں سے بحر و بر میں داغ ہے
یہ وہ آتش ہے کہ جس سے خشک و تر میں داغ ہے
دیدۂ احباب سے بے وجہ پوشیدہ نہیں
لالہ رُو شاید کوئی تیری کمر میں داغ ہے
آج کل ہوتا ہے ہم آغوش وہ رشکِ بہار
بوے گل دیتا ہے جو جو اپنے "بر"[2] میں داغ ہے
اشک کے پانی سے نہلا دے مجھے اے چشمِ تر
گرمیوں سے سوزشِ دل کی جگر میں داغ ہے

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۷۴ ، نول کشور قدیم ص ۲۴۶ ، جدید ص ۳۸۹ -
۲ - کلیات طبع علی بخش میں کاتب کی غلطی سے قافیہ غلط ہوگیا ہے : "اپنے دل میں داغ ہے -"

ناکسوں سے اہلِ عزت کو ہے لازم احتراز
میل تانبے کا ہوا، جس سیم و زر میں داغ ہے

گل ترے چھلّے کا سینے پر نہیں اے تیغ زن
چار پھولوں کے عوض اک اس سپر میں داغ ہے

اشتیاقِ گور میں دیتی ہے ایذا طولِ عمر
منزلِ مقصود کی دوری، سفر میں داغ ہے

کوتہی کرتے ہیں راہِ دشتِ وحشت میں قدم
آبلہ پائی کے ہاتھوں مغزِ سر میں داغ ہے

زلف و خالِ یار پر جب سے پڑی ہے اپنی آنکھ
مشکِ چین و عنبر سارا نظر میں داغ ہے

واں تلاش ایذا ہے دیتی، اور یہاں شوقِ وصال
زخم باہر اپنی قسمت کا ہے، گھر میں داغ ہے

ناگوار اپنے سوا ہے یار دل کو دخلِ غیر
سایے کا بھی ساتھ تیری رہگذر میں داغ ہے

دیتے ہیں تشبیہ روے روشنِ محبوب سے
داغ ہے اس کا ہمیں وہ جو قمر میں داغ ہے

زاہدِ سالوس کے ماتھے کے گھٹّے سے کھلا
لگ ہی رہتا ہے جو تقدیرِ بشر میں داغ ہے

کوئی گردن پر ترے زیبندہ ہے خالِ سیاہ
خوش نما خورشید سے بھی اس سحر میں داغ ہے

داغ کھانے نے مزا ایسا دیا ہے عشق میں
دوڑتی ہے روح اس پر جس ثمر میں داغ ہے

عیب شاعر کو لگا دیتا ہے آتش نقصِ شعر
داغ جب پھل میں لگا، عینِ شجر میں داغ ہے

۱۵۵

[1]چمنستاں کی گئی نشو و نما پھرتی ہے
رُت بدلتی ہے ، کوئی دن میں ہوا پھرتی ہے

خالِ مشکیں کو ترے کرتے ہیں فتنے سجدے
عنبریں گیسوؤں کے گردِ بلا پھرتی ہے

خاک چھنوا رہی ہے کوچۂ قاتل کی تلاش
ساتھ ساتھ اپنے خراب اپنی قضا پھرتی ہے

کج نگہ تو نے تو کی ہم سے ، کبھی رکھتے ہیں
آنکھ اپنی بھی صنم سوے خدا پھرتی ہے

مُلتجی جو تری درگاہ کے ہیں اے محبوب !
پھنے تشریفِ قبول اُن کی دعا پھرتی ہے

نشۂ مے نے نقابِ رُخِ زیبا اُلٹا
ٹھوکریں کھاتی اُن آنکھوں کی حیا پھرتی ہے

قتل کس کس کو کرے دیکھیے ہنگامِ خرام
یہ قدم سے جو لگی اُن کے حنا پھرتی ہے

پاؤں تک یار کے پہنچے گی لٹک کر سر سے
پھیرنے سے کوئی وہ زلفِ رسا پھرتی ہے ؟

وہ جنوں خیز ہے ، وہ مایۂ سودا ہے وہ زلف
دیکھتی ہے جو پری برہنہ پا پھرتی ہے

اپنے جامے سے ہوں میں مے کشِ مفلس باہر
رہن ہوتی ہوئی دستار و قبا پھرتی ہے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۷۴ ، نول کشور قدیم ص ۲۴۷ ، جدید ص ۳۹۰ ، چمنِ بے نظیر ص ۱۹۸ -

صبحِ محشر کے سوا صبحِ شبِ ہجر نہیں
یہ بلا وہ نہیں آتش جو بلا پھرتی ہے

۱۵۶

[1]آئی ہے عیدِ قرباں خنجر کو لال کرتے
دنبے کے بدلے فربہ عاشق حلال کرتے

نالے کا بت کدے میں ہم کیا خیال کرتے
سنتا تھا کون ، کس سے اظہارِ حال کرتے

ہنس کر کلام ہم سے یوسف جمال کرتے
کانوں کو آشنائے فرخندہ فال کرتے

حسنِ شباب ان کا ، موسم بہار کا ہے
بوٹا سا قد دکھاتے جس کو ، نہال کرتے

حیرانِ کار ہوتے معنی تلاش شاعر
صورت جو تم دکھا کر محوِ جمال کرتے

باہر بساط سے تھے ہم عشق کے جوئے میں
دل ہارتے تو جاں سے گوہر کو مال کرتے

ماہِ چہاردہ ہے رخسارۂ منوّر
اک دم نقاب الٹتے تو تم کمال کرتے

آزردہ دل سے جاں ہے ، دل جان سے رکا ہے
تم درمیان پڑ کر رفعِ ملال کرتے

منظور ہوتی ہم کو حجت جو اس دہن میں
اندیشے کو نہ سوجھیں ، وہ احتمال کرتے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۷۵ ، نولکشور قدیم ص ۲۴۷ ، جدید ص ۳۹۰ -
کلیات طبع نولکشور و لاہور : "آتی ہے -" علی بخش : "آئی ہے -"

لٹکاتے دوش سے بھی تھوڑا سا اُن کو صاحب
بازو کی مچھلیوں کا ، زُلفوں کو جال کرتے

ہم چشمی آہوؤں سے زیبا نہ تھی ، وہ کیونکر
چشمِ سیہ کو کیفِ مے سے نہ[1] لال کرتے

سودا زدہ جو تیرے خالوں کا جا نکلتا
قربان مُشک نافے اُس پر غزال کرتے

رُخ یار کا نہ ہوتا جو[2] چاند چودھویں کا
اندھیر ابروؤں کے دونوں ہلال کرتے

سودا زدہ سے اپنے پھر جاتی ہیں وہ آنکھیں
مجنوں سے بھی ہیں وحشت شہری غزال کرتے

ہوتا ہے یہ نقابِ یوسف[3] سے ہم کو روشن
ناقص ہیں آشکارا اپنے کمال کرتے

ہم پایہ ہے دونالی بندوق سے وہ بینی
چھرّوں کا کام روے قاتل کے خال کرتے

لاشہ پڑا ہے میرا صحرا میں زخم کھا کر
حصّے پلنگ و شیر و گُرگ و شغال کرتے

بوسے کے مانگنے پر منہ کو نہ پھیرنا تھا
حاتم تھے تم نہ رد جو میرا سوال کرتے

فصلِ بہار آتی ، سرسبز باغ ہوتا
ظاہر شگوفے اپنے اپنے نہال کرتے

---

۱ - کلیات طبع نولکشور و لاہور : ''کیف مے سے زلال کرتے ۔'' متن نسخہ علی بخش کے مطابق ہے ۔
۲ - کلیات نولکشور : ''تو چاند چودھویں کا ۔''

ہٹتا نہیں ہے اک دم آئینہ سامنے سے
اپنی طرف ہو تم بھی اب تو خیال کرتے

کافی تھی بہرِ مستی ساقی کی مہربانی
دیتا جو دُرد بھی تو شکرِ زلال کرتے

فرقت کی شب میں سنتا ، باتیں جو دل ہماری
یادش بخیر ذکرِ روزِ وصال کرتے

تُربت پر اپنی مشقِ رفتار چاہیے تھی
ہم پائمال ہوتے ، تم پائمال کرتے

خُم سے زیادہ پیدا کرتا وہ ظرف آتش
مٹّی جو میری صرفِ ساغر کلال کرتے

۱۵۷

تماشائے چمن سے سیرِ کوئے یار بہتر ہے[1]
گل و سنبل سے یاں خار و خسِ دیوار بہتر ہے

جبیں سائی کو سنگِ آستانِ یار بہتر ہے
کمر تکیے کو قصرِ دوست کی دیوار بہتر ہے

یہی آواز آتی ہے درِ مہر و محبّت سے
علاقہ اس سے ممکن ہو تو یہ سرکار بہتر ہے

اطبّا دیکھ کر بیمار کو تیرے یہ کہتے ہیں
بہم پہنچے تو اِس کو شربتِ دیدار بہتر ہے

کہا کرتے ہیں عاشق لوگ اکثر پیار سے یوسف[4]
تمھارے حُسن کو بھی گرمیِ بازار بہتر ہے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۷۵ ، نول کشور قدیم ص ۲۴۸ ، جدید ص ۳۹۱ -

صباحت سے ہے رشکِ صبحِ نوروزی وہ پیشانی
ہلالِ عید سے وہ ابروے خم دار بہتر ہے
سنا ہے شاعروں سے بیشتر قند مکرر بھی
لبِ شیریں کے بوسے لینے میں تکرار بہتر ہے
نگاہیں مردمِ دیدہ کو ہر دم یہ سمجھاتی ہیں
ملے لوٹے سے جتنی دولتِ دیدار بہتر ہے
بہارِ بے خزاں ایسی نہیں کوئی چمن رکھتا
خدا جو فکرِ رنگیں دے تو یہ گلزار بہتر ہے
اسیرِ عشق کو ہے فوق آزادانِ عالم پر
جہاں کے تندرستوں سے ترا بیمار بہتر ہے
رہے جاتے ہیں عاشق نیم جاں، کیا قہر کرتے ہو
قبائے تنگ پر تھوڑی سی کج دستار بہتر ہے
چلے گا کبک کیا، طوطی کرے گا کیا سخن سازی
تری گفتار بہتر ہے، تری رفتار بہتر ہے
بہارِ باغ ہے نظارۂ محبوب دکھلاتا
وہ قامت سرو سے تو گل سے وہ رخسار بہتر ہے
کہاں نظارۂ روزن، رہا پردہ نہ جب باقی
تمھارے اور میرے درمیاں دیوار بہتر ہے
سوالِ بوسہ پر ہنس کر وہ بت کہتا ہے اے **آتش**!
خیالِ بد اگر گزرے تو استغفار بہتر ہے

۱۵۸

عتابِ لب کا اپنے مزا کچھ نہ پوچھیے
کس درد کی ہیں آپ دوا، کچھ نہ پوچھیے

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۷۶، نولکشور قدیم ص ۲۴۸، جدید ص ۳۹۲ -

ناز و نیازِ عاشق و معشوق کیا کہوں
عجز و غرورِ شاہ و گدا کچھ نہ پوچھیے
خوش بُو سے ہو رہا ہے معطّر دماغِ جاں
چلتی ہے کس طرف کی ہوا ، کچھ نہ پوچھیے
کیا کیا نگہ پھسلتی ہے رُخسارِ یار پر
کیسا یہ آئنہ ہے صفا ، کچھ نہ پوچھیے
جامے سے باہر اپنے جو ہوں میں ، عجب نہیں
کھولے ہیں کس کے بندِ قبا ، کچھ نہ پوچھیے
آئینہ لے کے کیجیے اپنا مشاہدہ
ہم سے سلوکِ شرم و حیا ، کچھ نہ پوچھیے
رنگیں کیے ہیں یار نے جب سے کہ دست و پا
کیا رنگ لا رہی ہے حنا ، کچھ نہ پوچھیے
اللہ نے کیا ہے کسے بادشاہِ حُسن
سر پر ہے کس کے ظلّ ہما ، کچھ نہ پوچھیے
نا گفتنی ہے عشقِ بُتاں کا معاملہ
ہر حال میں ہے شکرِ خدا ، کچھ نہ پوچھیے
کیا شے ہے وہ کمر ، جو گزرتا ہے یہ خیال
آتی ہے غیب سے یہ صدا ، کچھ نہ پوچھیے
کوتاہ خالِ روئے منوّر ہے کس قدر
کتنی ہے زلفِ یار رسا ، کچھ نہ پوچھیے
آتش گناہِ عشق کی تعزیر کیا کہوں
مشفق ! جو کچھ ہے اُس کی سزا کچھ نہ پوچھیے

۱۵۹

[1]باز آئیں گے نہ بازیِ عیش و نشاط سے
باہر ہیں اِس جوئے میں ہم اپنی بساط سے

حیراں آن ابروؤں کو ہیں معمار دیکھ کر
دو طاق ہیں بلند فلک کے رباط سے

حلقے میں آہوؤں کے ہیں دیوانے جس طرح
عامل حصار میں نہ ہوں اس احتیاط سے

جور و جفا ہزار کرے ، ہم خفا نہ ہوں
خوش رو سے ، خوش جمال سے ، خوش اختلاط سے

کھا کھا کے زخم کرتے ہیں مستوں کی طرح رقص
بسمل تمھاری تیغ کے کس کس نشاط سے

خواہانِ مرگ دل ہے جدائی میں یار کی
بیزار رُوح جسم کے ہے ارتباط سے

انجام ہو بخیر قیامت کا آتشا !
داخل بہشت میں ہو گزر کر صراط سے

۱۶۰

[2]زندے وہی ہیں جو کہ ہیں تم پر مرے ہوئے
باقی جو ہیں سو قبر میں مردے بھرے ہوئے

مستِ الست قلزمِ ہستی میں آئے ہیں
مثلِ حباب اپنا پیالہ بھرے ہوئے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۷۶ ، نول کشور قدیم ص ۲۴۸ ، جدید ص ۳۹۳ -
۲ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۷۶ ، نول کشور قدیم ص ۲۴۹ ، جدید ص ۳۹۳ -

اللہ رے صفائے تن نازنین یار
موتی ہیں کُوٹ کُوٹ کے گویا بھرے ہوئے

دو دن سے پاؤں جو نہیں دبوائے یار نے
بیٹھے ہیں ہاتھ ہاتھ کے اوپر دھرے ہوئے

ان ابروؤں کے حلقے میں وہ انکھڑیاں نہیں
دو طاق پر ہیں دو گل نرگس دھرے ہوئے

بعد فنا بھی آئے گی مجھ مست کو نہ نیند
بے خشت خُم لحد میں سرہانے دھرے ہوئے

نکلیں جو اشک بے اثر آنکھوں سے کیا عجب
پیدا ہوئے ہیں طفل ہزاروں مرے ہوئے

لکھتے گئے ہیں بیاضوں میں اشعار انتخاب
رائج رہے وہی کہ جو سکتے کھرے ہوئے

اُلٹا صفوں کو تیغ نے ابروے یار کی
تیر مژہ سے درہم و برہم پرے ہوئے

آتش خدا نے چاہا تو دریائے عشق میں
کودے جو اب کی ہم تو ورے سے پرے ہوئے

۱۶۱

دو[1] دن کی زندگی میں رہے ہم مرے ہوئے
جوش جنوں نے زرد کیا جب ہرے ہوئے

ناقوس میں سے آئی صدائے "ھوالغفور"
ہم بُت کدے گئے جو خدا سے ڈرے ہوئے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۷۷ ، نول کشور قدیم ص ۲۴۹ ، جدید ص ۳۹۴ -

خط پر جو آئنے میں پڑی ہے نگاہِ یار
آہوے چشمِ مست ہیں سبزہ چرے ہوئے

شوقِ شکار مجھ کو جو اے ترک ہے سنا
چر چر کے سبزہ آہو ہیں کیا کیا ہرے ہوئے

مہندی لگانے کا جو خیال آیا آپ کو
سوکھے ہوئے درخت حنا کے ہرے ہوئے

آرائش آن کے حسن کی موقوف کب ہوئی
نوچے گئے درختِ حنا جب ہرے ہوئے

کیا ہوں گے لے کے خط کو مرے راہ میں تباہ
کوچے میں یار کے ہیں کبوتر چرے ہوئے

وہ صیدِ سخت جان ہوں میں جس پر ہزار بار
خالی ہوئے ہیں تیروں کے ترکش بھرے ہوئے

دینے میں جام کے ہے تأمّل کا کیا سبب
ساقی ! شراب سے ہیں قرابے بھرے ہوئے

بعدِ فنا بھی عشق کا آتش اثر رہا
تربت سے اپنی بیدِ مُولّہ[1] ہرے ہوئے

---

۱ - نولکشور طبع جدید میں ''مولہ'' کی تصحیح ''مولد'' اور حاشیے بر نسخہ ''مولہ'' لکھا گیا ہے - لغت دیکھنے سے معلوم ہوا کہ ''مولو'' بضمِ اول ولام و سکون ثانی و واؤ ''شاخ آہوی باشد کہ قلندران و جوگیان ہندوستان نوازند و بعضے گویند نائی باشد کہ کشیشاں در کلیسا نوازند و ......'' (برہان قاطع) غیاث اللغات میں ''مولوہ'' بہ ہاے ہوز ہے اور اضافہ معنی یہ ہے کہ ، ہندی میں اسے سنگی کہتے ہیں اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ ایک درخت کی شاخ کو لے کر خول بنا کر بجاتے ہیں - اسی ''مولو'' یا ''مولوہ'' کا قلندرانہ تلفظ ''مولّہ'' بھی ہے - آخر میں دال پڑھنا شاید درست نہیں -

۱۶۲

[1]کہتے ہیں ذکرِ لیلیٰ و مجنوں جو چھیڑیے
چپ رہیے بس نہ گور کے مردے اکھیڑیے

خوش حال ہیں مٹا کے مجھے ہفت آسماں
یوسف کو کھا کے ہو گئے ہیں شیر بھیڑیے

ساقی ہے ، مے ہے ، یار ہے ، بزمِ نشاط ہے
چھیڑے جو اب نہ ساز تو مطرب کو چھیڑیے

تدبیر سے تو کام نہ تقدیر کا ہوا
تکیہ خدا پہ کیجیے ، دروازہ بھیڑیے

آئی بہار ، گل نے قبا اپنی چاک کی
بخیہ جو پیرہن میں ہے اس کو ادھیڑیے

آتش قمارِ عشق میں تیرے حضور یار
چالوں کو اپنی بھول گئے ہیں بکھیڑیے

۱۶۳

[2]بہار آئی ، مرادِ چمن خدا نے دی
شگفتہ غنچے ہوئے ، بوے گل صبا نے دی

دکھائے روے مخطط نے یار کے اعجاز
گلیم پوش کو پیغمبری خدا نے دی

گئی ہے دیر سے ، اب تک نہیں پھری ، شاید
درِ قبول کے اوپر ڈھئی دعا نے دی

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۷۷ ، نولشکور قدیم ص ۲۴۹ ، جدید ص ۳۹۴ -

۲ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۷۷ ، نول کشور قدیم ص ۲۴۹ ، جدید ص ۳۹۴ ، چمنِ بے نظیر ص ۱۹۴ -

کفن کی فکر ہمارے لیے بھی واجب ہے
نقاب کی جو تمھیں مشورت حیا نے دی
دمِ اخیر تصوّر بندھا ترے رخ کا
طرف کو کعبے کی کروٹ مجھے قضا نے دی
اڑانے آئے تھے آنکھیں غزالِ چین و ختن
شکست ان کو تری چشمِ سرمہ سا نے دی
جہاں سے حسرتِ منزل کا داغ لے کے گیا
تمھاری راہ میں جاں اک شکستہ پا نے دی
مجال کیا کوئی سودا زدہ جو دم مارے
گلو میں پھانسی ہے اس کاکلِ رسا نے دی
یہ چاہا دیکھیے دونوں میں چھچھا ہے کون
ہمارے خون کی رغبت انھیں حنا نے دی
فقیر ہو کے جو تجھ پر موا ہے اے شہِ حُسن!
جگہ ہے سایے میں اپنے اسے ہُما نے دی
کیا ہے عشق نے بالاے یار کے بے خود
پری کے سایے کی ایذا ہے اس بلا نے دی
رہِ عدم میں سب آواز اپنی بھول گئے
صدا نہ قافلۂ اشک میں درا نے دی
وہ بحرِ حسن ہے کس لہر میں رہا کرتا
خبر کچھ اس کی نہ لا کر اِک آشنا نے دی
مریضِ عشق کو ہے مرگ زیست سے اولیٰ
گلے کو کاٹیے صحّت اگر دوا نے دی
ہوا نہ کوئی توجہ کا یار کی شاکر
دعا [illegible]س شہِ خوباں کو کس گدا نے دی

عزیز داغِ محبت کو رکھتے ہو آتش
نشانی[2] اپنی ہے کس لالہ گوں قبا نے دی

۱۶۴

[3]یا علی[4] کہہ کر بتِ پندار توڑا چاہیے
نفسِ امّارہ کی گردن کو مروڑا چاہیے

تنگ آکر جسم کو اے روح ! چھوڑا چاہیے
طفل طبعوں کے لیے مٹّی کا گھوڑا چاہیے

زلف کے سودے میں اپنے سر کو پھوڑا چاہیے
جب بلا کا سامنا ہو ، منہ نہ موڑا چاہیے

گھورتی ہے تم کو نرگس ، آنکھ پھوڑا چاہیے
گل بہت ہنستے ہیں ، کان ان کے مروڑا چاہیے

آج کل ہوتا ہے اپنا عشقِ پنہاں آشکار
پک چکا ہے خوب ، اب پھوٹے یہ پھوڑا ، چاہیے

مانگتا ہوں میں خدا سے اپنے دل کے داغِ عشق
بادشاہِ حسن کے سکّے کا توڑا چاہیے

اُن لبوں کے عشق نے ہے جب سے دیوانہ کیا
بڑ یہی اپنی ہے اک لالوں کا جوڑا چاہیے

دے رہا ہے گیسوے مشکین سودے کو جگہ
کس کے آگے جا کے اپنے سر کو پھوڑا چاہیے

---

۱ - کلیات طبع جدید نولکشور : ''دعا یہ -'' متن نسخہ علی بخش کے مطابق ہے -
۲ - چمنِ بے نظیر : ''نشانی اپنی یہ کس -''
۳ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۷۸ ، نولکشور قدیم ص ۲۵۰ ، جدید ص ۳۹۵ ، بہارستانِ سخن ص ۶۲۷ -

بادۂ گلگوں کے شیشے کا ہوں سائل ساقیا !
ساتھ کیفیت کے اُڑتا مجھ کو گھوڑا چاہیے

یہ صدا آتی ہے رفتارِ سمندِ عمر سے
وہ بھی گھوڑا ہے کوئی جس کو کہ کوڑا چاہیے

قطعِ مقراضِ خموشی سے زباں کو کیجیے
قفل دے کر گنج پر مفتاح توڑا چاہیے

اپنے دیوانے کا دل لے کر یہ کہتا ہے وہ طفل
یہ کھلونا ہے اِسی قابل کہ توڑا چاہیے

زلفیں روئے یار پر بے وجہ لہراتی نہیں
کچھ نہ کچھ زہر اُگلے یہ کالے کا جوڑا ، چاہیے

باغباں سے چھپ کے گل چینی جو کی تو کیا کیا
آنکھ بُلبل کی بچا کر پھول توڑا چاہیے

فصلِ گل میں بیڑیاں کاٹی ہیں میرے پاؤں کی
ہاتھ میں حداد کے سونے کا توڑا چاہیے

باغِ عالم میں یہی میری دعا ہے روز و شب
خار خارِ عشقِ گل رخسار توڑا چاہیے

عشق کی مشکل پسندی سے ہوا یہ آشکار
خوب صورت کو غرورِ حُسن تھوڑا چاہیے

زمزمے سن کر مرے صیادِ گل رو نے کہا
ذبح کیجے ، ایسے بلبل کو نہ چھوڑا چاہیے

پیر ہو آتش کفن کا سامنا ہے عنقریب
توبہ کیجے ، دامنِ تر کو نچوڑا چاہیے

۱۶۵

[1]مگر اُس کو فریبِ نرگسِ مستانہ آتا ہے
اُلٹتی ہیں صفیں ، گردش میں جب پیمانہ آتا ہے

نہایت دل کو ہے مرغوب بوسہ خالِ مشکیں کا
دہن تک اپنے کب تک دیکھیے یہ دانہ آتا ہے

خوشی سے اپنی رسوائی گوارا ہو نہیں سکتی
گریباں پھاڑتا ہے تنگ جب دیوانہ آتا ہے

فراقِ یار میں دل پر نہیں معلوم کیا گزری
جو اشک آنکھوں میں آتا ہے سو بے تابانہ آتا ہے

بگولے کی طرح کس کس خوشی سے خاک اُڑاتا ہوں
تلاشِ گنج میں جو سامنے ویرانہ آتا ہے

سمجھتے ہیں مرے دل کی وہ کیا نافہم و ناداں ہیں
حضورِ شمع بے مطلب نہیں پروانہ آتا ہے

طلب دنیا کو کر کے زن مریدی ہو نہیں سکتی
خیالِ آبروے ہمّتِ مردانہ آتا ہے

ہمیشہ فکر سے یاں عاشقانہ شعر ڈھلتے ہیں
زباں کو اپنی بس اک حسن کا افسانہ آتا ہے

تماشاگاہِ ہستی میں عدم کا دھیان ہے کس کو
کسے اس انجمن میں یاد خلوت خانہ آتا ہے

صبا کی طرح ہر اک غیرتِ گل سے ہیں لگ جاتے
محبّت ہے سرشت اپنی ، ہمیں یارانہ آتا ہے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۷۸ ، نول کشور قدیم ص ۲۵۰ ، جدید ص ۳۹۶ -

زیارت ہوگی کعبے کی ، یہی تعبیر ہے اس کی
کئی شب سے ہمارے خواب میں بت خانہ آتا ہے

خیال آیا ہے آئینے کا منہ اُس میں وہ دیکھیں گے
اب اُلجھے بال سلجھانے کی خاطر شانہ آتا ہے

پھنسا دیتا ہے مرغِ دل کو دامِ زلفِ پیچاں میں
تمہارے خالِ رخ کو بھی فریبِ دانہ آتا ہے

عتاب و لطف جو فرماؤ ہر صورت سے راضی ہیں
شکایت سے نہیں واقف ، ہمیں شکرانہ آتا ہے

خدا کا گھر ہے ، بت خانہ ہمارا دل نہیں آتش
مقامِ آشنا ہے ، یاں نہیں بیگانہ آتا ہے

۱۶۶

[1]جاں بخش لب کے عشق میں ایذا اُٹھائیے
بیمار ہو کے نازِ مسیحا اُٹھائیے

قُدسی نگاہِ لطف کے اُمیدوار ہیں
آنکھیں تو سوئے عالمِ بالا اُٹھائیے

اب کی بہار میں جو ہمیں لے چلے جُنوں
چن چن کے داغ لالۂ صحرا اُٹھائیے

خامے سے کام لیجیے ہنگامِ فکرِ شعر
میدانِ کارزار میں گھوڑا اُٹھائیے

دکھلائے حسنِ یار کا جلوہ ہمیں یہ عشق
کس کس طرح سے لطفِ تماشا اُٹھائیے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۷۹ ، نول کشور قدیم ص ۲۵۱ ، جدید ص ۳۹۷ -

تجھ سا حسیں ہو یار تو کیونکر نہ آس کے پھر
نازِ بجا و غمزۂ بے جا اُٹھائیے
مفلس ہوں لاکھ، پر یہی دل کو بندھی ہے دُھن
یوسف کو قرض لے کے تقاضا اُٹھائیے
سختیِ راہ کھینچیے منزل کے شوق میں
آرام کی تلاش میں ایذا اُٹھائیے
فصلِ بہار آئی، پیو صوفیو شراب
بس ہو چکی نماز، مصلّا اُٹھائیے
جامِ شرابِ ناب ہے ساقی لیے کھڑا
گردن تو مثلِ گردنِ مینا اُٹھائیے
آواز کو سنا کے کیجیے کان مستفیض
رحم آنکھوں پر بھی کیجیے، پردا اُٹھائیے
جوشِ جنوں میں دیکھیے پیچھے نہ مڑ کے پھر
منہ جس طرف کو صورتِ دریا اُٹھائیے
شمشیر زن ہو یار بہادر جوان ہو
آتش جہادِ عشق پہ بیڑا اُٹھائیے

۱۶۷

ادہن پر ہیں اُن کے گماں کیسے کیسے
کلام آتے ہیں درمیاں کیسے کیسے
زمینِ چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۷۹، نول کشور قدیم ص ۲۵۱، جدید ص ۳۹۷ -

تمہارے شہیدوں میں داخل ہوئے ہیں
گل و لالہ و ارغواں کیسے کیسے

بہار آئی ہے ، نشے میں جھومتے ہیں
مریدانِ پیرِ مُغاں کیسے کیسے

عجب کیا چھٹا روح سے جامۂ تن
لٹے راہ میں کارواں کیسے کیسے

تپِ ہجر کی کاہشوں نے کیے ہیں
جدا پوست سے استخواں کیسے کیسے

نہ مڑ کر بھی بے درد قاتل نے دیکھا
تڑپتے رہے نیم جاں کیسے کیسے

نہ گورِ سکندر ، نہ ہے قبرِ دارا
مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

بہارِ گلستاں کی ہے آمد آمد
خوشی پھرتے ہیں باغباں کیسے کیسے

توجّہ نے تیری ہمارے مسیحا
توانا کیے ناتواں کیسے کیسے

دل و دیدۂ اہلِ عالم میں گھر ہے
تمہارے لیے ہیں مکاں کیسے کیسے

غم و غصّہ و رنج و اندوہ و حرماں
ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے

ترے کلکِ قدرت کے قربان آنکھیں
دکھائے ہیں خوش رُو جواں کیسے کیسے

کرے جس قدر شکرِ نعمت وہ کم ہے
مزے لوٹتی ہے زباں کیسے کیسے

۱۶۸

[1]چپ ہو کیوں کچھ منہ سے فرماؤ خدا کے واسطے
آدمی سے بُت نہ بن جاؤ خدا کے واسطے

کبک کی آنکھوں کے نظّارے کو عاشق آئے ہیں
چاند سی صورت کو دکھلاؤ خدا کے واسطے

دردِ دل سے دم فنا ہوتا ہے، جاے رحم ہے
جان جاتی ہے مری ، آؤ خدا کے واسطے

جھوستی زلفیں تو ہیں کالی گھٹا کی طرح سے
ہنس پڑو ، بجلی بھی چمکاؤ خدا کے واسطے

پاس رسوائی کا دونوں جانبوں سے شرط ہے
میں تمھیں ، تم مجھ کو سمجھاؤ خدا کے واسطے

۱۶۹

[2]چلا وہ راہ جو سالک کے پیش پا آئی
ٹھہر گیا جو کہیں بوے آشنا آئی

بہارِ گل میں ہیں دیوانے جامے سے باہر
پری کا بھیس ہے بدلے ہوئے بلا آئی

لیا جو بوسہ تو ہنس کر یہ اُس صنم نے کہا
خدا سے شرم نہ اے بندۂ خدا آئی

شراب اُن کو پلا کر ہوئی پشیمانی
وہ بے حجاب ہوئے تو مجھے حیا آئی

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۸۰ ، نول کشور قدیم ص ۲۵۲ ، جدید ص ۳۹۸ -
۲ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۸۰ ، نولکشور قدیم ص ۲۵۲ ، جدید ص ۳۹۸ -

لباسِ کعبہ کا حاصل کیا شرف اُس نے
جو کوے یار میں کالی کوئی گھٹا آئی

سروہیاں ہیں ، نہیں دونوں ابروے خم دار
وہ سنہ چڑھے ترے جس کی کہ ہو قضا آئی

ہماری خاک رہی کوے یار کی مشتاق
پہنچتی اُڑ کے ، نہ ایسی کوئی ہوا آئی

نہ روزِ حشر بھی فریاد ہو سکی مجھ سے
جفاے یار کے آڑے مری وفا آئی

مریضِ عشق کیا حسنِ یار نے جب سے
مزاج سے نہ موافق کوئی دوا آئی

۱۷۰

[1]سانپ کا زہر وہ گیسو ہیں آ گلنے والے
آہوے چشم چھلاوے کو ہیں چھلنے والے

کشتہ ہم بھی تری نیرنگی کے ہیں یاد رہے
او زمانے کی طرح رنگ بدلنے والے !

کششِ عشق میں بارے اثر اتنا تو ہوا
پھر کھڑے ہوتے ہیں منہ پھیر کے چلنے والے

حسن نے روشنی خورشید کی پیدا کی ہے
شب کو باہر نہیں وہ گھر سے نکلنے والے

آئنہ رکھ کے کہا ہے جو کبھی تم نے بناؤ
خاک میں مل گئے ہیں دیکھ کے چلنے والے

---

۱ - کلیات طبع علی ص ۲۸۰ ، نولکشور قدیم ص ۲۵۳ ، جدید ص ۳۹۹ -

پاؤں تک تیرے جو پہنچے نہیں اے مایۂ ناز
کفِ افسوس وہی ہاتھ ہیں ملنے والے
گوش زد ہو تو کہیں کوس سفر کی آواز
چل کھڑے ہوں گے کمر باندھ کے چلنے والے
یہی سوزش ، یہی گرمی ہے اگر نالوں کی
صورتِ موم ہیں فولاد پگھلنے والے
باغِ عالم میں یہی اپنی دعا ہے ہر صبح
رہیں سرسبز شجر پھولنے پھلنے والے
اُن سے کہہ دو نہیں آہستہ جو رکھتے دو گام
گر بھی پڑتے ہیں بہت دوڑ کے چلنے والے
نعمتِ عشق کا راغب نہیں کوئی پاتا
مر گئے کیا غم و غصّہ کے نگلنے والے
اشک باقی جو نہ آنکھوں میں رہے تو نہ رہے
جگر و دل میں لہو ہو کے نکلنے والے
بس قلم صفحۂ ہستی سے اُٹھا اے **آتش !**
ڈھل چکے شعر جو تھے فکر سے ڈھلنے والے

۱۷۱

اُٹھتے[1] ہی تیرے بزم سے سب اُٹھ کھڑے ہوئے
وہ یار رہ گئے کہ جو تھے غش پڑے ہوئے
نالوں سے میرے ہل گئے رنگیں ادائے دہر
بُلبل کو سن کے کان گلوں کے کھڑے ہوئے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۸۱ ، نول کشور قدیم ص ۲۵۳ ، جدید ص ۳۹۹ -

بے نشۂ شرابِ محبّت نہ جائیں گے
ساقی کے در پہ اب تو ہیں ہم بھی اڑے ہوئے

ٹھیک آئی تن پہ اپنے قبائے برہنگی
باقی لباس چھوٹے ہوئے یا بڑے ہوئے

جو بچ گئے ہیں جنبشِ مژگانِ ناز[1] سے
ارّہ کے نیچے حشر میں ہوں گے کھڑے ہوئے

دیوانگانِ عشق جو زینت پسند ہوں
سونے کی بیڑیوں میں ہوں ہیرے جڑے ہوئے

بے مہر یار کا نہ گلہ ہم سے ہو سکا
پھوٹے نہ تھے جو دل میں پھپھولے پڑے ہوئے

کُشتوں کی طرح زیست میں تیرے نیاز مند
شمشیرِ ناز سے رہے بے دم پڑے ہوئے

آئینے نے کیا ہے جو صورت سے آشنا
گردن میں اُن کی ہاتھ ہیں اُن کے پڑے ہوئے

باتوں میں اُن کی ہوگئے عاشق غریب قتل
تلوار کی طرح جو وہ منہ کے کڑے ہوئے

روزِ وصال آنکھوں کو اپنی دکھائے گا
روزِ شبِ فراق کے لچّھن جھڑے ہوئے

ساقی کی بندگی نے کیا خاتمہ بخیر
خُم کے تلے ہیں مے کدے میں ہم گڑے[2] ہوئے

---

۱ - کلیات نولکشور و لاہور میں ہے : ''مژگانِ یار سے'' نسخۂ علی بخش مطابقِ متن ہے -
۲ - کلیات طبع علی بخش : ''مے کدے میں ہم کھڑے ہوئے -''

اب پاؤں رکھ کے وہ نہیں چلتے زمین پر
اِک اِک کڑے کے ساتھ ہیں دو دو چھڑے ہوئے

بوسہ جو خالِ لب کا لیا ، یار نے کہا
اِس تل کا تیل پی کے ہو چکنے گھڑے ہوئے

نہ فکرِ شعر ہے ، نہ وہ مضمون تلاشیاں
آتش سے تو نہیں کہیں خواجہ لڑے ہوئے

۱۷۲

طاقِ ابرو ہیں پسندِ طبع اِک دل خواہ کے[1]
عمر ہوتی ہے بسر گنبد میں بسم اللہ کے

جاؤں کیونکر بن بلائے اس بتِ دل خواہ کے
بے طلب کوئی نہیں پہنچا حضور اللہ کے

روے نورانی کا تیرے ہو گیا ہے شک جو یار
رات بھر دوڑا ہوں کیا کیا پیچھے پیچھے ماہ کے

شامِ وصل آئی اِدھر موجود تھی صبحِ فراق
کم گھڑی سے بھی پہر ہیں اس شبِ کوتاہ کے

داغِ عشقِ حسن کا لقمہ نوالہ ہے کڑا
سیر دل ہیں کھانے والے اس غمِ جاں کاہ کے

کہتے ہیں شاعر قیامت ہوگی قدِ یار سے
مرد عاشق ہیں ، مقر ہیں ہم تو اس افواہ کے

ناتوانی سے ہے حالت غیر ہجرِ یار میں
دم نکل جاتا ہے اپنا ساتھ ہر اک آہ کے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۸۱ ، نول کشور قدیم ص ۲۵۳ ، جدید ص ۳۰۰ -

عشقِ بُت میں کوہ پر جا جا کے سر پٹکا کیے
پاؤں کو صدمے رہے پست و بلندِ راہ کے

سال ہا عشقِ زنخداں نے لہو پانی کیا
مدتوں روئے ہیں جا جا کر کنارے چاہ کے

حشر تک یوں ہی رہیں گے غمزہ و انداز و ناز
عشق عالی منزلت سے ، حُسن والا جاہ کے

جا نکلتا ہے جو مجھ سا تشنۂ دیدارِ حُسن
ذکرِ یوسف کرنے لگتے ہیں کبوتر چاہ کے

منزلِ مقصود میں چل کر نکالوں گا انھیں
آبلوں میں یہ جو ہیں پیوست کانٹے راہ کے

اس بُتِ بے دیں کی زلفوں کا اشارہ ہے یہی
اِس بلا میں وہ پھنسیں عاشق ہوں جو اللہ کے

کب سماتی ہے نظر میں روشنیِ آفتاب
چشمِ بینا رکھتے ہیں ذرے تری درگاہ کے

۱۷۳

ہوائے دورِ مئے خوش گوار راہ میں ہے[1]
خزاں چمن سے ہے جاتی ، بہار راہ میں ہے

گدا نواز کوئی شہ سوار راہ میں ہے
بلند آج نہایت غبار راہ میں ہے

شباب تک نہیں پہنچا ہے عالمِ طفلی
ہنوز حُسنِ جوانیٔ یار راہ میں ہے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۸۲ ، نول کشور قدیم ۲۵۳ ، جدید ص ۴۰۰ -

عدم کے کوچ کی لازم ہے فکر ہستی میں
نہ کوئی شہر، نہ کوئی دیار راہ میں ہے
طریقِ عشق میں اے دل! عصائے آہ ہے شرط
کہیں چڑھاؤ، کسی جا اُتار راہ میں ہے
طریقِ عشق کا سالک ہے، واعظوں کی نہ سن
ٹھگوں کے کہنے کا کیا اعتبار راہ میں ہے
جگہ ہے رحم کی یار ایک ٹھوکر اس کو بھی
شہیدِ ناز کا تیرے مزار راہ میں ہے
سمندِ عمر کو اللہ رے شوقِ آسائش
عنانِ گسستہ و بے اختیار راہ میں ہے
نہ بدرقہ ہے، نہ کوئی رفیق ساتھ اپنے
فقط عنایتِ پروردگار راہ میں ہے
نہ جائیں آپ ابھی دوپہر ہے گرمی کی
بہت سی گرد، بہت سا غبار راہ میں ہے
تلاشِ یار میں کیا ڈھونڈھیے کسی کا ساتھ
ہمارا سایہ ہمیں ناگوار راہ میں ہے
جنوں میں خاک اڑاتا ہے ساتھ ساتھ اپنے
شریکِ حال ہمارا غبار راہ میں ہے
سفر ہے شرط، مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے
کوئی تو دوش سے بارِ سفر اتارے گا
ہزار راہ زن امیدوار راہ میں ہے
مقام تک بھی ہم اپنے پہنچ ہی جائیں گے
خدا تو دوست ہے، دشمن ہزار راہ میں ہے

بہت سی ٹھوکریں کھلوائے گا یہ حُسن ان کا
بتوں کا عشق نہیں ، کوہسار راہ میں ہے

بلائے جانِ مسافر ہے خوابِ شیریں بھی
یہی وہ شہد ہے جو زہر مار راہ میں ہے

پتا یہ کوچۂ قاتل کا سن رکھ اے قاصد !
بجائے سنگِ نشاں اِک مزار راہ میں ہے

پیادہ پا ہوں رواں سوئے کوچۂ قاتل
اجل مری مرے سر پر سوار راہ میں ہے

چلا ہے تیر و کماں لے کے صید گاہ وہ تُرک
خوشا نصیب وہ جو جو شکار راہ میں ہے

تھکیں جو پاؤں تو چل سر کے بَل ، نہ ٹھہر آتش
گلِ مراد ہے منزل میں ، خار راہ میں ہے

۱۷۴

[1]عدم سے جانبِ ہستی تلاشِ یار میں آئے
ہوائے گل میں ہم کس وادیِ پُرخار میں آئے

نہ چیں اے ترکِ بے رحم ابروے خم‌دار میں آئے
لگا خامی کا دھبّا ، بل جہاں تلوار میں آئے

اُٹھائے بارِ عشق اِس عالمِ غدّار میں آئے
کہاں سے ہم کہاں پکڑے ہوئے بیگار میں آئے

اشارہ ہے یہی اُن کے لبِ شیریں کے خالوں کا
سلانے کو نمک بسم شربتِ دیدار میں آئے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۸۲ ، نولکشور قدیم ص ۲۵۷ ، جدید ص ۳۰۰ -

نہ دی بو ایک نے اے گلبدن ! تیرے پسینے کی
ہزاروں عطر کھنچ کر طبلۂ عطّار میں آئے

کمندوں سے نہیں کم سبحہ و زنّار کے حلقے
پھنسے وہ جو فریبِ کافر و دیں‌دار میں آئے

خریداروں میں عاشق اپنے ناموں کو ہیں لکھواتے
تماشا ہے ، وہ یوسف بن کے ہیں بازار میں آئے

نموے سبزۂ نورس نہیں اس روے رنگیں پر
جناب خضر بہرِ سیر ہیں گلزار میں آئے

ہر اک حلقے میں ان زلفوں کے ہیں سوسو دلِ عاشق
بہت سے مشتریِ مشک ہیں تاتار میں آئے

بہارِ حسن دکھلائی نہ مشتاقوں کی آنکھوں کو
نہ نکلے گھر سے تم ، گل باغ سے بازار میں آئے

رہا اے بادشاہِ حسن تو جس قصرِ عالی میں
ہما بہرِ سعادت سایۂ دیوار میں آئے

گئے جس بزم میں ، روشن چراغِ حسن سے کر دی
بہارِ تازہ آئی ، تم اگر گلزار میں آئے

وضو ہوتے ہیں مے سے ، خشتِ خم پر شکر کے سجدے
نمازی لوگ بھی ہیں خانۂ خمّار میں آئے

کیا ہے حسن نے سلطانِ خوباں ، چاہیے تم کو
ملے داد ان کی ، فریادی جو ہیں سرکار میں آئے

اڑے ہوش اپنے نظّارے میں اے گل تیری صورت کے
غش آیا جب مقامِ نرگسِ بیمار میں آئے

جوانی ہے کہاں اب یار کی وہ صورت طفلی
ہوئے ڈھنگ اور ہی ، رنگ اور ہی رخسار میں آئے

مشقت کر کے دیوانے نہ تھے جو بے سبب آئے
پری کو ڈھونڈھنے اس قصرِ مینا کار میں آئے
بجا کرتے ہیں نحوی احتمالِ صدق و کذب آتش
بہت سے مختلف احوال بھی اخبار میں آئے

۱۷۵

[1]معرفت میں تیری ذاتِ پاک کے
اڑتے ہیں ہوش و حواسِ ادراک کے
گل کھلے پرزے اڑا پوشاک کے
پاؤں پھیلا تا بدامن چاک کے
نام لے سکتے نہیں محبوب سے
کیا کہیں کشتے ہیں کس سفاک کے
وہ گریباں آگ میں رکھ دیجیے
موسمِ گل میں جو ہوں بے چاک کے
خوش نویسوں سے میں لکھواتا ہوں وصف
لام سی کاکل ، الف سی ناک کے
قید رکھتے موسمِ گل کی نہیں
ولولے تیرے گریباں چاک کے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۸۳ ، نول کشور قدیم ص ۲۵۵ ، جدید ص ۴۰۲ - نولکشور و لاہور کی یہ آخری غزل ہے اور دیوان کا دوسرا حصہ یہاں ختم ہو جاتا ہے - لیکن علی بخش ایڈیشن میں چودہ غزلیں اور بھی ہیں - میرا خیال ہے کہ نولکشوری ایڈیشن کلیات آتش طبع اول پر مبنی ہے - رجب علی نے ۱۲۶۸ھ میں جب دوسرا ایڈیشن مرتب کیا تو بہت سے کلام کا اضافہ ہوا جسے نسخہ نولکشور کے مؤلفین نے درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور دیوان ناقص ہی چھپتا رہا -

صیدگاہِ عشق میں مُردار ہے
صید جو قابل نہیں فتراک کے
مست ہو کر جائیں گے اے سغبچو!
آئے ہیں بنت العنب[1] کو تاک کے
تیرے دیوانوں سے بننے کی نہیں
آگ کی پریاں ہیں انساں خاک کے
توڑنے والے گلِ زنبق کے ہیں
کاٹنے والے چمن کی ناک کے
بحرِ الفت میں بہارِ باغ ہے
پھولتے ہیں دست و پا تیراک کے
نیشکر کی پور اے شیریں دہن
پھیکی ہے آگے تری مسواک کے
آفریں! صد آفریں! دستِ جنوں
خوب ہی لتّے لیے پوشاک کے
عشق میں رہتے ہیں آتش سامنے
بے مروّت، بے وفا، بےباک کے

۱۷۶

[2]بخارِ دل ہے گھر آیا سحاب کے بدلے
اک آگ ہے کہ برستی ہے آب کے بدلے

---

۱ - بنت العنب - انگور کی بیٹی، شراب -
۲ - یہ غزل کلیات آتش طبع علی بخش (ص ۲۸۳) کے حاشیے سے شروع ہوتی ہے اور مرتّب نے اس کا نمبر ۱۱۷ لکھا ہے - باقی مطبوعہ نسخوں میں یہ اشعار اور اس کے بعد کی غزلیں موجود نہیں -

دو داغ دوں میں مہ و آفتاب کے بدلے
فلک سے لوں ستم بے حساب کے بدلے
لہو پلاتی ہے فرقت شراب کے بدلے
کھلاتی ہے غم و غصہ کباب کے بدلے
صباحِ حشر بھی آنکھوں کو میں نہ کھولوں گا
خیالِ یار ہے بند ان میں خواب کے بدلے
تمھارے کان کی بجلی تمھاری زلف ہے بس
شراب پینے کو برق و سحاب کے بدلے
زمانہ رہتا نہیں ایک حال پر اے دوست !
کبھی تو لطف بھی فرما ، عتاب کے بدلے
عجب ہے کیا جو گلا کاٹ کے مریں عاشق
ملی ہے تیغ انھیں حُسنِ شباب کے بدلے
نہ دوں کبھی ترے بالوں کے چاند سورج کو
فلک جو مانگے مہ و آفتاب کے بدلے
عزیز ہم سے کرو آب تیغ تم افسوس
پلاتے پیاسے کو شربت ہیں آب کے بدلے
اشارہ حسنِ خدا دادِ یار کا ہے یہی
گناہِ عشق کیا کر ثواب کے بدلے
یہ آرزو ہے کہ زینِ سمندِ یار میں ہوں
ہماری آنکھوں کے حلقے رکاب کے بدلے
یہ طولِ عمر ہمیں دے رہا ہے ایذائیں
کسے قبول تھی پیری شباب کے بدلے
تمھاری تیغ جو دریاے خوں کرے جاری
سر اور تن بہیں موج و حباب کے بدلے

پڑھا ہوں علمِ محبت میں روز بسم اللہ
کتابی چہرہ ہے دیکھا کتاب کے بدلے
لگی ہے دیر بہت نامہ بر کے پھرنے میں
وہ خود ہی آتے ہیں ، خط کے جواب کے بدلے
ہؤا 'میں دخترِ رز پر جو غش تو ساقی نے
دیے شراب کے چھینٹے ، گلاب کے بدلے
اسیر ہم ہوئے ، سودا ہوا آسے **آتش**
دھرے گئے دلِ خانہ خراب کے بدلے

۱۷۷

'مضمون حسن و عشق نہیں کس غزل میں ہے
سنیے اگر تو لطف ہماری زٹل میں ہے
دارِ فنا سے اٹھ گئے کیا کیا نہ تاج دار
کسریٰ نہ طاق میں ، نہ فریدوں محل میں ہے
معشوق بن کے آئیں گے مجھ تک بلائے جاں
مہندی بندھی ہوئی ابھی پائے اجل میں ہے
خالِ رخِ حبیب کا ہے دل میں اپنے نقش
اس مور کے بھی ملکِ سلیماں عمل میں ہے
ہرچند قید رکھتے نہیں ہو مکاں کی تم
خالی جگہ تمھارے لیے ہر محل میں ہے
انجامِ کار کون سے آغاز کا نہیں
شامِ ابد نوشتۂ روزِ ازل میں ہے

---

۱ - یہ غزل (نمبر ۱۱۸) بھی صرف کلیات طبع علی بخش ص ۲۸۴ کے حاشیے پر ہے -

بے یار سیرِ باغ ہے بے لطف و بد مزہ
خوشبو نہ پھول میں ہے، حلاوت نہ پھل میں ہے
خاموش رہیے یا تو نہ تکرار کیجیے
کچھ لطفِ گفتگو نہیں رد و بدل میں ہے
شرِّ زمانہ سے نہیں بے عشق کے نجات
چاہے جو چین تو اسی حسنِ عمل میں ہے
روتا ہوں بسکہ میں رخِ رنگیں کی یاد میں
ہر طفلِ اشک دابے گلستاں بغل میں ہے
اے شاہِ حُسن تو نے جو پہلو کیا ہے گرم
بو سلطنت کی تیرے گدا کی بغل میں ہے
نیلوفر آنکھ ہے مرے دریائے حُسن کی
شبرنگ مردمک نہیں، بھنورا کنول میں ہے
بے صبر دل نہ عشق میں اس سیم بر کے ہو
مفلس ذلیل دیدۂ اہلِ دُوَل میں ہے
کیا ہاتھ اس نگار سے مرجاں ملائے گا
پنجہ کرے، یہ زور کہاں دستِ شل میں ہے
غنچے شگفتہ ہوتے ہیں، آتے ہی فصلِ گل
کپڑوں کے پھاڑنے کی بہار آج کل میں ہے
بے داغِ عشق کیوں نہ مرا دل بجھا رہے
اندھیر ہے چراغ نہیں جس کنول میں ہے
عاشق کے جذبِ دل کو بھی کچھ کم نہ جانیے
اس میں بھی وہ اثر ہے جو حُب کے عمل میں ہے
ہر دل میں منزلت ہے ترے داغِ عشق کی
خورشید کو شرف ہے تو برجِ حمل میں ہے

کیا بھاگتا ہے تیرِ حوادث سے ، جائے امن
فولادی قلعے میں ، ہے نہ سنگیں محل میں ہے
ہشیار رشک کرتے ہیں آتش کی چال پر
دیوانہ خوش پری لیے اپنی بغل میں ہے

۱۷۸

[۱]فصلِ گل میں کس کو عقلِ ذوفنوں درکار ہے
لالہ پُھولا ہے ، ہمیں داغِ جنوں درکار ہے
ہجر میں کس کو شرابِ لالہ گوں درکار ہے
چار چُلّو غم کے پی لینے کو خوں درکار ہے
تجھ سوا دنیا و مافیہا سے کچھ مطلب نہیں
تو ہمیں اے کائناتِ کاف و نوں درکار ہے
پاؤں بسم اللہ کَہہ کر رکھ طریقِ عشق میں
فال کی حاجت ، نہ کچھ اس میں شگوں درکار ہے
دیدہ و دل دونوں صورت آشنائے یار ہوں
صاف آئینے سے بیرون و دروں درکار ہے
کوچۂ جلّاد میں گردن جھکا کر رکھ قدم
یہ ادب کا ہے محل ، یاں سر نگوں درکار ہے
واردِ ماتم سرائے دہر ہوں َمیں ، مجھ کو کیا
محفلِ عشرت میں چنگ و ارغنوں درکار ہے
زندگی کی گور میں اے دل نہ ہوں بے تابیاں
راہ میں تحریک ، منزل میں سکوں درکار ہے

---

۱ - کلیات آتش ، حصہ دوم ، ص ۳۸۵ - سلسلے کا ہے نمبر ۱۱۹ -

بد زبانی سے تمھاری یہ ہمیں ظاہر ہؤا
خوب صورت کے لیے خوے زبوں درکار ہے
درہمِ داغِ جنوں دے موسمِ گل بے شمار
حوصلے سے مجھ کو یہ دولت فزوں درکار ہے
یہ لبِ جاں بخش و چشمِ یار سے ظاہر ہوا
دل فریبی کو بھی اعجاز و فسوں درکار ہے
بعد مدّت کے قدم رکھنا ہے قصرِ یار میں
اب ہمیں اِستادگی مثلِ ستوں درکار ہے
سخت جاں ہوں ایک دو سے نیم جاں رہ جاؤں گا
قتلِ عاشق کو حسینوں کا قشوں درکار ہے
سرو سے قد کا ترے دیوانہ ہوں او سبزہ رنگ
سر پٹکنے کو زمرّد کا ستوں درکار ہے
چاہتا ہوں واسطے عقبیٰ کے میں حسنِ عمل
کس کو آتش دولتِ دنیاے دوں درکار ہے

۱۷۹

[1]موسیٰؑ و فرعون میں کچھ فرق ، غافل ! چاہیے
آدمی کو امتیازِ حق و باطل چاہیے
انتظامِ ملکِ وحشت کے لیے دل چاہیے
اس علاقے کے لیے دیوانہ عامل چاہیے
حسن کا دکھلائے جلوہ عشق کامل چاہیے
شہد سے شیریں ہو ، یہ زہرِ ہلاہل چاہیے
بوسۂ خط یار سے ہو جائے حاصل ، چاہیے
اس عبارت میں سے نکلے مطلبِ دل چاہیے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ، جلد دوم ، ص ۲۸۵ - غزل نمبر ۱۲۰ -

دید کو تجھ سے کہ روشن دیدہ و دل چاہیے
لَو ، تری پروانے کو اے شمعِ محفل چاہیے

خوش نما ہے نازِ لیلیٰ سے تری کافر ادا
چاہیے تو تجھ کو اے شیریں شمائل چاہیے

لشکرِ اندوہ و غم سے سامنا ہے عشق میں
خونِ دل بھی اشک کے ہو جائے شامل چاہیے

کون ہے تجھ سا سزاوارِ پرستش دوسرا
بندہ پرور! سر ترے سجدے کے قابل چاہیے

یہ کھلا تن پروری سے اہلِ دنیا کی ہمیں
چار دیوارِ عناصر کو بھی کہگل چاہیے

دل ہے جس لیلیٰ کا مجنوں اس سے رکھتا ہوں غرض
ناقے سے مطلب ہے کچھ مجھ کو نہ محمل چاہیے

نقشِ پائے رفتگاں سے یہ صدا ہے آ رہی
دو قدم میں راہ طے ہے ، شوقِ منزل چاہیے

اشکِ خونی اس قدر شوقِ شہادت میں بہا
پیرہن ہو جائے تیرا رختِ بسمل چاہیے

کافی اپنے واسطے ہے ، جو ہے قسمت میں لکھا
کچھ نہ باقی چھوڑ جانا ہے ، نہ فاضل چاہیے

نزع میں آ کر مرے بالیں پہ اس بت نے کہا
حقِ تعالیٰ پر نظر ہنگامِ مشکل چاہیے

جنبش اس ابرو کی کس کس کا نہیں کرنے کی خوں
سر ہزاروں ہوں گے ، خیرِ تیغِ قاتل چاہیے

اور کچھ تجھ سے طلب ہم کو نہیں اے آسماں !
شعر گوئی کو زمینِ سیر حاصل چاہیے

کعبے میں جا کر خدا سے یہ دعا مانگوں گا میں
عشقِ بت میں سر کے ٹکرانے کو ساحل چاہیے
بے تصوّر دل مکانِ یار ہونے کا نہیں
بند کرنے کو پری شیشے میں ، عامل چاہیے
سامنا ہونا ہے تُرکِ تیغ زن کا ایک دن
دل کو بے تابی سے مشقِ رقصِ بسمل چاہیے
دیدہ و دل بھی ترے شیدا ہیں اے زہرہ جبیں !
ان فرشتوں کے لیے بھی چاہِ بابل چاہیے
پیشتر منزل سے مر جا اشتیاقِ گور میں
بھول جائے یاد خلوت میں یہ محفل چاہیے
باوجودِ قرب دریا ہے دُرِ مقصود گم
خاک سر پر ڈالنی یاں مثلِ ساحل چاہیے
آسماں پر روح ، تن زیرِ زمیں کیونکر نہ جائے
اپنی اپنی گور ، اپنی اپنی منزل چاہیے
شعر گوئی کے لیے جمعیّتِ خاطر ہے شرط
اس مشقّت کے لیے مزدور خوش دل چاہیے

۱۸۰

[1] کیا کام خاصگانِ خدا کو ہے عام سے
غافل ہے یہ خلاف جماعت امام سے
رہتی ہے ہمسری انھیں ماہِ تمام سے
دکھلاتے ہیں وہ چاند سی صورت کو شام سے

---

۱ - یہ غزل بھی صرف کلیاتِ طبع علی بخش میں ہے اور ص ۲۸۶ کے متن و حاشیہ سے ہوتی ہوئی ص ۲۸۷ پر ختم ہوتی ہے ۔

نفرت ہوئی ہے دل کو یہ فعلِ حرام سے
قے آتی مجھ کو دخترِ رز کے ہے نام سے
ساقی چھکا ہمیں بھی مئے لعل فام سے
ہم کو بھی چشم داشت ہے چشمک کی جام سے
کھنچنے دو ، دورِ یار کو ماہِ تمام سے
ہمّت بلند چاہیے دو ہاتھ بام سے
چمکے گا وہ رخ اور خطِ مشک فام سے
فوق اس سیہ قلم کو ہے سینے کے کام سے
غافل نہیں قضا و قدر اپنے کام سے
آ گلی ہی پڑتی ہے یہ سروہی نیام سے
باہر حساب سے کرمِ بے شمار ہے
باراں ہے ایک قطرہ ترے فیضِ عام سے
کیونکر شبِ فراق کٹی ، کچھ نہ پوچھیے
چلّائے نام صبح کا لے لے کے شام سے
بسمل کی طرح لوٹتے ہیں مست ، ساقیا !
شیشے سے ہوشیار ! خبردار جام سے
ابرو و چشم و زلف میں کیسا کیا ہیں صنعتیں
تصویر بے خبر ہے مصوّر کے کام سے
جس گھر سے تم نکلتے ہو ، ہوتا ہے گوش زد
شور الفراق کا در و دیوار و بام سے
تیرے قدم سے گھر میں مرے اے شبِ وصال
نورِ سحر کی روشنی ہوتی ہے شام سے
زلفوں سے بد بلا ہوئی چشمِ سیاہِ یار
شاہیں کے پنجے میں پھنسے ، چھوٹے جو دام سے

اے برہمن ! تجھے مری توقیر چاہیے
بُت پوجنے کو آیا ہوں بیت الحرام سے

بحرِ جہاں کے شور سے آتی ہے یہ صدا
منزل میں ہے جو کوچ کیا اس مقام سے

سر نامے سے زیادہ تر ان کا ہو رُو سیاہ
لکھتے ہیں غیر یار کو خط میرے نام سے

صیّادِ حُسن کھیلتا ہے جب شکارِ عشق
بُلبل کو پھانستا ہے رگِ گل کے دام سے

عریاں کو تیرے قید نہیں پیرہن کی ہے
یہ ذوالفقار رہتی ہے باہر نیام سے

سودائے زلف میں ہے مجھے جس قدر خوشی
شادی نہ روزہ دار کو آتی ہو شام سے

شاعر ہوں ، کیا سمجھ کے ہنسوں بادہ خوار پر
قولِ دروغ کم نہیں فعلِ حرام سے

اللہ رے شان و عظمتِ بت خانہائے ہند
ہر آستاں بلند ہے کعبے کے بام سے

آوازِ دوست آتی ہے پردے سے ساز کے
ظاہر ہے وجدِ صوفیِ عالی مقام سے

گردش میں رہتے ہیں تو رہیں ہفت آسماں
جنبش نہ ہوگی قطب کو اپنے مقام سے

مغرور کس قدر ہیں حسینانِ روزگار
عاشق کو کم سمجھتے ہیں اپنے غلام سے

بُت خانے سے خدا کی طرف جو پھرا ہوں میں
گھی کے چراغ جلتے ہیں مسجد میں شام سے

حیران ہوں نکل کے کدھر سے وہ جائیں گے
مسدود راستے ہوئے ہیں اژدہام سے

اے مرغِ دل ہے فاصلہ اس زلف و خال میں
دانہ ترے نصیب کا باہر ہے دام سے

رغبت کی آنکھ ڈالیے اس بحرِ حُسن پر
دریا کو دیکھیے نگہِ تشنہ کام سے

کیفیّتِ شراب ہے امرد کے حسن میں
کیا کیا جواں ہیں مست اِس انگورِ خام سے

تیرا شہیدِ ناز ہوں، لینے کو آئیں گے
ارواحِ مومنیں مجھے دارالسّلام سے

گُھٹّی میں دی ہے دایہ نے مجھ کو شرابِ ناب
میں آشنائے دخترِ رز ہوں مدام سے

زاہد ! مزا نہ پوچھ شراب و کباب کا
دنیا کا لطف ہے اسی آب و طعام سے

اللہ رے قدر و منزلتِ پیشوائے دیں
چار انبیا ہیں مقتدیانِ امام سے

دل سوختوں سے گرمیِ حسن و جمال پوچھ
آگاہ یہ کباب ہیں آتش کے کام سے

۱۸۱

[1]گستاخ بہت شمع سے پروانہ ہوا ہے
موت آئی ہے، سر چڑھتا ہے، دیوانہ ہوا ہے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش، ص ۲۸۷ - غزل نمبر ۱۲۲ -

آسیبِ پری جلوۂ جانانہ ہوا ہے
جس کو نظر آیا ہے وہ دیوانہ ہوا ہے

اس عالمِ ایجاد میں گردش سے فلک کے
کیا کیا نہیں ہونے کا ہے، کیا کیا نہ ہوا ہے

ساقی نے چھکایا ہے پلا کر جو پیالہ
جمشید گدائے درِ مےخانہ ہوا ہے

خالِ رخِ روشن سے یہ روشن ہے الٰہی
قدرت سے تری آگ میں یہ دانہ ہوا ہے

تا صبح شبِ ہجر میں جھپکی نہیں آنکھیں
نیند اُڑ گئی ہے، دردِ سر افسانہ ہوا ہے

حیرت ہے رخِ روشنِ محبوب کا افشاں
کیا ذرّہ و خورشید میں یارانہ ہوا ہے

خوش رکھتا ہے زنداں میں بھی مجنوں کو تصوّر
لیلیٰ کا سیہ خیمہ، سیہ خانہ ہوا ہے

بُلبل نے لحد پر ہیں مری پھول چڑھائے
موجود لیے شمع کو پروانہ ہوا ہے

نالوں سے مرے کون نہ تھا تنگ مرے بعد
کس گھر میں نہیں سجدۂ شکرانہ ہوا ہے

یاد آتی ہے مجھ کو تنِ بےجاں کی خرابی
آباد مکاں کوئی جو ویرانہ ہوا ہے

مطلب کی کہی ہے جو کبھی یار سے ہم نے
نامحرم و ناواقف و بیگانہ ہوا ہے

زنجیر کا خواہاں نہ ہو سرکارِ جنوں سے
بےقید ہوا ہے وہ جو دیوانہ ہوا ہے

اللہ رے مرے عہد میں یوسف کی گرانی
قیمت نہ ہوئی تھی سو وہ بیعانہ ہوا ہے
ہندو و مسلماں ہیں ترے سجدے کو آئے
مسدود درِ کعبہ و بُت خانہ ہوا ہے
منہ دھو کے وہ زلفوں کو بنا کر ہیں نکالے
آئینے کو دیکھا ہے طلب شانہ ہوا ہے
اک طفل کو دکھلا کے کیا کُشتہ فلک نے
کس پیر سے کیا کارِ جوانانہ ہوا ہے
سچ تو یہ ہے آتش ، نہیں تجھ سا کوئی شاعر
شہروں میں ترے جھوٹ کا افسانہ ہوا ہے

۱۸۲

اُبتوں سے حسرتِ بوس و کنار باقی ہے
ہنوز مرحلۂ کوہسار باقی ہے
یہ مرمٹوں کا ترے یادگار باقی ہے
کوئی کوئی جو نشانِ مزار باقی ہے
تپِ جنوں سے فقط جسمِ زار باقی ہے
بدن کے جامے سے یہ ایک تار باقی ہے
حرارت آتشِ گل میں ہزار باقی ہے
یہی سمجھ کہ دو ہفتہ بہار باقی ہے
غبارِ جسم ، نہ جانِ نزار باقی ہے
سوار ہے ، نہ تو گردِ سوار باقی ہے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ، ص ۲۸۷ - غزل نمبر ۱۲۳ -

ہوا ہے حشر، نہ خورشیدِ حشر ہے نکلا
قیامتِ رخ و بالائے یار باقی ہے

بلند و پستِ جہاں سے گزر چکا ہوں کہاں
چڑھاؤ روح کو، تن کو آثار باقی ہے

وہی ہے حسنِ سفید و سیاہ کا عالم
وہی دو رنگیِ لیل و نہار باقی ہے

دکھا رہے ہیں گل و لالہ اپنا اپنا رنگ
طلسم بندیِ نقش و نگار باقی ہے

چمن کی سیر سے پھرتا ہے مست ہو کے، ہمیں
کنارِ جُو بطِ مے کا شکار باقی ہے

دکھائی دیں گے نہ یہ زرد زرد پتّے بھی
خزاں کی بھی کوئی دس دن بہار باقی ہے

اِدھر بھی آنکھ اٹھا کر ہے دیکھنا لازم
نگاہِ لطف کا امیدوار باقی ہے

سمجھ کم ان کو جو کچھ کھینچتے ہیں خمیازے
جوانی نشّہ ہے، پیری خمار باقی ہے

گئی ہے روح یہ کہتی ہوئی بدن میں سے
فنا ہے غیر، جو ہے ذاتِ یار باقی ہے

نیام میں ابھی قاتل نہ کیجیو شمشیر
جھکائے گردن اک امیدوار باقی ہے

مٹا فساد کی بنیاد، نرم کر دلِ سخت
وجودِ سنگ ہے جب تک، شرار باقی ہے

کہا ہے کس نے نہ آہ و فغاں کرو آتش
اٹھاؤ جبر جو خود اختیار باقی ہے

۱۸۳

سرمہ[1] لگا کے یار نے ترچھی نگاہ کی
موت آئی پھر کسی نہ کسی بے گناہ کی

آمد ہمارے گھر میں ہے اس رشکِ ماہ کی
دعوت فقیر خانے میں ہے بادشاہ کی

خط سے رہی وہ آنکھ نہ اس رشک ماہ کی
سیدھی زوالِ حسن نے ترچھی نگاہ کی

آئینے میں جو شکل پر اپنی نگاہ کی
مجھ سے زیادہ یار نے حالت تباہ کی

دیکھی نہ شکل دلبرِ خورشید جاہ کی
حسرت رہی ملازمتِ بادشاہ کی

بو یار کی سنگھا کے صبا نے اڑائے ہوش
بادِ مراد نے مری کشتی تباہ کی

فصلِ بہار آئی ، مبارک ہو اے جنوں !
خار اور آبلے سے ملاقات راہ کی

ہوگا کبھی تو اس رخِ روشن کا سامنا
قلعی کھلے گی آئنۂ مہر و ماہ کی

الجھا میں حالِ دل کے جو کہنے میں تو کہا
لکنت زبان کرتی ہے جھوٹے گواہ کی

پھرنا شتاب لے کے خطِ شوق کا جواب
قاصد ! تجھے قسم ہے رسالت پناہ[ص] کی

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۸۹ - غزل نمبر ۱۲۳ ، صحیح ۱۲۴ -

دل میں ہمارے جلوہ نما ہے خیالِ یار
بُرجِ شرف میں روشنی ہے مہر و ماہ کی
ناگفتنی ہے مہر و محبت کا ماجرا
شدت بیان ہو نہیں سکتی ہے چاہ کی
صورت دکھائی خواب میں بھی تو کبھی کبھی
صحبت ہماری اُن کی رہی گاہ گاہ کی
ماتم کدے میں دہر کے وہ دردمند ہوں
بےدرد نے بھی سن کے مرا نالہ ، آہ کی
پھرواں رہا ہے اس شہِ خوباں کے درِ گوش
فریاد جب سنی ہے کسی داد خواہ کی
دیوانوں کو رعایتِ اطفال چاہیے
سردار قدر کرتے ہیں کیا کیا سپاہ کی
کہتے ہیں تیرگی شبِ دیجور کی جسے
چشم و چراغ ہے مرے روزِ سیاہ کی
مائل ہے طوفِ کعبۂ رُو کا نقاب یار
تدبیر پہلے کیجیے اِس سدِّ راہ کی
پائی سزا گناہ نہ کرنے کی روزِ حشر
پوچھی گئی نہ بات کسی بےگناہ کی
کھنچتا ہے سوے یار دلِ زار یوں مرا
حالت جو کہرُبا کی کشش سے ہو کاہ کی
نکلا ہے خط جو اس رخِ رنگیں کے گردوپیش
گل سے سوا نمود ہوئی ہے گیاہ کی
مجھ ناتواں کی خاک جو اس میں ہوئی شریک
اٹھ اٹھ کے بیٹھ بیٹھ گئی گرد راہ کی

نالاں نہیں دل اپنا زنخدانِ یار میں
آواز آ رہی ہے ، گرفتارِ چاہ کی

مژگانِ یار سے بھی ہے قاتل غبارِ خط
خوں ریز ہے سپاہ سے گرد اس سپاہ کی

چسپاں قبا ہی یار نہیں خوش نما تجھے
زیبندہ راستی سے کجی ہے کلاہ کی

رنگِ بہار ، بادِ خزاں نے اڑا دیا
سرخی نہ گل کی ہے ، نہ وہ سبزی گیاہ کی

آتش نہ پوچھ ہجر کی شب کس طرح کٹی
نالے سے دردِ سر جو ہوا ، تھک کے آہ کی

۱۸۴

[1]عنایت و کرم ابرِ بہار رکھتا ہے
ہرا بھرا چمنِ روزگار رکھتا ہے

جب آئے قابضِ روح اختیار رکھتا ہے
درِ فقیر نہیں چوب دار رکھتا ہے

چمن غریب دو ہفتہ بہار رکھتا ہے
بہار ہے وہ جو رخسارِ یار رکھتا ہے

تصوّرِ گل و گلشن ہزار رکھتا ہے
قفس میں بھی وہی نقش و نگار رکھتا ہے

بلا وہ خال ہے جو روے یار رکھتا ہے
یہ مور بھی اثرِ زہرِ مار رکھتا ہے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۸۹ ، غزل نمبر ۱۲۴ - معلوم ہوتا ہے کہ یہ آخری عمر کا کلام ہے -

فسوں کوئی ، نہ تو اعجاز ، یار رکھتا ہے
فریبِ حسن سے عاشق کو مار رکھتا ہے
دو نیم دل ، لبِ جاں بخشِ یار رکھتا ہے
دمِ مسیح ، دمِ ذوالفقار رکھتا ہے
وہ کون ہے جو نہیں حسنِ یار کا بندہ
جمالِ قدرتِ پروردگار رکھتا ہے
عجب ہے خال کا اے شعلہ رُو ترے منہ پر
سپند آگ میں کیوں کر قرار رکھتا ہے
کھلا یہ یار کے الطافِ غائبانہ سے
خیال بندے کا پروردگار رکھتا ہے
خفا جو ہیں کوئی اُن سے مری طرف سے کہے
اُمید عفو کی تقصیروار رکھتا ہے
عجب ہے کیا کہ جو بُت حالِ برہمی پوچھے
محال پر بھی خدا اختیار رکھتا ہے
محل ادب کا ہے ، ٹھکرا کے چل نہ قبروں کو
پیادہ ہو کے قدم یاں سوار رکھتا ہے
خدا کے حکم سے آئی ہے روح قالب میں
پری طلسم میں پروردگار رکھتا ہے
دروغ سے شعرا کے کھلا یہ حال ہمیں
وہ حق کہے جو نہیں خوفِ دار رکھتا ہے
خدا کا گھر اسے سنتے ہیں عارفوں سے ہم
جمیل کشورِ دل شہریار رکھتا ہے
کیا ہے موت نے شرِّ زمانہ سے محفوظ
پناہ میں مجھے کنجِ مزار رکھتا ہے

ہوا ہے عاشقِ مژگانِ یار طائرِ دل
گلا چھری کے تلے یہ شکار رکھتا ہے
جدا تو روح کو ہوئے دے جسمِ خاکی سے
یہی غبار ہے جو شہ سوار رکھتا ہے
تلاش رہتی ہے مضمونِ چشم کی شب و روز
خراب مجھ کو ہرن کا شکار رکھتا ہے
فضول خرچ ہوں ، ڈرتا ہوں ، دیکھیے کب تک
حساب میں مجھے روزِ شمار رکھتا ہے
پھنسا ہے زلف کے پھندے میں مرغِ دل جب سے
وہ حال ہے کہ جو بستہ شکار رکھتا ہے
سنی نہ یار نے اک ، غیر نے ہزار کہی
یہ سچ ہے ، جھوٹ نہیں اعتبار رکھتا ہے
اشارہ نرگسِ بیمارِ یار کا ہے یہی
طبیب کو بھی بیمار مار رکھتا ہے
نہ باغ باغ رہوں حسن و عشق سے کیونکر
بہارِ گل ہے جو دل خار خار رکھتا ہے
ہوا جو غصے سے منہ لال لال تو یہ کھلا
عتابِ یار بھی رنگِ بہار رکھتا ہے
وہی ہے حافظ اہلِ زمیں بھی جو عامل
زمیں کے گرد فلک کا حصار رکھتا ہے
سوال ہے مجھے تُرکوں سے زخمِ کاری کا
کوئی بھی ہمتِ عالی وقار رکھتا ہے ؟

نفس کی آمد و شد سے ہیں دست و پا تپتے[1]
نمود دم سے ہوا کے غبار رکھتا ہے

مریضِ عشق کو کیا دو گے شربتِ دیدار
جواں طبیب نہیں اعتبار رکھتا ہے

سوال بوسے کا ہم بھی کریں گے اے آتش!
سنا ہے خیر کی توفیق یار رکھتا ہے

۱۸۵

[2]ہنر فرشتے کا خاکی بشر نہیں رکھتے
پہنچتے اڑ کے، کریں کیا کہ پر نہیں رکھتے

نمود یار کی شمس و قمر نہیں رکھتے
یہ اعتبار کبھی سیم و زر نہیں رکھتے

حقیقت آدمی کی گاؤ خر نہیں رکھتے
بیاں میں لطف، زباں میں اثر نہیں رکھتے

شریکِ اشک جو لختِ جگر نہیں رکھتے
دکانِ عشق میں لال و گہر نہیں رکھتے

خوشا وہ مست جو دنیا میں گھر نہیں رکھتے
درونِ خانہ و بیرونِ در نہیں رکھتے

اشارہ دیدۂ بینا کا ہے یہی تجھ سے
سوا ترے کوئی مدّ نظر نہیں رکھتے

وہ بد مرض ہیں یہ عشق و جنوں کہ اپنے لیے
دوا میں اور دعا میں اثر نہیں رکھتے

---

۱ - یہ لفظ 'تلتے'، 'تلپتے' اور 'تپتے' پڑھا جاتا ہے - بظاہر 'تپتے' ہی ہے -
۲ - کلیات طبع علی بخش ص ۲۹۰ - غزل نمبر ۱۲۵ -

وہ جھالرے ترے کانوں کے اے پری رُو ! ہیں
فرشتے ایسے جواہر کے پر نہیں رکھتے
خدا کو اہلِ توکل ہیں جانتے رزّاق
سحر کے واسطے ہم شب کو دھر نہیں رکھتے
کھلا یہ گیسو و رخسارِ نازنیناں سے
طلسمِ حسن یہ شام و سحر نہیں رکھتے
بُتوں کے جور و جفا سے جو رہتے ہیں نالاں
مگر یہ لوگ خدا پر نظر نہیں رکھتے
نہ کس کے باندھ سکیں جس کو قتلِ عاشق پر
حسین اِتنی تو پتلی کمر نہیں رکھتے
سعادتِ ابدی سے وہ جو کہ ہیں مایوس
مشیّتِ ازلی کی خبر نہیں رکھتے
مَلی ہے پاؤں میں مہندی انھوں نے پہلے پہل
زمیں تو کیا ہے، قدم عرش پر نہیں رکھتے
سمجھ کم اُس کو جو کچھ ہو بتوں سے بے رحمی
خدا کا خوف یہ بےداد گر نہیں رکھتے
مسافرانہ بسر کر، اشارہ کرتے ہیں
کمر بندھی ہوئی یہ نیشکر نہیں رکھتے
نہ خوفِ دُزد، نہ ہے بیمِ حاکمِ ظالم
ہزار شکر کہ ہم سیم و زر نہیں رکھتے
ہر ایک پھول ہے نرگس کا دیدۂ بینا
ریاضِ حسن کے گل گوش کر نہیں رکھتے
علاقہ جسم سے جس وقت تک ہے، خام ہے روح
لگاؤ شاخ سے پختہ ثمر نہیں رکھتے

بتوں کے حسن کی خاطر بھی اک فضیلت ہے
کتابی چہرہ ہے ، قرآں اگر نہیں رکھتے

عجب کی جا ترے بالوں کے چاند سورج ہیں
یہ اتّفاق تو شمس و قمر نہیں رکھتے

نہیں ہے جن کو حلاوت کلامِ شیریں سے
وہ بد مذاق ، مذاقِ شکر نہیں رکھتے

گئی عدم کو یہ ہستی سے روح کہتی ہوئی
جریدہ روزِ قفائے سفر نہیں رکھتے

نہ دیجیے لبِ لعلیں سے گالیاں مجھ کو
اگرچہ لعل ہیں پتّھر ، شرر نہیں رکھتے

نہ ہو جو روح تو پھر جسم کس شمار میں ہے
حساب میں صدف بے گُہر نہیں رکھتے

زباں کو بند سخن گوئی سے کر ، اے آتش !
یہ بیت بحثی کا ہم دردِ سر نہیں رکھتے

۱۸۶

گور میں دل سے خیالاتِ جہاں دور رہے
وہ دیار ، اور وہ بستی ، وہ مکاں دور رہے

عشرت آباد سے آفاتِ جہاں دور رہے
برہمی بزم سے ، گلشن سے خزاں دور رہے

فطرت پیر سے لازم ہے جواں دور رہے
تیر کو پیش کرے ، آپ کماں دور رہے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش ، ص ۲۹۱ -

ایک دم دل سے نہ جو جانِ جہاں دور رہے
حیف آنکھوں سے وہ موجود و عیاں دور رہے
دلِ احباب سے فریاد و فغاں دور رہے
چیں جبیں سے تری اے راحتِ جاں دور رہے
روح کو قالبِ خاکی سے نکل چلنے دے
لا مکاں سے بہت اے قیدِ مکاں دور رہے
اتفاق ابرو و مژگاں کا ہے شر کی بنیاد
خیر ہے، تیر سے جب تک کہ کماں دور رہے
نفع ان سخت نہادوں سے نہیں غیرِ ضرر
بیچ میں پڑنے سے دانتوں کے زباں دور رہے
یاد فرماتے نہیں سامنے دس دس دن تک
بھول جاتے ہیں وہ اک آن جہاں دور رہے
تلخ کامی دمِ نزع بھی شیریں ہو جائے
زندگی میں جو حلاوت سے زباں دور رہے
اے زباں! ہجر کی شب کا نہ ہو افسانہ بیاں
ہول دل سے ہو ایسا خفقاں دور رہے
پیشِ منعم نہیں کم مایہ کی عزت ہوتی
آبرو چاہے تو دریا سے کنواں دور رہے
بند کیں خوابِ اجل نے مری آنکھیں **آتش**
وہ تماشائے جہانِ گزراں دور رہے

۱۸۷

اندیشۂ[۱] صیاد نہ یاں بیمِ خزاں ہے
بلبل مرے گلشن کا ہر اک سیف زباں ہے

۱ - کلیات طبع علی بخش، ص ۲۹۱ - غزل نمبر ۱۲۷ -

پہلو میں مرے دل نہیں اے اہلِ جہاں ہے
بندہ ہوں میں جس کا، یہ اُس آقا کا مکاں ہے
بے تیرِ مژہ ابروے یار آفتِ جاں ہے
تلوار کی بھی طرح سے چلتی یہ کماں ہے
واں اشک فشانی ہے، نہ یاں شور و فغاں ہے
کچھ ہولِ دل اُن کو ہے، نہ مجھ کو خفقاں ہے
قد سا ترے اے یار! نمودار کہاں ہے
شمشاد نہ گلشن میں، نہ لشکر میں نشاں ہے
غم خانۂ عاشق میں بھی شادی کا سماں ہے
نوبت نہیں تو نوبتِ فریاد و فغاں ہے
پہنچے جو تری کُنہ کو اے ذاتِ مقدّس
اندیشۂ جبریل سے بھی وہم و گماں ہے
مجھ زار سے کھنچنے کا نہیں رنجِ جدائی
کمزور کماں کش ہے، زبردست کماں ہے
دل دولتِ دنیا سے نہ ہو زر کی طرح سرخ
مسجد ہو طلائی تو قیامت کا نشاں ہے
شیخی و مشیخت نہیں مے خانے میں چلتی
یاں پگڑی اُچھلتی ہے، خراباتِ مُغاں ہے
ہو ہی رہے گا گوش زدِ گل کوئی نالہ
بُلبل بھی نہ خاموش رہے، منہ میں زباں ہے
آواز یہی کوچۂ قاتل سے ہے آتی
جلّاد ہے موجود، گنہ گار کہاں ہے؟
مستوں کو بلندی نہ دکھا اے فلک دوں
اونچی ترے گنبد سے ہر اک مغ کی دکاں ہے

دکھلاتے نہیں بھمن و دمے میں بھی منہ اپنا
زرد ایسی بہارِ چمنستاں سے خزاں ہے
فردوس بھی بستی ہے مگر اہلِ دول کی
جنّت میں جو گھر ہے سو جواہر کا مکاں ہے
دنیا سے گزرنا سفرِ مصر ہے ہم کو
چاہِ لحد اپنے لیے یوسف کا کنواں ہے
لختِ دلِ عاشق نہیں یہ آنسوؤں کے ساتھ
یوسف کے لیے قافلۂ اشک رواں ہے
نالے کی کسی قدِّ خمیدہ سے ہے امیّد
کیا تیر لگائے گی کبادہ جو کماں ہے
پھیرے گا نہ منہ معرکۂ عشق سے آتش
جاں بازی ہے کھیل اُس کو بہادر جو جواں ہے

۱۸۸

[1]گردن کو جھکائے صفِ احباب کھڑی ہے
اُس ترک کی تلوار پہ کیا بھیڑ بڑی ہے
پھیریں گے نہ منہ کو تری تلوار سے، قاتل!
ہم دل کے کڑے ہیں، وہ اگر منہ کی کڑی ہے
چرچے مرے نالوں کے عبث کرتی ہے بلبل
تو اپنی خبر لے، تجھے کیا میری پڑی ہے
کچھ عشق میں مجنوں ہی سوا ہے، نہ تو فرہاد
لیلیٰ ہی نہ چھوٹی ہے، نہ شیریں ہی بڑی ہے

---

۱ - کلیات طبع علی بخش، دیوانِ دوم، ص ۲۹۲ -

۱۸۹

[1]رخ کا پتا ملے ، جو وہ زلفِ رسا ملے
پوچھوں میں راہِ گنج ، اگر اژدہا ملے

بے صرفہ نوش کر نہ مجھے اے غمِ فراق
کھا اس طرح کہ تجھ کو ذرا کچھ مزا ملے

اے شاہِ حُسن ! ہوگی ترقی جہاں میں
لے ، جس قدر فقیروں کی تجھ کو دعا ملے

عشقِ بُتاں میں لطف اٹھایا ہے تُو نے کیا
آتش سے پوچھیے جو وہ مردِ خدا ملے

۱۹۰

[2]تنگ دامی نے نہ دم لینے کی فرصت دی مجھے
رہ گئی دیدِ رخِ صیّاد کی حسرت مجھے

دستِ حاجت کو کیا تیغِ قناعت نے قلم
گنجِ قاروں سے خدا نے دی بڑی دولت مجھے

شفقتِ پیرِ دبستاں سے ہوا ابتر میں طفل
سات دن کے میلے میں دی سیر کی رخصت مجھے

تا کجا کنجِ قفس میں سر کو پٹکوں میں اسیر
کھینچ اے موجِ نسیمِ گلشنِ جنّت مجھے

جوہرِ ذاتی ہے سوزِ سینۂ شوریدگاں
مثلِ ماہی داغ بن آتش ہوئی زینت مجھے

* * *

---

۱ - کلیات آتش طبع علی بخش ، ص ۲۹۲ -
۲ - یہ غزل مصحفی کے تذکرۂ 'ریاض الفصحا' کے صفحہ ۷ پر ملی ہے -

فردیات

[1]سوائے نام کے باقی اثر نشاں سے نہ تھے
زمیں سے دب گئے ، جھکتے جو آسماں سے نہ تھے

[2]یادِ ابروے صنم رکھتی ہے بے تاب مجھے
نیشِ عقرب ہوئی ہے میری رگِ خواب مجھے

کُشتہ ہیں مثلِ شمع ہم اپنے جلال کے
اقبال دن دکھاتا ہے ہم کو زوال کے

---

١ - کلیات طبع علی بخش (ص ٢٩٢) اسی شعر پر ختم ہے - اس کے بعد "تمت" لکھ کر تاریخِ وفات وغیرہ درج کی گئی ہے -
٢ - آخری دونوں شعر صرف "ریاض الفصحا" کے صفحہ ٧ پر ہیں - دیوان میں موجود نہیں -

مخمس

ابھڑک کے عشق کی سارے بدن میں آگ لگی
یہ شعلہ آہ کا نکلا ، دہن میں آگ لگی
ترے تو آتشِ رخ سے چمن میں آگ لگی
مری تو جان و جگر اور من میں آگ لگی
یہ رو رو کہتی تھی بلبل وطن میں آگ لگی

یہ کیا حنا تھی منگائی چمن سے شیریں نے
اور اس کی خلق میں خوش بو اڑائی شیریں نے
ادھر تو ہاتھوں میں مہندی لگائی شیریں نے
مگر یہ سیر عجائب دکھائی شیریں نے
پھر اس طرف کو دلِ کوہ کن میں آگ لگی

کیا علاج اطبّا نے نارسائی سے
نہ آخرش ہوئی صحّت کسی دوائی سے
یہ رنگ جسم کا ہے تیری آشنائی سے
جلے ہے لاش مری آتشِ جدائی سے
مدد کو پہنچو صنم ! اب کفن میں آگ لگی

تمھاری چپ سے مری چپ زباں ہے ، بولو تو
لبوں کو دیکھ کے حیران جہاں ہے ، بولو تو

---

۱ - ”چمنِ بے نظیر“ صفحہ ۴۴۲ کے علاوہ دوسرے مآخذ میں یہ مخمس موجود نہیں ۔ قاضی عبدالودود صاحب فرماتے ہیں کہ شاید دیوان طبع اول لکھنؤ میں شریکِ اشاعت تھا ۔

مرے تو دل میں کچھ اور ہی گماں ہے ، بولو تو
یہ مسّی ہونٹوں پہ ہے یا دھواں ہے ، بولو تو
یہ سرخی پان کی ہے یا دہن میں آگ لگی ؟

بھرے تھے قمقمے ہر ایک گل کی جھولی میں
گلوں نے گھیر لیا تھا اسے ٹھٹھولی میں
بھڑکتے جاتے تھے ہنس ہنس کے رنگ چولی میں
گلال زلف میں ان کی پڑا تھا ہولی میں
تو لالہ بولا کہ مشکِ ختن میں آگ لگی

اگرچہ ہوتے ہیں گل رخ ، ہزار غصّے میں
پر اس طرح کی نہ دیکھی بہار غصّے میں
یہ وصف تجھ ہی میں دیکھا نگار غصّے میں
ہوا جو سرخ ترا چہرہ یار غصّے میں
تو بلبلوں نے ہی جانا ، چمن میں آگ لگی

ہوا اثر کششِ دل کا ، دل میں جب اس کے
تو خود بخود وہ لگا دوڑ کر گلے میرے
یہ سیر جس نے نہ دیکھی ہو ، آن کر دیکھے
طلب جو بوسہ کیا میں نے ، اس بھبھوکے سے
زباں تو شمع بنی اور دہن میں آگ لگی

ملا ہے نامِ خدا مجھ کو اک صنم ایسا
کہ جس کے دیکھے سے ہوتے ہیں سینکڑوں شیدا
میں بھولی باتوں کا اس کی بیاں کروں کیا کیا
شفق کو دیکھ کے کہتا ہے نوجواں میرا
عجب تماشا ہے ، چرخِ کہن میں آگ لگی

✶ ✶ ✶

واسوخت

آگے اک یار نہ تھا یار ، ترے یار تھے ہم
ہمدم و ہم سخن و مونس و غم خوار تھے ہم
لطف و اشفاق و عنایت کے سزاوار تھے ہم
مدّعی اب جو ہیں مجبور تھے ، مختار تھے ہم
چیں جبیں پر نہ تھی ، رنجش کی نہ یہ باتیں تھیں
مہربانی تھی ، شب و روز ملاقاتیں تھیں

انس تھا ہم سے تمھیں ، ہم تھے تمھارے سائل
عشق تھا حسنِ خداداد سے ہم کو کامل
غم و اندوہ و جدائی سے نہ واقف تھا دل
باغِ عالم میں مرادیں تھیں ہماری حاصل
سرو قد قُمریِ بے صبر و تحمّل ہم تھے
گل تمھارا رخِ گل رنگ تھا ، بُلبل ہم تھے

گوش زد یار ترے نام نہ تھا غیروں کا
لانے پاتا کوئی پیغام نہ تھا غیروں کا
خلوت و بزم میں کچھ کام نہ تھا غیروں کا
گِرد حلقہ سحر و شام نہ تھا غیروں کا

---

۱ - کلیات طبع علی بخش و نولکشور میں یہ واسوخت نہیں چھپی - میں نے یہ متن گلدستۂ نازنیناں (مولوی کریم الدین) کے صفحہ ۲۴۷ - ۲۵۲ اور چمنِ بے نظیر کے حاشیہ صفحہ ۲۵۵ - ۲۶۷ سے نقل کیا ہے -

دامنِ پاک سے گردِ نجس آگاہ نہ تھی
کوچہ گردوں کو طبیعت میں تری راہ نہ تھی

دلبری اپنی تجھے رہتی تھی منظور اے دوست
ایک دم آنکھوں سے ہم ہوتے نہ تھے دور اے دوست
دشمن اس طرح سے پھرتے نہ تھے مغرور اے دوست
جو خدا چاہے کرے ، بندہ ہے مجبور اے دوست

پاس ہوتے ہیں وہ جو دور پڑے رہتے تھے
بیٹھتے ہیں وہ برابر جو کھڑے رہتے تھے

گفتگو چھیڑ کی کرتے ہو سخن سازوں سے
پہروں سرگوشی رہا کرتی ہے غمّازوں سے
حالِ دل کا ہے بیاں تفرقہ اندازوں سے
صحبت اب آن رہی ہے خلل اندازوں سے

فرق آیا حرکاتوں میں ، خدا خیر کرے
"نہ" نکلنے لگی باتوں میں ، خدا خیر کرے

جو کڑی کہتے تھے ہم ، تم پہ آسے سہتے تھے
سخت کہتے تھے تو سن کر اسے چپ رہتے تھے
رونے لگتے تھے نہ یوں ، پھوٹ نہ یوں بہتے تھے
اس مروت پہ تمھاری یہی ہم کہتے تھے

اس پہ قربان رہیں گے ، اسے چاہیں گے ہم
منہ سے نکلا ہے جو کچھ اس کو نباہیں گے ہم

کوئی آ سکتا نہ تھا اپنے سوا [illegible]حت میں
دوسرے کو نہ رسائی تھی تری خـ[illegible]ت میں
مختصر قصہ ہمیں ہم تھے ہر اک [illegible]ت میں
انجمن میں ہمیں ہوتے تھے ، ہـ[illegible] میں

مصحفِ رخ کو سمجھتا نہ تھا ایماں کوئی
خالِ ہندو کا نہ عاشق تھا مسلماں کوئی

کیسی تدبیر تمھاری ہے یہ کیسی تجویز
نہ رہی آپ کو ہرگز کس و ناکس کی تمیز
چیز ایک اُن کو سمجھنے لگے ، جو تھے ناچیز
ہم سے دیکھا نہیں جاتا ہے ذلیلوں کو عزیز

اُن سے نیکی کرو ممنوں جو بد افعال نہ ہوں
لوٹیں وہ دولتِ دیدار جو کچھ مال نہ ہوں

عیش باغ آپ کبھی سیر کو جو جاتے تھے
خار ہوتا تھا جو بندے کو نہ واں پاتے تھے
غنچہ ساں تیری جدائی سے یہ تنگ آتے تھے
بھیج کر پیکِ صبا ، ڈھونڈھ کے بلواتے تھے

ہر روش پر مجھے تم ساتھ لیے پھرتے تھے
ہاتھ میں اپنے مرا ہاتھ لیے پھرتے تھے

شاذ تھا رنج ، مری جان ! کدورت نادر
حال پر اپنے توجہ تھی تمھاری ظاہر
کبھی خدمت میں جو ہوتے نہ تھے چندے حاضر
منتیں مانتے پھرتے تھے ہماری خاطر

روشنی مسجدوں میں جا کے کیا کرتے تھے
چلّے درگہوں میں دن رات بندھا کرتے تھے

روز و شب وہ جو رہا کرتی تھی صحبت ، نہ رہی
ہم نشینی کی جو خدمت تھی ، وہ خدمت نہ رہی
قصہ کوتاہ ہے وہ مہر و محبت نہ رہی
منہ دکھانے کو [illegible]ے ، کوئی صورت نہ رہی

التماس اتنی¹ تو رکھتے ہیں تری ذات سے ہم
پھر گیا تُو ، مگر اپنی نہ پھرے بات سے ہم

اٹھ گیا مہر و محبّت کا زمانے سے رواج
بیٹھے بیٹھے اس الجھ پڑنے کا کیا کیجے علاج
یوں تو معشوقوں کا ہوتا ہے تلوّن کا مزاج
پر نہ اتنا بھی کہ کل تھی سو طبیعت نہیں آج

یا ہمیں ساتھ رہا کرتے تھے اندر باہر
یا ہمیں ہیں کہ ہمیں حکم ہے "باہر باہر"

یہی طرزیں ہیں جو صاحب کی ، یہی ہیں انداز
ہم نے بھی عہد کیا دل سے بس اے بندہ نواز !
نہ کریں گھر کی طرف تیرے کبھی روے نیاز
اس طرف کعبہ بھی ہووے تو کریں ترک نماز

واں نکل جاویں جہاں کا نہ پتا ملتا ہو
نہ ملیں ، ملنے سے تیرے جو خدا ملتا ہو

جانِ جاں دل کا جلانا نہ تمھیں آتا تھا
بگڑی صورت کا بنانا نہ تمھیں آتا تھا
خندہ زن ہو کے رلانا نہ تمھیں آتا تھا
منہ کو دکھلا کے چھپانا نہ تمھیں آتا تھا

گرہ ابرو میں نہ تھی کاکلِ پیچاں کی طرح
زلفوں کا رخ نہ پھرا رہتا تھا مژگاں کی طرح

---

۱ - گلدستۂ نازنیناں میں ہے : "التماس اتنا تو -" چمنِ بے نظیر : "التماس اتنی تو رکھتے -"

خود فروشی کے مقیّد تھے ، نہ خود کامی کے
پختہ کامی کے چلن چلتے نہ تھے خامی کے
ہونٹ سلواتے تھے دم بازوں کے پیغامی کے
ننگ آتا تھا تمھیں نام سے بدنامی کے

پری و حور سے بھی حسن میں مغرور تھے تم
پاس تم کو نہ کسی کا تھا ، بہت دور تھے تم

سرمہ دیتے تھے تو آنکھوں کو چراتے تھے تم
پان کھاتے تھے تو منہ کو نہ دکھاتے تھے تم
مہندی ملتے تھے تو ہاتھوں کو چھپاتے تھے تم
پاؤں خلخال پہن کر نہ ہلاتے تھے تم

قتل سے عاشقِ صادق کے وفا مانع تھی
خونِ ناحق سے تمھیں شرم و حیا مانع تھی

جو خوشی خاطرِ نازک کی نہیں اس کا غم
کھائیے ترکِ محبّت کی ، جو کھانا ہے قسم
رہ نہیں سکنے کے بے شغل ، یہی کہتے ہیں ہم
ڈھونڈھ لیں گے کوئی زیبا صنم عیسیٰ دم

عشق بازی کا نہ بھولیں گے مزا ، یاد رہے
دل لگا دیں گے ، فرنگی محل آباد رہے

یہ غلط فہمی ہے "ہم سا کوئی محبوب نہیں"
کیا کوئی اور زمانے میں خوش اسلوب نہیں ؟
راست بازوں سے یہ ابرو کی کجی خوب نہیں
نہ سہی ، دوستی صاحب کو جو مطلوب نہیں

تم کو غیروں کی مدارات مبارک ہووے
ہم کو جس سے ہے ملاقات ، مبارک ہووے

ایسا شاہد ہے اب اللہ سے ہم کو مقصود
آشنائی جسے مقبول ہو ، رنجش مردود
سامنے اپنے تجھے کچھ نہ وہ سمجھے موجود
رخِ گل رنگ جو دکھلائے تو بھیجے وہ درود
نرگسی چشم کا حیرت سے تماشائی ہو
سنبلیں زلف کی بو سونگھ کے سودائی ہو

خون کرے دل کو تمھارے رگِ جاں سی وہ کمر
حلقۂ ناف کی تنگی سے رہو تنگ اکثر
ہاتھ ملتے پھرو ، پڑ جائے جو پاؤں پہ نظر
چھلّے ہاتھ آئیں تو گل کھایا کرو چھاتی پر
لعلِ لب دیکھے تو سر پیٹے بہت ننگ سے تُو
ہونٹ چاٹا کرے نامِ دہنِ تنگ سے تُو

خوبیِ گوش کرے اپنا تمھیں حلقہ بہ گوش
پھروں ہی رکھتّے وہ گردن کی صراحی مدہوش
دیکھ کر آئنہ ساں سینہ ہو حیرت سے خموش
حسن میں اس کے غرض ہو نہ سکے دوش بدوش
نقش دل پر ترے نقشِ دُرِ دنداں سے رہے
خار خار آٹھ پہر کاوشِ مژگاں سے رہے

مقر اس کا ہو وہ الزام تجھے جو جو دے
عرقِ شرم سے رخسار و جبیں دھو دھو دے
خندہ زن ہو کے حقیقت کو تری کھو کھو دے
آگے اس گل کے تو شبنم کی طرح رو رو دے
طعن و تشنیع وہی مہرلقا تجھ کو کرے
صورتِ ماہِ نو انگشت نما تجھ کو کرے

طنز آمیز کلامات سے آگاہ کروں
چھیڑ کر باتیں بتاؤں اُسے تجھ سے سمجھوں
اس کی زلفوں کی طرح کان تک اُس کے پہنچوں
جو فرشتے نے نہ پھونکی ہو سو اُس کے پھونکوں

دل جلاوے وہ ترا ، تجھ سے جگر جل نہ سکے
تجھ سے چل نکلے وہ ، تو اُس سے مگر چل نہ سکے

راہ پر لاؤں اسے ، راہ بتاؤں تجھ کو
لب بہ لب اس سے رہوں ، منہ نہ لگاؤں تجھ کو
تنگ آغوش میں لوں اور دکھاؤں تجھ کو
جس طرح تو نے جلایا ہے ، جلاؤں تجھ کو

شادماں خاطرِ نازک ہو ، تجھے غم ہووے
میرے گھر عید ، ترے گھر میں محرّم ہووے

گفتگو اتنے لیے تھی یہ شکایت انگیز
یاریِ غیر سے تا آپ کرو تم پرہیز
نقضِ بےجا کے لیے میرے لکھو دستاویز
متوجّہ ہو اِدھر کو نگہِ لطف آمیز

پھر پری ہو وہی تم اور وہی دیوانے ہم
پھر وہی شمع ہو تم اور وہی پروانے ہم

غیرِ معشوق کا نکلا ہے زباں سے جو نام
چھیڑنے کے لیے صاحب کے فقط تھا یہ کلام
حرفِ حق کہہ کے یہ واسوخت کو کرتا ہے تمام
مت برا مانیو اس بات کا ، آتش ہے غلام

دوستی غیر سے واللہ جو منظور بھی ہو
آنکھ اُٹھا کر نہ کبھی دیکھیں ، اگر حور بھی ہو

عبارتِ سرورق کلیات طبع ۱۲۶۳ھ

بہ توفیقِ خدائے سخن آفریں و نعتِ رسول سیدالمرسلین ۔ نسخۂ متبرکہ ، حسب الحکم مہر ذبل مطبع کثیر المنافع المسمیٰ بسلطان المطابع : حسبِ فرمائشِ برگزیدۂ ازلی شیخ رجب علی عفی عنہ ذنبہ الخفی و الجلی ۔ دیوان دوم خواجہ حیدر علی آتش ، مع الحاقِ غزلہائے بقیہ کہ بہ تفتیشِ بسیار فراہم آوردہ داخل نمودہ شد ، بمرتبۂ ثانیہ باہتمام کپتان مقبول الدولہ مرزا محمد مہدی علی خاں بہادر قبول ، بہ کارخانۂ علی بخش خاں مطبوع طبایع خاص و عام گردید ۔

خاتمة الطبع

۱۲۶۳ھ

للہ الحمد والمنة کہ دریں ایامِ فرحت فرجام دیوانِ اول خواجہ حیدر علی آتش بطبقِ فرمایش شفیقِ دلی، برگزیدۂ ازلی، فیاض فتوت مُتلی شیخ رجب علی سلمہ اللہ القوی، در کارخانۂ منِ ہیچمدان بندۂ سراپا خطا و نسیان علی بخش خاں در ماہِ ذی حجہ ۱۲۶۷ ہجری حلیۂ انطباع در برگرفتہ مطبوع طبایع خاص و عام گردید۔

(حاشیے پر ہے) :

قطعۂ تاریخ از نتائجِ افکار محبِ دلی شیخ اشرف علی المتخلص بہ اشرف

نبود در جہاں نظیر و عدیل
بحر جود و سخا و فیض و ھمم
آنکہ اسمش دو لطف می دارد
از رجب وز علی شدہ باھم

خواست دیوانِ آتشِ مرحوم
کہ شود طبع بارِ دیگر ہم
ز علی بخش خانِ نیک نہاد
کرد ایما بہ طبعِ آں پیہم

به ظهور آمد آنچه دل مي خواست
مشتری شد ز نقدِ دل عالم

چرخِ چارم زمین شعر گرفت
لطف برداشت عیسیٔ مریم[۴]

فکرِ تاریخ چوں نمود اشرف
"مخزنِ شعر" خامه کرد رقم

۱۲۶۷ھ

ایضاً

گر . . . . اقلیمِ سخن کهیے بجا ہے
استاد ہے ، عالی ہے بہت پایهٔ آتش

دیوان جو چھپا منہ سے یہ نکلی مرے تاریخ
مطبوع ہوا طبع کے سرمایهٔ آتش

(۱۲۶۳ھ)

تمت

تمام شد

تاریخِ وفات خواجہ حیدر علی آتش ، از طبعِ دبیرِ بے نظیر منشی مظفر علی اسیر

دلم از مرگِ آتش بود غم کش
ز آتش یافتم تاریخِ آتش

ز غم 'تا' و 'الف' خود را سہ تا ساخت
تپش از دامنِ شیں نقطہ انداخت

۱۲۶۳ھ

قطعۂ تاریخ دوست سراسر ذوق میر ولد حسن فوق

خواجہ صاحب نے قضا کی جس گھڑی
دارِ فانی سے سوے کوثر گئے
فوق نے تاریخ برجستہ کہی
لکھنؤ میں نام آتش کر گئے

۱۲۶۳ھ

تاریخِ وفات از طبع وقّاد و اعرف منشی اشرف علی اشرف

در بحرِ معانی خواجہ آتش
سوے ملکِ عدم فرمود رُو حیف
ز ہاتف سالِ رحلت جست اشرف
بگفتا "انتخابِ لکھنؤ حیف"

۱۲۶۳ھ

ایضاً

ناظمِ ملکِ نظم آتش بود
کرد در گلشنِ جناں مسکن
از سرِ آہ سالِ رحلتِ او
گفت ہاتف بمرد شاہِ سخن

۱۲۶۳

نثر خاتمہ ریختہ کلک گوہر سلک ، پسندیدۂ درگاہِ الٰہی مولوی محمد معشوق علی سلمہ اللہ تعالیٰ

حمد و ثنا مر خالقِ ارض و سما را سزاست کہ بیتِ وجودِ کائنات را بشیرازہ بندیِ ارکانِ رباعی عناصر جلوۂ تزیین بخشیدہ ۔ و درود محمود

نامحدود نثار بارگاہ صدر آرا کہ از مطلع دیوان نبوتش و مقطع قصیدۂ رسالتش مجموعۂ جریدۂ عالم خلعتِ آفرینش و دولت جمعیت در بر گرفتہ ۔ و آل و اصحاب کالنجومش کہ تقطیع بحر طویل شریعت غرّا را بدرخشانیدگی شمشیر برّان بنظمِ عالم و انتظامِ سالم یعلم در دادہ ۔

امابعد ، می‌گوید فقیرِ ژولیدہ بیان ، امیدوار مغفرتِ ایزد منان مستدعیِ عطایای لم یزلی محمد معشوق علی حفظہ اللہ عن ذنبہ الخفی و الجلی کہ چون کلیات سرِ دفتر شعرای عصر و سرِ منشاء فصحای دہر کہ در علم و عمل چشمۂ فیض ذاتش ، خواجہ حیدر علی آتش شاعر خوش خرام روضۂ جنان یادگار گذارندۂ مضامین آبدار گہر افشان اگرچہ سابقا روبرے مصنف زیبِ طبع یافتہ بود مگر تاحال ازان شایقان راغب و متلاشیان طالب بودند ۔ بار دیگر از الہاماتِ غیبی و فتوحات لاریبی در لوحِ دلِ صافی منزل ، خان سمو المکان ، مجسّم اخلاقِ بے پایان ، سراپا مروت ، عین احسان ، علی بخش خان عفاہ اللہ المنان ۔

بفرمائش ـــ شیخ پیر معارف ، عارف با وظائف فیاض فتوت ممتلی شیخ رجب علی سلمہ اللہ العلی و حبیب با خلیق (؟) و رفیق سراسر شفیق حکیم شیخ احمد بخش سلمہ اللہ و ابقاہ ۔

چنان منقّش گردیدہ کہ آنچہ روبروی مصنف زیب طبع شدہ باشد سوای آن ہر قدر غزلیات وغیرہ کہ بعد ازان مرتّب شدہ باشند ، آنہم جمع نمودہ آرایش طبع دہد ۔ چنانچہ بسعی موفور وکوشش مشکور غزلیاتِ بقیہ را در دیوانِ دوم اضافہ نمودہ کلیاتِ خوش اسلوب بطرزِ مطلوب و اسلوبِ مرغوب (با) قطعاتِ وفاتِ مصنف ترتیب دادہ ۔

بتاریخ — پانزدھم جمادی الاولی ١٢٦٨ ھجری حلیہ اختتام پذیرفتہ زیب دہِ محفلِ سخن گردیدہ۔

تاریخ طبع از سپہر سپہر جلال امیر علی خان ہلال

کیا کلامِ بے تکلّف ہے کہ وقتِ استماع
کہتے ہیں بے ساختہ اربابِ محفل واہ واہ
طبع کی تاریخ کا لکھتا ہے یہ مصرع ہلال
چھپ چکا اب کلیات آتش اے دل! واہ واہ

١٢٦٨ھ

تاریخ طبع از منشی اشرف علی اشرف

یکتائے وقت خواجہ آتش بے مثل
شاعر ایسا جہاں میں نادر اور شاذ
اشرف! دیوان چھپا جو ان کا، میں نے
لکھی تاریخ "ہے کلامِ استاذ"

١٢٦٨ھ